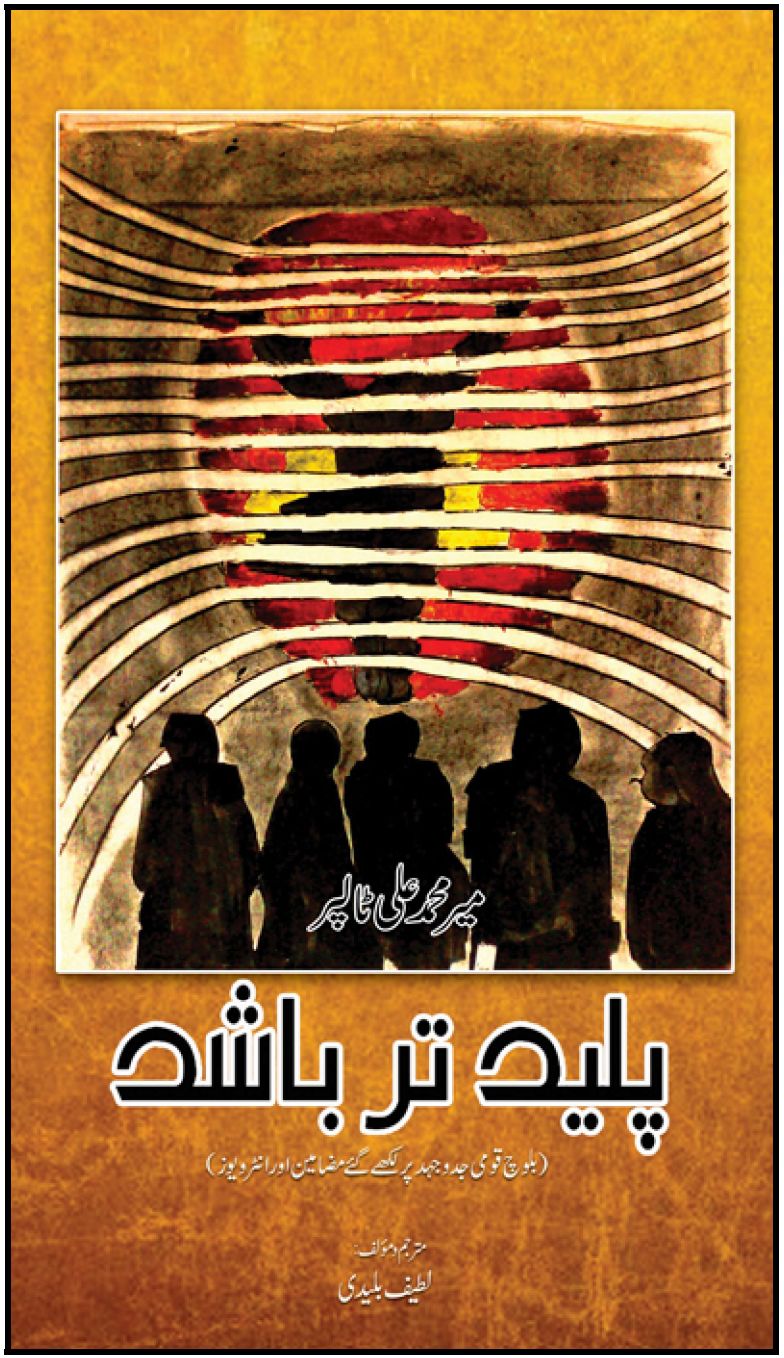

پلید تر باشد

(بلوچ قومی جدوجہد پر لکھے گئے مضامین اور انٹرویوز)

میر محمد علی ٹالپر

مترجم و مؤلف:

لطیف بلیدی

سنگر پبلی کیشنز بلوچستان

جملہ حقوق محفوظ

کتاب: پلید تر باشد
مصنف: میر محمد علی ٹالپر
مترجم و مؤلف: لطیف بلیدی
تدوین: زباد بلوچ
اشاعت: مارچ 2017ء
کتابی سلسلہ: نمبر 15

بلوچ جہد کاروں کے نام

فہرست

پیش لفظ (ادارہ) 9
حرفِ مترجم 10
تعارف 11
آزمودہ کار سپاہی 13
کسی اور دن کی یادیں 16
بلوچستان اندرون و بدون خانہ 24
اخلاقی طور پر قائل 29
مفلوج حیلے 33
راسپوتینی و میکاولی طرز کی ذہن شوئی 38
بلوچ لاپتہ افراد: ایک روح فرسا داستان (حصہ اول) 43
بلوچ لاپتہ افراد: ایک روح شکن داستان (حصہ دوم) 48
آپ بہار کو آنے سے نہیں روک سکتے 53
''سیاہ مزاح'': سیاستدانوں کے وعدے 57

کوئی قیدی نہیں رکھنا: پختونخواہ اور بلوچستان میں ماورائے عدالت قتل 61
قوم پرستی، وفاق پرستی اور علیحدگی پسندی: مسئلہء بلوچستان 68
کسی بھاری قیمت کی ادائیگی کچھ نہیں 94
مبہم سچ اور مستحکم جھوٹ 99

جلتی پر تیل 103
غیر معمولی نظر مگر بصیرت کی کامل کمی 107
درویش اور فریب کار 112
آواران 116
اُس خواب سے محبت 121
سیاسی بیداری 132
گراؤنڈ زیرو بلوچستان 140
مزاحمت و بقا 150
ریاست بمقابلہ عوام: پاکستان کی تاریخ پر نوٹس 154
''جب جرائم غیر مرئی بن جائیں'' 168
گمنام ہیرو 173
''وائے وطن ہُشکیں دار'' 178
آزادی کی لگن 183
28 اگست: بلوچستان کیلئے صدائے بیداری 187
بلوچستان میں متحارب فریق نا قابل مصالحت ہیں 192
کیا یہ اختتام ہے؟ 208

’گوادر کی سڑک بلوچستان سے گزرتی ہے‘	212
میر محمد علی ٹالپر کی کہانی (حصہ اول)	215
میر محمد علی ٹالپر کی کہانی (حصہ دوم)	228
’بھارت کا بلوچوں کو مدد کے الزامات کبھی ثابت نہیں ہوئے‘	236
بلوچستان کو شانت کرنے کی کوشش	243
’’محبت خریدی نہیں جاسکتی‘‘	248
چند سوالوں کے جواب	253
بدبودار کنواں	258
ویران کن وبا	262
اکّڑ ہو یا بکّڑ دونوں ایک	266
آپ جو ہونے دینگے وہ جاری رہیگی	270
سرخ لکیریں عبور کرنا	275
’’تکبر نے امن کے مواقع گنوا دیے‘‘	280
پلید تر باشد	286
جنگی جنون اور جنگی منافع	291
ہینگنوں کا خادم نہیں	296
ناانصافیوں کا سامنا کرنا	300
یومِ غضب کبھی نہیں منایا گیا	305
قاصدین اور نائب قاصدین	310
موت کے سائے تلے شجاعت	314

بداعتمادی کا پُر نہ ہونیوالا خلاء	318
بنیاد پرستی اور دہشت گردی	323
ڈومپاس	330
گوادر کا معمہ	335
پلک جھپکتے میں: بلوچستان کی زمینوں پر قبضہ	339
میر محمد علی ٹالپر: بلوچستان میں لاپتہ افراد کی آواز	343
کامریڈ عبدالقیوم بلوچ گوادری	346
ایامِ ثقافت: عوامی افیون؟	350
افغانستان میں امن وسلامتی	357
’’کیا نیشنلزم فاشزم ہے؟‘‘	364
ایک باریک سرخ لکیر	372
طلباء کیلئے سیاست کیوں ضروری ہے	379

پیش لفظ

(ادارہ)

اقوام کی تہذیبی وسماجی ارتقا اور علمی وشعوری نشوونما میں وہ شخصیات اہم کردار ادا کرتے ہیں جو صاحب علم ودانش ہوں۔ اگر کسی سماج میں ان خصوصیات کا حامل شخص وجود نہ رکھتا ہو تو وہ غلامی ومحکومی کی دبیز چادر تلے جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا اور کبھی روشنی کی صورت گری نہیں کر پائے گا۔ استاد میر محمد علی ٹالپر ایک ایسے ہی دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے بلوچ سماج کو غلامی ومحکومی کی دبیز چادر سے نکلنے کا شعور عطا کرنے کی انتھک کوشش کی ہے۔ اگرچہ بلوچ قوم غلامی اور محکومی کے گھپ اندھیرے سے ابھی تک نکل نہیں سکی ہے لیکن انہیں غلامی ومحکومی کا ادراک ہو چکا ہے اور یہی شعور غلامی سے نجات کا ذریعہ ہے۔ اگر کسی قوم کو اپنی غلامی کا احساس نہ ہو تو وہ کبھی بھی شعور کے منازل طے نہیں کر پا سکے گی۔ استاد ٹالپر ایسے دبستان نے اپنے گنجینۂ فکر وتعلیمات کے ذریعے بلوچ قوم کو اس کی اصل شناخت وتشخص، اس کی تہذیبی وسماجی تاریخ ایک آئینے کی طرح بلوچ قوم کے سامنے رکھی ہے جو بلوچ قوم کی بیداری کا منبع ثابت ہوا ہے۔ اور آج بلوچ قوم انہی فکر ونظریات کے ہتھیار سے لیس ایک ایسے طاقتور قابض ریاست کے سامنے تن تنہا کھڑا ہے جو یقیناً میر محمد علی ٹالپر ایسے ہزاروں صاحب علم ودانش شخصیات کی فکر و نظریات اور تعلیمات کی مرہون منت ہے۔

یہ ادارے کیلئے باعث شرف ہے کہ میر صاحب کی دوسری کتاب ''پلید تر باشد'' کے چھاپنے کی ذمہ داری بھی اس کے حصے میں آئی ہے۔ اس سے قبل ادارے نے ''گفتن از زنبور'' چھاپ کر بلوچ سماج میں ایک نادر علمی اور فکر و نظریات سے لیس ایک تربیتی کتاب کا اضافہ کیا تھا۔

سنگر پبلی کیشنز مقبوضہ بلوچستان کی طرف سے کتابی سلسلے کی بنیاد 2009 میں رکھی گئی۔ گزشتہ دو سالوں سے سخت ریاستی عتاب کی وجہ سے ہم کتابی سلسلے کی اشاعت کو مستقل بنیادوں پر قارئین تک نہ پہنچا سکے۔ اب ایک بار پھر عظیم دانشور اُستاد میر محمد علی ٹالپر صاحب کے مضامین کے اردو تراجم کا دوسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ سنگر پبلی کیشنز اس سلسلے کو مستقل بنیادوں پر جاری رکھے گی۔ اپنے اس کٹھن سفر میں ادارے کی کوشش ہے کہ مقبوضہ بلوچستان میں جاری آزادی کی جدوجہد میں شعور، آگاہی، تحقیق کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے بلوچ قوم کی علمی وشعوری تربیت میں کردار ادا کرے۔ بلوچ قومی تحریک پر لکھے گئے چیدہ چیدہ وسبق آموز مضامین، شعر و شاعری سمیت شہداء کی بائیوگرافیاں بھی ادارے کی اشاعت کا حصہ ہیں۔ طویل عرصے بعد کتابی سلسلے کی اشاعت ان کٹھن حالات میں یقیناً ایک مشکل عمل ہے۔ لیکن ادارہ اپنی جستجو جاری رکھے گا۔

حرفِ مترجم

بلوچ قومی تحریک میں میر محمد علی ٹالپر کی حیثیت سیاسی وعلمی رسدگاہ جیسی ہے۔ ان کی تحاریر اور تقاریر بلوچ سیاسی کارکنان اور بلوچ قومی پالیسی ساز اداروں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ بلوچ قومی تحریک سے اپنی گذشتہ پینتالیس سالہ غیر متزلزل وابستگی کے دوران انہوں نے کئی نشیب وفراز دیکھے لیکن ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ جیسا کہ وہ خود نطشے سے اقتباس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''یہ عظیم جذبات کی قوت نہیں بلکہ ان سے وابستگی کا دورانیہ ہے جو عظیم انسان بناتے ہیں۔'' اور میر صاحب واقعتاً بلوچ قوم کی عظیم شخصیات میں سے ایک ہیں۔

میر صاحب اُن کیفے ٹیریا قسم کے انقلابی دانشوروں میں سے نہیں ہیں جن کی انقلابی دانشوری محض چائے کی چسکیوں، خوش گپیوں اور فضول مباحثوں تک محدود ہو۔ 1970ء کی دہائی میں بلوچستان کی شورش ہو، افغانستان میں بلوچوں کے ساتھ جلاوطنی کی کٹھن زندگی، مختلف مطبوعات میں بلوچ مسائل پر ان کی بلیغ تحریریں ہوں، موجودہ دور کی بلوچ شورش ہو یا بلوچ لاپتہ افراد کے لیے لانگ مارچ، وہ ہمیشہ عملی میدان میں متحرک رہے ہیں اور بلوچوں کی علمی وسیاسی رہنمائی کے ساتھ ساتھ دیگر اقوام کے درمیان بلوچ قوم کی نمائندگی بھی کرتے رہے ہیں۔

''گفتن از زنبور'' کے بعد یہ ان کے مضامین کے اردو تراجم کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں مختلف اداروں، محققین اور صحافیوں کی طرف سے کیے گئے ان کے انٹرویوز کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی اور جدوجہد پر لکھی گئی تحاریر بھی شامل ہیں جو قارئین کی نذر ہے۔

لطیف بلیدی

31 دسمبر 2016ء

تعارف

میر محمد علی ٹالپر

(حیدرآباد، سندھ)

میر محمد علی ٹالپر ولد مرحوم میر علی احمد ٹالپر (پاکستان کے وزیر دفاع 1978ء تا 1985ء) نے مونٹیسوری سے لے کر صحافت میں ایم اے (سال اول کراچی یونیورسٹی) تک کراچی میں تعلیم حاصل کی لیکن انہوں نے اپنا ماسٹرز مکمل نہیں کیا چونکہ انہوں نے 1971ء میں بلوچ قومی جدوجہد میں شمولیت اختیار کی اور 1973ء تا 1977ء کی شورش کے دوران وہ بلوچوں کے ساتھ تھے اور 1991ء تک ان کے ساتھ رہے اور بلوچ مسئلے پر اپنی تحریروں کے ساتھ اب تک اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے تین سال انہوں نے مری علاقے کے پہاڑوں میں گزارے اور تقریباً تین سال تک وہ سندھ میں زیر زمین رہے، جیسا کہ وہ اور ان کے چھوٹے بھائی میر حیدر علی، راشد رحمان (ڈیلی ٹائمز کے موجودہ ایڈیٹر)، اسد الرحمٰن، اور 'طالبان' کے مصنف احمد رشید اور دیگر کارکنان حیدرآباد سازش ٹریبونل میں مطلوب افراد کی فہرست میں شامل تھے۔

انہوں نے 13 سال (1978ء تا 1991ء) افغانستان میں جلاوطنی میں بہ طور ایک مہمان کے گزارے جہاں وہ لوگوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ دیگر ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے اور پناہ گزینوں کی طبی ضروریات کا خیال رکھا۔ ان میں سے تین سال انہوں نے صوبہ زابل میں گزارے اور دس سال ہلمند صوبے میں لشکر گاہ کے قریب جہاں تقریباً سات سے آٹھ ہزار بلوچ مہاجرین رہتے تھے۔

واپسی کے بعد انہوں نے چند سال کے وقفے کے بعد لکھنا شروع کیا اور انہوں نے 'نیوز لائن'، 'دی رپورٹر' (حیدرآباد سے نکلنے والا ایک ماہنامہ) اور کچھ کالم 'ڈان' اور 'دی نیوز' کے لیے لکھے اور تین سال (2010ء تا 2013ء) تک 'ڈیلی ٹائمز' کے لیے لکھتے رہے اور 2015ء میں اس کے لیے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ ان میں سے بیشتر مضامین تک رسائی '' Play Google @ Ustad Talpur '' پر کی جاسکتی ہے۔ 'ڈیلی ٹائمز' کے لیے لکھے گئے مضامین کا خلیج میں بسنے والے بلوچوں کے لیے عربی میں ترجمہ احمد یعقوب اور صلاح بلوچ نے کیا اور اسے ''بلوچ بیداری: بلوچ مسئلے پر مضامین'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

انہوں نے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے نائب چیئرمین ماما عبدالقدیر بلوچ کی قیادت میں کیے گئے لانگ مارچ میں شرکت کی اور 26 دن تک ماما اور بہادر بلوچ خواتین کے ہمراہ مارچ کیا۔ یہ مارچ 106 دنوں میں مکمل ہوا تھا۔

اس وقت وہ اسٹراٹیجک سینٹر فار انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایک ریسرچ فیلو اور اس کی سہ ماہی اشاعت کے ادارتی بورڈ کے رکن ہیں۔

بشکریہ: افغان ٹریبون، 14 نومبر، 2015

http://aftribune.com/an-interview-with-baloch-intellectual-mir-mohammad-ali-talpur-fundamentalism-terrorism-and-fanaticism/

آزمودہ کار سپاہی

نزیحہ سید علی

تقریباً 40 برس قبل ہونے والے دھماکے میں جب محمد علی ٹالپر نے اپنے دونوں ہاتھ گنوائے تو اس وقت وہ طبی سہولیات جیسی شے سے کوسوں دور بلوچستان کے مری علاقے کے پہاڑوں میں تھے۔ دو ڈاکٹروں کو ان تک پہنچنے کے لیے، کراچی سے کوئٹہ تک کا ایک ہوائی سفر اور پہاڑوں میں اونٹ پر سواری سمیت، چھ دن لگے۔ لیکن یہ جنگ کا مارا آزمودہ کار سپاہی 1970ء کے عشرے کی بلوچ بغاوت کا حصہ ہونے کی داستان سنانے کے لیے زندہ رہا۔

بلوچستان اس وقت بغاوت کی چوتھی لہر کی گرفت میں ہے جو کہ تقسیم کے تقریباً فوراً بعد شروع ہوئی تھی۔ اس کاز کے لیے ٹالپر صاحب کی رغبت، جس کا حوالہ وہ ''جدوجہد'' کے طور پر دیتے ہیں، عمر کے ساتھ کم نہیں ہوئی اور اس کا اظہار انہوں نے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے کراچی تا اسلام آباد طویل احتجاجی مارچ میں شمولیت سے کیا جو کہ کوئٹہ سے پیدل شروع ہوا تھا۔

ان کی نیت ہالہ تک ساتھ چلنے کی تھی لیکن 16 دن کے بعد خراب صحت نے انہیں مارچ سے باہر رہنے پر مجبور کر دیا۔ اپنی شلوار اوپر کھینچ کر غمناک انداز میں اپنے ٹخنوں اور پنڈلیوں کی سوجن دکھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ''روزانہ 20 کلومیٹر پیدل چلنا کوئی شعبدہ بازی نہیں ہے۔''

مارچ کے شرکا، جو کہ اب لاڑکانہ پہنچ چکے ہیں، نے تین راتیں حیدرآباد میں ان کی رہائش گاہ پر گزاریں، وہ ہر صبح گاڑی پر واپس اسی جگہ لوٹ جاتے، جہاں پر شام کو انہوں نے مارچ روکا تھا۔

سن 1920ء میں تعمیر کیا گیا، ٹالپر صاحب کا گھر فرش اور چھتوں پر شاندار اصل ٹائل کے کام کے ساتھ ساتھ نایاب فارسی مسودات کا حامل ہے۔ ایک خواب گاہ میں اجرک چادروں کے دو بڑے بنڈل تھے۔ یہ احتجاجی ریلی کے شرکا کو سندھ میں ان خیر خواہوں کی طرف سے دیے گئے تھے، جن کے دیہاتوں میں سے وہ گزرے تھے۔

ٹالپر صاحب کا پاکستان میں شاید سب سے پہلے رونما ہونیوالے 'لاپتہ' افراد کے واقعات کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔ مری علاقے کی پہاڑوں میں مزاحمتی جنگجوؤں میں سے ان کا ایک ساتھی دلیپ داس تھا۔ 1971ء میں بلوچستان سے سندھ سفر کے دوران دلیپ داس اپنے بلوچ ساتھی شیر علی مری کے ہمراہ 'انٹیلی جنس ایجنسیوں' کی جانب سے اٹھائے گئے اور پھر دوبارہ انہیں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

ٹالپر صاحب کہتے ہیں کہ، ''ان کی ماں، جو کہ کراچی میں رہتی ہیں، اب 92 سال کی ہیں۔ حتیٰ کہ اب بھی، جب کبھی میں ان سے ملتا ہوں، وہ پوچھتی ہیں 'میرا جانی کیسا ہے؟' (یہ دلیپ کے لیے ان کی عرفیت ہے)۔ اگرچہ انہوں نے 1971ء کے بعد سے اسے نہیں دیکھا ہے لیکن وہ سمجھتی ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ کہیں پر اب بھی زندہ ہو۔ اس شخص کی آس کبھی ختم نہیں ہوتی جس کے پیارے کو کسی ریاست نے غائب کر دیا ہو۔''

دلیپ کو بھی، ٹالپر صاحب کی طرح، لندن گروپ کے حصے کے طور پر جانا جاتا تھا، جہاں تک مؤخر الذکر کا تعلق ہے تو یہ ان سے منسوب ایک غلط نام ہے کیوں کہ وہ کبھی بھی لندن نہیں گئے۔ غیر بلوچ نوجوانوں پر مشتمل اس گروہ کو محمد بابا 70ء کی دہائی کی ابتدا میں اپنے ساتھ لائے تھے، جو لندن میں اپنی تعلیم چھوڑ کر بلوچ مزاحمت میں شامل ہونے کے لیے آئے تھے۔ اس میں نجم سیٹھی، احمد رشید، راشد رحمٰن اور ان کے چھوٹے بھائی اسد رحمٰن (جو کہ چاکر خان کے نام سے معروف تھے، اور انہوں نے دراصل چند لڑائیوں کی سربراہی کی تھی) شامل تھے۔

ٹالپر صاحب 1970ء میں کراچی یونیورسٹی میں صحافت کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، جب

انہوں نے اسے ادھورا چھوڑ کر باغیوں کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔لیکن اس سے پہلے وہ چھ ماہ تک اپنے ایک رشتہ دار، جو کہ ایک ڈاکٹر تھے، کے ساتھ رہے اور بیماریوں کا علاج، دوا دینے کے بارے میں، اور معمولی سرجری میں ان کی مدد کر کے جو کچھ وہ سیکھ سکتے تھے، انہوں نے سیکھا۔ اضافی مہارت مفید ثابت ہوئی، تاہم دھماکہ خیز مواد کے حادثے کے بعد وہ اصل لڑائی میں حصہ نہ لے سکے۔

وہ کراچی سے 22 اکتوبر 1971ء کو پہاڑوں میں جنگجوؤں کے ساتھ شامل ہونے کے لیے نکلے، جہاں لندن گروپ کے کچھ ارکان پہلے سے ہی موجود تھے۔

گوریلا جنگجو کے طور پر زندگی آسان نہ تھی، خاص طور پر ان نوجوان کے لیے جو کھاتے پیتے گھرانے کا شہری پس منظر رکھتے ہوں۔ ٹالپر صاحب اس وقت کو یاد کرتے کہتے ہیں، ''ہم کسی نہ کسی طرح وہاں رہے۔ وہاں کوئی خیمے، کوئی سہولیات نہیں تھیں۔ ہم چھجوں کے نیچے، چھوٹے سے غاروں میں رہتے تھے۔ مری علاقوں میں خوراک کی پیداوار ہوتی اور سبی زیادہ دور نہ تھا، ہم راشن لینے وہاں جاتے اور گڑ اور ہاتھ کی چکی میں پسے ہوئے آٹے کی طرح کی اشیا لیتے۔'' شاید یہ ان کی نوخیز آدرشیت تھی جس نے انہیں ثابت قدم رہنے کی طاقت دی۔

جنرل ضیا کی طرف سے بھٹو کی بے دخلی کے ساتھ لڑائی ختم ہوگئی جس نے بعض بلوچ رہنماؤں کے ساتھ سیاسی تصفیوں پر دستخط کیے۔

تاہم اس وقت بھی جذبات شدید تھے، لیکن بلوچستان کی صورت حال بتدریج تبدیل ہوئی ہے۔ ٹالپر صاحب کے مطابق ستر کی شورش اور موجودہ شورش کے درمیان ایک اہم فرق ہے: ''پہلے وہاں آزادی کے بارے میں تحفظات تھے، تاہم اس کے بیج بو دیے گئے تھے۔ اب بلوچ پوری لگن کے ساتھ آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اب ان کے لیے کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے۔''

بشکریہ: روزنامہ ڈان، 13 جنوری 2014

http://www.dawn.com/news/1080174

کسی اور دن کی یادیں

فروری 1973ء میں حلف اٹھانے کے محض 10 ماہ بعد سردار عطا اللہ مینگل کی حکومت کی غیر قانونی اور غیر منصفانہ برطرفی کے بعد بلا جواز اور ظالمانہ فوجی آپریشن کیخلاف بلوچ کی مزاحمت صوبے کی تاریخ میں سب سے زیادہ طویل، وسیع اور مضبوط ترین جدوجہد تھی۔

مینگل سرکار نے بڑی امیدیں اور توقعات لیے یکم مئی 1972ء میں حلف اٹھایا لیکن روزِ اول سے اسے اپنی راہ میں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وفاقی حکومت نے لسبیلہ میں اتھل پتھل پیدا کی اور جام غلام قادر، سابق ریاست کے آخری حکمران، کے حامیوں کی صوبائی حکومت کے مبینہ ظلم وستم کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی حوصلہ افزائی کی۔ مینگل حکومت کو اس مصیبت پر قابو پانے کے لیے لیویز فورس میں اضافہ کرنا پڑا چونکہ وفاقی حکومت نے مدد بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ جام غلام قادر، لسبیلہ کے جام، مینگل حکومت کی برخاستگی کے بعد وزیر اعلیٰ بنے۔

سن 1973ء میں لاہور کے ایک عوامی اجلاس میں نواب اکبر بگٹی نے دعویٰ کیا کہ 'گریٹر بلوچستان' کے لیے ایک منصوبہ بنایا گیا ہے جس کا مقصد عسکری ذرائع سے پاکستان، ایران اور افغانستان میں بلوچ اکثریتی علاقوں پر مبنی خطے کی آزادی ہے۔ پنجابی افسران کو بلوچستان میں خدمات انجام دینے کے لیے بھیجنے کا مسئلہ بھی باعثِ آزار تھا، اگرچہ بعد میں یہ بات سامنے آئی کہ پنجاب کے اس وقت کے گورنر غلام مصطفیٰ کھر نے واپس آنے کے لیے افسران کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ایران بھی بلوچوں کو کم سے کم خودمختاری ملنے پر اپنی سرحدوں کے اندر بلوچ کی مزاحمتی تحریک کے خوف سے خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔

اس ڈرامے کا آخری باب 10 فروری 1973ء میں اسلام آباد میں عراقی سفارت خانے

کے فوجی اتاشی ناصر السعود کی رہائش گاہ پر ہتھیاروں (300 عدد اے کے، 47 بندوقیں اور 48,000 گولیاں) کا برآمد ہونا تھا۔ بظاہر، یہ اسلحہ کراچی سے اسلام آباد منتقل کیا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہتھیاروں کی برآمدگی سے تین دن قبل السعود پاکستان سے غائب ہو چکے تھے۔ اتفاق سے یہ فوجی اتاشی ساواک کا ایجنٹ نکلا، جسے بعد میں صدام حسین نے مار دیا تھا۔

مینگل حکومت 13 فروری کو برخاست کی گئی اور اس کے نتیجے میں صوبہ سرحد میں مفتی محمود کی حکومت نے بھی احتجاجاً استعفیٰ دے دیا چونکہ جے یو آئی کے ارکان مینگل حکومت کا حصہ تھے۔ نواب اکبر بگٹی گورنر بنائے گئے اور تقریباً ایک سال تک وہ اس عہدے پر براجمان رہے۔

میرے چچا میر رسول بخش ٹالپر، اس وقت کے گورنر سندھ، نے بھی استعفیٰ دے دیا کیونکہ ان کے بڑے بھائی اور میرے والد میر علی احمد ٹالپر پر عراقی سفارت خانے کے ہتھیاروں کے معاملے میں ملوث ہونے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ ان پر یہ الزام اس لیے عائد کیا گیا کہ اب یہ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں مری علاقے میں ہوں۔ یہ معلومات اکبر بگٹی کی مرہونِ منت پریس میں شائع ہوئی تھیں۔

جمہوری طور پر منتخب حکومت کی برخاستگی بلوچ کے لیے اپنے حقوق کے دفاع اور ان پر کی جانی والی ناانصافیوں کے خلاف لڑنے کے لیے کافی تھی۔

اس کی قیادت غوث بخش بزنجو، سردار عطا اللہ خان مینگل، میر گل خان نصیر، خیر بخش خان مری، جو کہ نیشنل عوامی پارٹی (این اے پی) کے سربراہ تھے، اور دیگر نے کی، جنہیں 1947ء کے بعد سے بلوچ کی حالت زار پر اپنے خیالات کے اظہار کے لیے قید کی صعوبتیں اور سفری پابندیاں جھیلنا پڑیں۔

شیر محمد مری کو مارچ 1973ء میں گرفتار کیا گیا جب کہ مندرجہ بالا رہنماؤں کو 1973ء کے آئین کے نفاذ کے فوراً بعد 15 اگست کو گرفتار کیا گیا۔ نواب خیر بخش اور میر علی احمد ٹالپر نے اس بنیاد پر آئین کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ یہ صوبائی خودمختاری کے لیے خاطر خواہ ضمانت

فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔

بغاوت برپا ہونے والی تھی۔ بلوچ عوام جب تنازعے کے حل کے لیے بے کار میں انتظار کر رہے تھے تو حکومت مری اور مینگل علاقوں، 60 کے عشرے کی گزشتہ مزاحمت کے اہم مقامات کی گھیرابندی میں مصروف تھی۔ انہوں نے رفتہ رفتہ اس حد تک گھیرا تنگ کر دیا کہ مری علاقے میں رہنے والے لوگوں کو محض بنیادی راشن کے حصول کے لیے بھی انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک بار ہمارے چھوٹے سے گروہ کو چند دنوں کے لیے آٹے پر گزارا کرنا پڑا جو کہ کھانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ ہمارا گروہ تین مری قبائلیوں، ایک شہری کارکن، جو کہ گم نام رہنا چاہتے ہیں، اور مجھ پر مشتمل تھا۔ ہم ایک کم کار گروہ تھے، دو یا تین گدھوں پر ادویات اور کچھ اضافی راشن اٹھاتے اور دو بکریاں جنہیں ہم دودھ کے لیے رکھا کرتے تھے۔ میں بیماریوں کے علاج کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا، جو کہ میں نے سندھ میں قیام کے دوران سیکھا تھا۔

مورخہ 18 مئی 1973ء میں سبی اسکاؤٹس کے ایک آٹھ رکنی گشتی پارٹی پر تندوری کے قریب گھات لگا کر حملہ ہوا اور انہیں ہلاک کیا گیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا ذمہ دار کون تھا لیکن تین دن کے اندر اندر مری علاقے کے ایک چھوٹے سے قصبے ماوند میں ہیلی کاپٹروں، جو کہ فوجیوں کو لایا کرتے تھے، کے ساتھ فوجی آپریشن شروع کیا گیا۔ پندرہ دن بعد، کاہان پر علی الصبح قبضہ بھی اسی انداز میں شروع کیا گیا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ ہم جاگ چکے تھے اور چائے پی رہے تھے جب ہیلی کاپٹروں کی منحوس آواز نے ہمیں چونکا دیا، کیونکہ ابھی تک اندھیرا تھا۔ ہم نے تقریباً 15 ہیلی کاپٹروں کو کاہان کی طرف پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے پیمانے پر کارروائی کا آغاز کر دیا گیا تھا۔

فوج کے خلاف مزاحمت تقریباً فوری طور پر شروع کر دی گئی اور، ان الزامات کے برعکس کہ بلوچ جدوجہد غیر ملکی اعانت سے چل رہی ہے، یہ جدوجہد بلوچ حقوق کی صریح خلاف ورزی کا نتیجہ تھی۔ بلوچ جنگجوؤں کی طرف سے استعمال کیے جانے والے ہتھیار یا تو 303 بندوقیں، پرانی لی

اینفیلڈ سنگل شاٹ بندوقیں یا شکار کی بندوقیں تھیں۔ ایک اکیلی خودکار بندوق، اگر اسے یہ بلند و بالا درجہ دیا جا سکے، نائن ایم ایم کی ایک اسٹین گن تھی جو کہ اکثر چند گولیاں چلانے کے بعد جام ہو جایا کرتی تھی۔

مری جنگجو جنہیں ایک فائدہ حاصل تھا، وہ تھا اپنے علاقے کے بارے میں معلومات؛ انہیں معلوم تھا کہ پانی کے چشمے کہاں ہیں، غاریں اور گھاٹیاں کہاں ہیں۔ وہ اپنی پُشتی، بیڈ شیٹ جتنا کپڑا، پر اپنا آٹا اٹھاتے اور کلّی، چھوٹے مشکیزے، میں پانی اور معمولی راشن پر گزارا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے ساتھ مل کر ان کے عزم نے مریوں کو ایک قوی طاقت بنا دیا۔ وہ لڑتے، پھر غائب ہو جاتے اور بعد میں کسی اور جگہ پر منظّم ہو جاتے۔

مری کا علاقہ چھوٹا ہے، یہ محض 3,300 مربع میل ہے اور اسے کنٹرول کرنا نسبتاً آسان ہے، تو لہٰذا اس کا کریڈٹ مری جنگجوؤں کو جاتا ہے کہ اس جدوجہد کے دوران سب سے زیادہ کارروائیاں اسی علاقے میں ہوئیں۔ صحافی سیلگ ہیریسن کے مطابق، ایک وقت میں 80,000 فوجی صوبے میں تعینات کیے گئے تھے۔

آپریشن بے رحمانہ تھے اور ان کے باعث وہاں کے باشندوں کی سماجی اور اقتصادی زندگی انتہائی حد تک تہہ و بالا ہو کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے بلوچستان اور سندھ کے دیگر شہروں اور قصبوں کی طرف نقل مکانی کی۔ آخر میں، بہت ساروں کو افغانستان کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ جن لوگوں نے موسم سرما میں ہجرت کی تھی ان میں نوجوان اور بوڑھوں کو یکساں طور پر شدید سردی اور سرمازدگی کے سبب ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی ہجرت نے تاہم زندگی کو کسی طرح سے بھی آسان نہیں کیا۔

ستمبر 1974ء میں چمالنگ میں ایک فوجی آپریشن ہوا، جہاں 15,000 مری اپنے خاندانوں سمیت جمع ہوئے تھے کیوں کہ روایتی طور پر مری قبائلی اس علاقے میں اپنے گلوں کو چرانے کے لیے جاتے تھے۔ توپ خانے کے علاوہ فوج نے مقامی مریوں کے خلاف میراج اور

ایف 86 جنگی طیارے استعمال کیے اور اس کے ساتھ ساتھ ایرانی پائلٹوں کی طرف سے اڑائے جانے والے ہُوئی کوبرا ہیلی کاپٹر بھی استعمال کیے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ 125 گوریلاؤں کو ہلاک اور 900 کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تاہم، بلوچ کا کہنا ہے کہ یہ اعداد و شمار بڑھا چڑھا کر پیش کیے گئے ہیں اور یہ کہ انہوں نے 446 فوجی مار گرائے ہیں۔ 50000 کے قریب مال مویشی اور 550 سے زائد اونٹ چھینے گئے اور پنجاب میں لے جا کر فروخت کیے گئے۔ فوج نے دعویٰ کیا کہ یہ آپریشن ایک بڑی کامیابی تھی لیکن اصل میں مریوں کے لیے یہ محض ایک عارضی دھچکا ثابت ہوئی کیوں کہ انہوں نے اپنی جنگ جاری رکھی۔

ہم سراغ لگنے سے بچنے کے لیے چھوٹے گروہوں میں نقل و حرکت کیا کرتے۔ یہ جنوری 1974ء میں عید کا دن تھا اور ہم فوجی آپریشن سے بچنے کے لیے تدڑی کی طرف جا رہے تھے۔ اس سے چند روز قبل فوج نے ایک گھر پر حملہ کیا جہاں تنگور مکانی، میر ہزار خان رمکانی کے ذیلی قبیلے کا ایک مری قبائلی، کے بھتیجے جلمب اور کرم ہلاک ہو گئے تھے۔ میر ہزار خان مری علاقے میں بغاوت کے رہنما تھے۔ ہم نے وہ رات ہمیشہ کی طرح کھلے آسمان تلے سو کر گزاری اور علی الصبح چل دیے۔ اس امید میں کہ ہمیں کہیں کسی مری کا گھر مل جائے، جہاں ہم اپنے آٹے کے راشن کے ساتھ روٹی پکا سکیں۔ ہم جیسے ہی ایک پہاڑ کے کونے پر مڑے تو ہم نے دھواں اٹھتے دیکھا جو کہ ہم نے سوچا کہ کسی گھر سے نکل رہا ہے۔ بظاہر وہاں رہنے والے لوگوں نے ہمیں دور سے ہی دیکھ لیا تھا اور جیسا کہ ہمارے پاس بندوقیں تھیں تو انہوں نے ہمیں غلطی سے فوجی سمجھا اور اپنی پناہ گاہ چھوڑ دی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو کوئی موجود نہ تھا۔ قریبی پہاڑوں میں سے کچھ لوگوں نے ہمیں آواز لگائی، یہ جاننے کے بعد کہ ہم فوجی نہیں تھے، اور ہمیں کھانے کے لیے رکنے کو کہا۔ لیکن ہم انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے، لہٰذا ہم وہاں سے آگے چلے گئے۔

لاپتہ افراد کا مسئلہ اس وقت بھی اتنا ہی بڑے پیمانے پر تھا جتنا کہ اب ہے۔ ذرہ بھر شبہ ہونے پر لوگ اٹھائے جاتے یا بلوچ صفوں میں گھسنے والے چند خفیہ ایجنٹوں کی طرف سے فوج کے

حوالے کر دیے جاتے۔ بہت سے لوگ کسی سراغ کے بغیر غائب ہوئے؛ ان میں سردار عطا اللہ خان مینگل کے فرزند اسد اللہ مینگل اور ایک نڈر کارکن احمد شاہ کرد شامل ہیں۔ انہیں کراچی سے اٹھایا گیا اور پھر ان کے بارے کبھی کچھ نہیں سنا گیا۔ دلیپ (جانی) داس کو شیر علی رمکانی مری کے ہمراہ بیل پٹ کے قریب سے اغوا کیا گیا، انہیں بھی ایک خفیہ ایجنٹ کی طرف سے ہتھے چڑھایا گیا اور ان دونوں کو بھی اسی انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ شفیع محمد بادانی، بہار للوانی، علی دوست درکانی اور دیگر بہت سے لوگ بھی غائب کیے گئے۔

سرگرم کارکنوں کو اٹھایا اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور اسی طرح سے بہت سے قبائلیوں کو بھی۔ ان میں سے کچھ کو بعد میں رہا کر دیا گیا، تشدد کے باعث وہ اپاہج ہو چکے تھے۔ یہ وہی عرصہ تھا جس کے دوران کوئٹہ جیل کو توڑنے کا پہلا واقعہ پیش آیا۔ تشدد سے تنگ آئے چار نوجوان کارکنوں نے وہاں سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا اور بعض دیگر قیدیوں کی بھی حمایت حاصل کی، اگرچہ وہ اس خطرناک مشق کو کرنے کے لیے تیار نہ تھے، جنہوں نے وعدہ کیا کہ مقررہ وقت پر وہ سب بیرونی دیوار پر لگے بجلی کے تاروں سے گزرنے والے کرنٹ کو کم کرنے کے لیے اپنے بجلی کے ہیٹر ایک ساتھ چلا دیں گے۔ لہٰذا منصوبے کے مطابق ایک قیدی نے دیوار پر چڑھ کر تاروں پر ایک رضائی ڈال دی اور دیوار پھلانگ دی، دیگر دو نے بھی یہی کیا لیکن چوتھا اپنی ٹانگ زخمی ہونے کے بعد دست بردار ہو گیا۔ قیدیوں کے دیوار پھلانگنے کے چند منٹ بعد گھنٹی بج گئی لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

دیگر صوبوں سے جو کارکنان جدوجہد میں ملوث تھے ان میں نجم سیٹھی، احمد رشید، راشد رحمٰن، اسد رحمٰن، دلیپ داس، محمد بھابا اور میں شامل تھے۔ بلوچ قومی جدوجہد میں شمولیت اختیار کرنے سے قبل ان میں سے بیشتر لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور یہ ''لندن گروپ'' کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر سیاسی کام میں ملوث تھے جس میں 'جبل' نامی ایک خفیہ اخبار کی پرنٹنگ اور تقسیم بھی شامل تھی۔ وہ لوگوں کو تعلیم دینے اور بنیادی طبی امداد فراہم کرنے میں بہتری

لانے کی تربیت دینے میں بھی ملوث تھے۔ فوجی آپریشن سے بچنے کے لیے شہری کارکن بھی پہاڑوں کی طرف فرار ہوئے اور انہی حالات میں رہے جن میں عام قبائلی رہ رہے تھے۔

دونوں متحارب اطراف سے ہلاکتوں کے بارے میں متضاد دعوے کیے جاتے ہیں، اگرچہ کوئی مصدقہ اعداد و شمار موجود نہیں ہیں، یہ مانا جاتا ہے کہ اس جنگ کے دوران 3,000 فوجی اور 5,000 بلوچ مارے گئے تھے۔ لیکن دونوں اطراف سے اصل تعداد کو جاننے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کارروائیوں میں ہلاک ہونے والے ممتاز بلوچوں میں سے چند یہ تھے: جھالاوان میں سفر خان زرکزئی، میر گل خان نصیر کے بڑے بھائی اور ستر سالہ ضعیف میر لونگ خان جو اپنے گاؤں مالی کا دفاع کرتے ہوئے ہلاک ہوئے اور جلات خان درکانی۔ جب ضیا الحق نے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے مختلف جیلوں میں قید کیے گئے تقریباً 6,000 بلوچ رہا کر دیے۔

بھٹو کو ضیا کی طرف سے معزول کیے جانے کے بعد، فوج کی سرگرمیوں کو عملی طور پر روک دیا گیا اگرچہ معمولی جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ضیا کی طرف سے بلوچ رہنماؤں کی رہائی، حیدرآباد ٹربیونل کے خاتمے اور سب کے لیے عام معافی کے اعلان نے جدوجہد کو توڑ کر رکھ دیا۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ جدوجہد کے تسلسل کو جاری رکھنے کے حوالے سے اختلاف رائے پیدا ہوا، نہ صرف غیر فعال این اے پی کے پشتون اور بلوچ قیادت کے درمیان، بلکہ بلوچ رہنماؤں کے آپس میں اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔ زیادہ تر بلوچ رہنماؤں، جو کابل میں جلاوطنی میں رہ رہے تھے، نے واپس آنے کا فیصلہ کیا اور صرف مریوں نے وہیں رکنے کا فیصلہ کیا۔ وہ صرف 1992ء میں افغانستان میں نجیب اللہ کی حکومت کے زوال کے بعد واپس آئے جیسا کہ بنیاد پرست قیادت کہ جنہوں نے نجیب کی جگہ لے لی تھی بظاہر پاکستان کی حمایت کے لیے اس کے انتہائی شکر گزار تھے اور انہوں نے مریوں کی میزبانی کرنے سے انکار کر دیا۔

ذوالفقار بھٹو کے دور میں بلوچستان میں فوجی آپریشن کیخلاف بلوچ بغاوت کو 36 سال بیت چکے ہیں۔ لیکن صوبہ ایک بار پھر گرما رہا ہے۔ مشرف کے دور اقتدار میں ایک فوجی تصادم کے

دوران نواب اکبر بگٹی اوران کے ساتھیوں کا قتل اور حال ہی میں تربت میں تین بلوچ قوم پرستوں کے قتل نے بلوچ میں شدید غم وغصے کی لہر دوڑا دی ہے۔

اگر صوبے کی شکایات کا جلد ازالہ نہ کیا گیا تو بلوچستان ایک اور بغاوت دیکھ سکتی ہے اور اب کی بار اس کے نتائج خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

بشکریہ: نیوز لائن میگزین، جمعرات، 4 جون 2009

Page 1

http://www.newslinemagazine.com/2009/06/memories-of-another-day-2/

Page 2

http://www.newslinemagazine.com/2009/06/memories-of-another-day-2/2/

بلوچستان، اندرون و بدونِ خانہ

وزیر اعظم راجہ پرویز اشرف نے 'بلوچستان کی صورتحال: تصورات اور حقائق، آگے بڑھنے کی راہیں'، جسے اسلام آباد میں فوج کے زیر انتظام نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی (این ڈی یو) کی طرف سے منظّم کیا گیا تھا، کے قومی ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے خبردار کیا کہ اگر ''چھوٹے علاقوں میں بدامنی'' پر فوری طور پر قابو نہیں پایا گیا تو یہ دیگر علاقوں تک پھیل سکتی ہیں۔ بعد میں انہوں نے اس کی اہمیت کو گھٹاتے ہوئے کہا کہ ''چھوٹے علاقوں'' میں بدامنی کا موازنہ بغاوت کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

وہ دونوں حوالوں سے غلط تھے: وہاں بغاوت ہو رہی ہے اور یہ بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے، اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مقتدرہ (اسٹیبلشمنٹ) انتہائی پریشان اور مضطرب ہے۔

آیئے بلوچستان کے تناظر میں بغاوت کا جائزہ لیتے ہیں۔

بلوچستان اس وقت سیاسی بغاوت کے ساتھ ساتھ مسلح بغاوت سے بھی گزر رہا ہے۔ اصولی طور پر سیاسی بغاوت اپنی فراست اور وسعت کے لحاظ سے زیادہ نفوذ پزیر ہوتی ہے، اسی وجہ سے ریاست کے لیے زیادہ مضمحل کن ہوتی ہے۔ سیاسی اور مسلح بغاوتیں ایک مہلک مرکب کی صورت میں ہمیشہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی اور ایک دوسرے کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ بغاوت کی تشریح کچھ اس طرح سے ہے کہ، ''ایک منظّم تحریک جس کا مقصد تخریب کاری اور مسلح تصادم کے استعمال کے ذریعے کسی قائم شدہ حکومت کا تختہ الٹنا ہو۔'' بغاوت اور گوریلا جنگ کو اکثر دہشت گردی کا مترادف سمجھا جاتا ہے لیکن اہم فرق یہ ہے کہ بغاوت ایک تحریک ہوتی ہے، کسی مخصوص سیاسی مقصد کے ساتھ کی گئی ایک کوشش اور یہی چیز اسے دہشت گردی سے ممتاز کر دیتی ہے۔ بغاوت کا حتمی مقصد کسی موجودہ حکومت کے علاقے کا مکمل یا جزوی کنٹرول حاصل کرنے کے لیے اسے چیلنج

کرنا، یا سیاسی طاقت کا اشتراک کرنے کے لیے سیاسی مراعات دینے پر مجبور کرنا ہوتا ہے۔ بلوچ باغی بلوچستان کی سیاسی اور زمینی کنٹرول کے لیے ریاست کو چیلنج کر رہے ہیں۔

بغاوتوں کو ملوث آبادی کے کچھ حصے کی فعال یا خاموش حمایت کی ضرورت ہوتی ہے؛ انتہائی جابرانہ اقدامات کے باوجود حکومت کی ناکامی سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوچ بغاوت کو بڑے پیمانے پر حمایت حاصل ہے۔

بلوچ قوم پرستوں نے اس بات کا ادراک کرتے ہوئے کہ سست رفتار نسل کشی اور گوادر جیسے میگا پروجیکٹس کے ذریعے آبادیاتی خصوصیات میں تبدیلی انہیں اپنی ہی سرزمین پر ایک اقلیت میں تبدیل کر سکتی ہے، لہٰذا انہوں نے بطور ایک قوم کے اپنی بقا کو لاحق خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے طاقت کے استعمال کا ایک شعوری انتخاب کیا ہے کیونکہ وہ جان چکے ہیں کہ ان کی آزادی کے حق کے لیے تاریخی اور سیاسی بحث بے کار ہے چونکہ جو قوتیں یہاں کا نظام چلا رہی ہیں ماسوائے طاقت کے کسی اور چیز پر دھیان نہیں دیتیں۔

بلوچ قوم پرستی کوئی نیا رجحان نہیں ہے، چونکہ دیسی باشندوں نے ہمیشہ ثابت قدمی کے ساتھ حملہ آوروں کے خلاف اپنی سرزمین کا دفاع کیا ہے، جیسا کہ برطانوی راج کے خلاف ان کی مزاحمت سے ثابت ہوتا ہے۔ تمام بلوچ خود کو نوآبادیات مخالف جدوجہد کے ساتھ مشخص کرتے ہیں اور اس پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ گذشتہ صدی کی پہلی چوتھائی میں بین الاقوامی سیاسی واقعات نے سیاسی بیداری کے ساتھ بلوچ قوم پرستی کی پشتی بانی کی ہے اور اس نے اسے قبائلی حدود سے بالاتر ہونے میں مدد دی ہے اور یہ آہستہ آہستہ حقیقی معنوں میں روحانی اور مادی طور پر ایک قومی جدوجہد بن گئی ہے۔

بلوچستان میں بغاوت 1948ء کے بعد سے فراست اور شدت کے مختلف درجات کے ساتھ برقرار رہی ہے۔ اپنے سیاسی مستقبل اور وسائل پر کنٹرول کے ان کے جائز مطالبات پر مسلسل اور متکبرانہ بے اعتنائی سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بلوچ کے رویوں اور عزم میں بھی سختی اور پختگی آتی گئی۔ موجودہ دور کی بغاوت اب تک لڑی جانیوالی تمام جنگوں کی نسبت سب سے

زیادہ سخت اور بڑے پیمانے پر ہے، جیسا کہ ہر بغاوت ہر حوالے سے پچھلی کے مقابلے میں معیار کے لحاظ سے اعلیٰ تر سطح پر رہی ہے۔

اس طویل اور وسیع پیمانے پر پھیلی سیاسی اور مسلح بغاوت کو 'غیر ملکی عناصر کی طرف سے متحرک کردہ کارستانی' کے طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس جبر اور محرومی پر بلوچ عوام کی ناراضگی اور مایوسی کی شدت اور وسعت کا عکس ہے اور یہ ایک انقلابی تبدیلی کے لیے ان کی خواہش کا واضح اظہار بھی ہے۔

مارچ 1948ء میں بلوچستان کے پاکستان کے ساتھ جبری اور غیر قانونی الحاق نے بلوچ قوم پرستی میں مزید جوش و ولولہ پیدا کیا اور ان کی قومی جدوجہد نے واقعتاً ایک سیاسی ہیئت اختیار کر لی۔ ریاست کی ہر نئی جارحیت آزادی کی جدوجہد کے مقاصد کے ساتھ بلوچ معاشرے کے مختلف طبقات کی طرف سے زیادہ بڑے پیمانے پر اس سے مشخص ہونے پر منتج ہوئی۔ 15 جولائی 1960ء میں مختصر فوجی سماعتوں کے بعد حیدرآباد اور سکھر جیل میں سات بلوچ شہدا کی پھانسی نے ایک آزاد بلوچستان کے قوم پرست خواب کو مزید تقویت دی اور میر شیر محمد مری اور علی محمد مینگل کی بالترتیب مری اور مینگل علاقوں میں جدوجہد کی وجہ بنی۔

تاہم، یہ ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے فروری 1973ء میں سردار عطا اللہ مینگل کی منتخب حکومت کی غیر قانونی برطرفی اور اس کے نتیجے میں ہونے والا فوجی آپریشن تھا، جس نے واقعتاً بلوچ جدوجہد آزادی کو بھڑکایا اور اس نے آزادی کے لیے قوم پرستوں کے غیر مصالحانہ مؤقف کو بنیادی مقصد بنتے دیکھا۔

موجودہ مرحلہ جنوری 2000ء میں جسٹس محمد نواز مری کے قتل کے جھوٹے الزامات پر نواب خیر بخش خان اور ان کے حامیوں کی گرفتاری کے ساتھ شروع ہوا۔ پھر 2006ء میں نواب اکبر بگٹی کے قتل اور اس کے بعد 2007ء میں میر بالاچ خان مری کے قتل نے مفاہمت کی تمام راہیں بند کر دیں۔

مارچ 2008ء میں پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) کی حکومت کے افتتاح کے ساتھ،

بلوچستان کے مسئلے کو حل کرنے کے ان کے عزم کا پہلا امتحان سردار اختر مینگل کی مسلسل حراست کی شکل میں آیا اور وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ ان کے ملازموں کی طرف سے دو فوجی انٹیلی جنس اہلکاروں کے ساتھ مبینہ بدسلوکی کے لیے انہیں نومبر 2006ء میں گرفتار کیا گیا تھا، پیپلز پارٹی کے وعدوں کے باوجود وہ مئی 2008ء تک قید میں رہے۔ وہ فوج کی رضامندی کے بغیر انہیں رہا نہ کر سکے۔ تمام سویلین حکومتیں 'فوج کی منشا' کی مرہونِ منت ہوتی ہیں اور بلوچ یا بلوچستان پر آزادانہ طور پر فیصلہ نہیں کر سکتیں۔

پیپلز پارٹی کی حکومت نے بلوچستان کے مسئلے کے حل کے لیے صرف وعدوں، پیشکشوں، معافی اور غیر مؤثر کمیشنوں کے ساتھ زبانی جمع خرچ کیا ہے۔ بلوچوں نے ان کے دورِ حکومت میں بدترین مظالم سہے ہیں اور راجہ پرویز اشرف کے حالیہ بیانات کوئی اچھا شگون نہیں ہیں۔

بلوچ، کہ جنہیں ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، کے خلاف ریاست کے وسوسے کی جڑیں اب مزید گہری ہو چکی ہیں اور اس نے غیر مصالحانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ بلوچ کے حوالے سے ریاست کے غیر مصالحانہ رویے کے پیچھے ایک سبب موجود ہے۔ 'مقتدرہ' (اسٹیبلشمنٹ) کی ترجیح صرف اور صرف بلوچستان کے قیمتی رئیل اسٹیٹ اور وسائل ہیں، اور یہ بنگلہ دیش میں اس حماقت کی ایک نقل ہے۔

مقتدرہ کی یہ ناقص اور خطرناک بلوچ مخالف پالیسی کی جڑیں بہت گہری، انتہائی مضبوط اور انتہائی حد تک ہٹ دھرم ہیں، یہاں تک کہ یہ ایسے اقدامات کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ جس سے قوم پرستوں کو کم از کم بات چیت کرنے پر اتفاق کرنے کے لیے کوئی عذر ملے۔ فوج بلوچستان میں اپنی مالیاتی، تجارتی اور اسٹراٹیجک مفادات کے ذریعے چمالنگ اور کاسا کی پہاڑیوں کے سنگ مرمر منصوبوں جیسے اقتصادی منصوبوں کا انتظام چلاتی ہے اور یہاں تک کہ 14 اگست کی تقریبات کا میدان بھی سجاتی ہے، یہ موجودہ جابرانہ اور غیر مصالحانہ پالیسی کے خاتمے کی کسی بھی رضاکارانہ کوشش سے باز رکھتی ہے یا سویلین لوگوں کو وہاں کے معاملات میں بات کرنے کی اجازت تک نہیں دیتی۔

سویلین حکومت یا سیاسی حزب اختلاف کے رہنماؤں کی متوقع خواہش کی بنیاد پر بلوچ مسئلے کا ایک دوستانہ اور پُرامن حل تب تک ناقابلِ حصول ہے جب تک کہ بلوچستان میں فوج کا مفاد اور اثر و رسوخ نہ صرف سویلین کنٹرول سے متجاوز بلکہ درحقیقت اس کی جگہ لینا جاری رکھے، جیسا کہ بلوچستان کے گورنر، وزیر اعلیٰ، اسپیکر اور متفرق وزرا کی طرف سے عوامی سطح پر لگائے گئے الزامات میں کہا گیا ہے کہ فرنٹیئر کور (ایف سی) بلوچستان میں ایک متوازی حکومت چلا رہی ہے۔

سپریم کورٹ، جو کہ اس حد تک طاقت ور ہے کہ ایک وزیر اعظم کو معزول کر لے لیکن قانون کی خلاف ورزی کرنے والے حیلے باز ایف سی کے خلاف خود کو لاچار پاتی ہے۔ ایف سی کے خلاف بلوچوں کے اغوا اور قتل میں ملوث ہونے کے ٹھوس ثبوت ہونے کے باوجود کسی پر بھی الزام تک عائد نہیں کیا گیا ہے۔ ایف سی حیلے بازی کر کے اپنے صوابدیدی اختیارات سے دست بردار ہونے سے کترا رہی ہے اور یہ امر مستقبل قریب میں بلوچ کے خلاف اس 'غلیظ جنگ' کے خاتمے کو خارج از امکان بنا دیتی ہے۔

ایک غیر مؤثر آغازِ حقوق پیکیج اور مفلوج این ایف سی ایوارڈ بلوچ کے خلاف جاری 'غلیظ جنگ' کے حوالے سے ان کی ناراضگی اور غم و غصہ کا رخ موڑنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ فقط گزشتہ 18 مہینوں میں 500 سے زائد اغوا شدہ بلوچوں کی لاشوں نے صوبے کے زمین کو ان کے خون سے رنگا ہے۔ بلوچ مؤقف بھی قدرتی طور پر سخت گیر ہو چکا ہے اور اس کا اظہار موجودہ دور کے مسلسل اور بڑے پیمانے پر کی جانے والی بغاوت میں پایا جاتا ہے۔ اس موجودہ صورت حال کے ساتھ قابلِ قیاس مستقبل میں ایک پرامن حل کی کوئی امید نہیں ہے۔

مقتدرہ اس بات کو نہیں سمجھتی ہے کہ بلوچستان میں جبر اور 'غلیظ جنگ' کی حکمت عملی یقینی طور پر معاملات کو آگے بڑھانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔

بشکریہ: دی نیوز آن سنڈے، 29 جولائی 2012ء

http://jang.com.pk/thenews/jul2012-weekly/nos-29-07-2012/spr.htm#2

اخلاقی طور پر قائل

حال ہی میں اسلام آباد کی سپریم کورٹ میں لاپتہ افراد کیس کی سماعت پر راجہ ارشاد، جو کہ انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) اور ملٹری انٹیلی جنس (ایم آئی) کے نمائندہ وکیل ہیں، نے یہ اعتراف کیا ہے کہ 'اڈیالہ 11' کے خلاف کوئی ثبوت موجود نہیں ہے، ان کا کہنا ہے کہ انہیں حراست میں رکھا گیا ہے کیونکہ یہ ایجنسیاں ''اخلاقی طور پر اس بات پر قائل ہیں کہ وہ دہشت گردی میں ملوث تھے۔'' یہ بیان باضابطہ طور پر آئی ایس آئی اور ایم آئی کے مؤقف کو دہراتا ہے کہ اگر وہ 'اخلاقی طور پر قائل' ہوں کہ کوئی شخص مجرم ہے تو انہیں اس کو مارنے، اپاہج کرنے یا قید میں رکھنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اصل اڈیالہ 11 میں سے چار ملزمان کی لاشیں پھینک دی گئیں، اور جبکہ دوسروں کو گذشتہ سال عدالت میں پیش کیا گیا، چونکہ ان کی حالت ایسی تھی کہ ایک ملزم کی غم زدہ ماں اگلے دن صدمے سے انتقال کر گئی۔ دوسری بات یہ کہ اٹارنی جنرل نے اعتراف کیا ہے کہ صوبہ خیبر پختونخواہ میں 700 باغیوں کو بغیر کسی مقدمے کے قید میں رکھا گیا ہے لیکن انہیں رہا نہیں کیا جائے گا۔ کتنے بلوچ قید میں رکھے گئے ہیں، اس کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے؛ وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کا کہنا ہے کہ 14000 افراد لاپتہ ہیں۔ بے بس اور گرجتی سپریم کورٹ محض اجرت میں بڑھوتی کے متلاشی افسانوی کردار کی طرح کارروائی کی دھمکی دیتی ہے کہ ''میری تنخواہ بڑھاؤ، ورنہ میں.....''

اس کا مطلب خالصتاً یہ ہے کہ اگر ایجنسیوں کو اخلاقی طور پر کسی کے جرم کا یقین ہو تو اسے انصاف کی فراہمی کے بغیر ہلاک یا قید میں رکھا جا سکتا ہے۔ تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہزاروں بلوچ لاپتہ ہو رہے ہیں، ان میں سے تقریباً ایک ہزار کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا، ہلاک کیا گیا اور پورے بلوچستان میں پھینک دیا گیا۔ تاہم ان اعداد و شمار میں وہ ان گنت افراد شامل نہیں ہیں جو کہ

مستونگ، مشکے، ڈیرہ بگٹی اور مری علاقوں میں آپریشن کے دوران جاں بحق ہوئے۔ ان مظالم کے لیے جواز صرف یہ ہے کہ ایجنسیاں اخلاقی طور پر اس بات پر قائل ہیں کہ بلوچ ان کے دشمن ہیں۔ 1948ء کے بعد سے پاکستانی ادارے اخلاقی طور پر اس بات پر قائل ہیں کہ بلوچ کے خلاف کی گئی تمام ناانصافیاں جائز ہیں۔

حال ہی میں نافذ کردہ 'منصفانہ مقدمہ بل' اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ ان سے بھی زیادہ ناانصافی اور مظالم کا ارتکاب زیادہ شدت کے ساتھ وسیع پیمانے پر کیا جائے گا۔ ایک کارٹون جو کہ میں نے بہت عرصہ قبل دیکھا تھا، میرے ذہن پر نقش ہے؛ اس میں زنجیروں سے جکڑا ہوا ایک لاغر شخص اور ایک بھاری بھرکم وحشی نما آدمی ہاتھ میں ہنٹر تھامے کہہ رہا ہے کہ ''تردید کے خوف کے بغیر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ.....'' خیر، ایک قیدی کے سامنے ہنٹر تھامے کسی شخص کو تردید کے خوف کی ضرورت ہی نہیں۔ جب ناقابلِ احتساب طاقتور ادارے جن کے ہاتھ میں ہنٹر ہو، جو کہ اپنے ہی قوانین کی پاس داری نہ کرتے ہوں، اور اخلاقی طور پر قائل ہوں کہ فلاں شخص مجرم ہے، تو لہٰذا لوگوں کے پاس اور کیا چارہ ہوگا؟

سی ایس لیوس نے کہا تھا کہ ''تمام مظالم سے وہ ظلم سب سے زیادہ ظالمانہ ہو سکتا ہے کہ جسے متاثرین کی بہتری کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ کسی ڈاکو سردار کے ماتحت رہنا کسی صالح قادرِ مطلق مفسد کے زیرِ تسلط رہنے سے بہتر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکو سردار کا ظلم کسی وقت تھم جائے، ہو سکتا ہے کہ اس کی طمع کسی نقطے پر پُرتسکین ہو؛ لیکن وہ لوگ جو ہمیں ہمارے ہی مفاد کی خاطر ہمیں اذیتیں دیتے ہیں، ہمیں بلا اختتام جسمانی و روحانی اذیت بہم پہنچاتے رہیں گے، اس لیے کہ وہ یہ سب کچھ اپنے ضمیر کی اجازت کے ساتھ کرتے ہیں۔'' یہ پاکستانی ریاست کے رویے کو صحیح تناظر میں پیش کرتی ہے۔ پاکستان ہمیشہ سے ڈاکو سرداروں کا مجسّم رہا ہے جسے قادرِ مطلق خدائی فوج دار ہانکتے اور اس کی رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ یہاں اداروں کے عقائد اور رویے، جنہیں اپنے بے لگام طاقت کے سبب سزا سے مکمل استثنیٰ حاصل ہے، اپنے اس ایقان پر مطمئن ہیں کہ ان کے مظالم اخلاقی طور پر جائز ہیں۔ لہٰذا انصاف کی امید رکھنا ایک واماندہ یوٹوپیائی خواب ہی رہا ہے اور ہمیشہ

کے لیے خواب ہی رہے گا۔ سب لوگ تباہ و برباد ہو جائیں گے جب تک کہ وہ متحد نہ ہوں اور سب کے لیے ناانصافیوں کے خلاف مزاحمت نہ کریں۔

خود اتقائی ریاستیں تمام سرحدوں سے بالاتر ہوتی ہیں اور ان کے خیال میں وہ بے خطا اور عالمِ کُل ہیں۔ بدقسمتی سے، ریاست کا اخلاقی ارتقا اپنے آپ تک محدود نہیں؛ اس کا اگلا قدم لوگوں کو یہ منوانا ہوتا ہے کہ جو کچھ یہ سوچتی ہے وہ درست ہے اور ان کے لیے سب سے بہتر ہے۔ یہ خود اتقائی حقیقت سے منقطع ہونے اور کسی شخص کے خیالات مسلط کرنے کی کوشش، جو کہ بنیادی حماقت کی ایک توسیع ہے، کے سبب وجود میں آئی ہے، کیوں کہ اس طرح کے مغالطے کبھی بھی اپنے منبع تک محدود نہیں رہتے۔ مکمل اختیارات اور مذہبی رجحان کی حامل ریاستیں، فطری طور پر، انسانی حقوق کو ہمیشہ روندتی آئی ہیں کیوں کہ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ انہیں اس کے لیے ایک 'الہامی' منظوری حاصل ہے اور انہیں عوام کے خلاف اپنی غارت گری کے لیے کسی ستر تک کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح کی ریاستیں اور ان کے رہنما یہ سوچتے ہیں کہ لوگوں کو اپنے خیالات اور اپنے فلسفے کو منوانا ان کا الہامی فریضہ ہے۔ وہ لوگوں کو اپنے خیالات قبول کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس جبر کی وسعت اور مظالم لامحدود ہیں۔ خوش قسمتی سے، لوگوں کے اپنے ذہن اور مفادات ہیں، اور اسی وجہ سے وہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور بالآخر تمام جبر ناکام ہی رہتا ہے۔

مذہبی انتہا پسندی ایک لعنت رہی ہے، جہاں کہیں بھی اس نے سر اٹھایا ہے؛ تاہم، یہ دُگنی مہلک ہو جاتی ہے جب ریاست اسے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگوں کے خلاف اپنائے۔ جو مسائل اس طرح کی ریاستیں اور اس کے ادارے پیدا کرتے ہیں، وہ ان کے عقائد کی طاقت اور حاصل اختیارات سے متناسب ہوتی ہیں۔ اس میں کسی حیرانی کی بات نہیں ہے کہ وہ ایک غیر معمولی جوش اور جذبے کے ساتھ ہر قسم کے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور مظالم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ فرانسیسی مصنف اور کیتھولک فلسفی، بلیز پاسکل (1623 تا 1662) نے اسے مختصر اور جامع طور پر بیان کیا ہے کہ: ''لوگ کبھی بھی گناہ کو اس قدر خوش دلی اور کامل انداز سے نہیں کرتے جتنا کہ وہ مذہب کے نام پر کرتے ہیں۔''

پاکستانی ریاست آہستہ آہستہ 'قلعہ الموت' کی حیثیت اختیار کر رہی ہے، جہاں حسن صباح کے خبطی قاتل مقیم رہتے جو اس کے حکم پر دہشت پھیلاتے اور ان تمام لوگوں کو مار ڈالتے جو اس کی مخالفت کرتے۔ پاکستان اور اس کے اداروں نے، اپنی 'اسٹراٹیجک گہرائی' کی پالیسی اور اپنے اسٹراٹیجک اثاثوں کی فروغ پر مسلسل ثابت قدمی نے، اپنے آپ کو اس خطے اور اس کی جغرافیائی حدود میں رہنے والے لوگوں کی زندگی اور ان کے اعضا کے لیے ایک واضح اور موجود خطرہ بنا دیا ہے۔ اس پالیسی نے اسے عالمی برادری سے الگ تھلگ کر کے رکھ دیا ہے اور یہ اپنے سماجی، سیاسی اور اقتصادی بنیادی ڈھانچے کو مسلسل چاٹ رہا ہے اور اس کی باقیات میں محض ایک سیاسی، اقتصادی، اور سماجی طور پر دیوالیہ خول رہ گیا ہے جسے طاقت کے استعمال یا اس کے استعمال کی دھمکی کے ذریعے مصنوعی طور پر برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ صورت حال غیر معینہ مدت تک جاری نہیں رہ سکتی کیوں کہ سماجی، اقتصادی اور سیاسی قوانین طبیعیات کے قوانین کی طرح چاہ، خواہشات اور خوابوں سے آزاد رہ کر کام کرتے ہیں۔ یہ خول جلد یا بہ دیر اپنی ہی حماقتوں کے وزن کے سبب منہدم ہونے کا پابند ہے۔

یہ خود ساختہ، بے خطا اور معصوم ریاستیں اور ادارے جب اپنے عقائد اور پالیسیوں اور ان کی واضح خاتمے اور شکست کا ادراک کر لیں تو یہ انتہائی حد تک ظالمانہ اور بے رحم بن جاتی ہیں۔ ریاست اور اس کے ادارے اپنی بے رحمی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں اور انھوں نے پہلے ہی سے بلوچ کے خلاف اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے، اس لیے کہ بلوچ اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہ ذہنیت اور ناموافق عالمی صورتحال ہے کہ جس کے خلاف بلوچ نبرد آزما ہیں۔ اسی لیے بلوچ کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ماسوائے اُس سب کچھ کے ساتھ مزاحمت کرنے کے، جو اس کے پاس موجود ہے۔ عوام کی منشا کو بالآخر غالب ہونا ہے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 27 جنوری، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/

default.asp?page=2013%5C01%5C27%5Cstory_27-1-2013_pg3_2

مفلوج حیلے

سال 1973 تا 77ء کی بلوچ حقوق کی جدوجہد کے دوران، پاکستان نے بغاوت کو کچلنے کے لیے ایرانی مہارت، ہتھیاروں اور مالی تعاون کا استعمال کیا اور 30 ایرانی اے ایچ ون کوبرا لڑاکا ہیلی کاپٹر ایرانی پائلٹوں سمیت بلوچ گوریلوں پر حملوں کے لیے استعمال کیے، جنہوں نے 'مارو اور بھاگو' والی مہلک گوریلا حکمت عملی کے تحت مؤثر طریقے سے فوج کو شدید مشکلات سے دوچار کر دیا تھا۔ تاریخی طور پر بلوچ اور ایرانیوں کے درمیان مخاصمت رہی ہے اور پاکستان نے اپنے علاقے کے اندر بلوچ قوم پرست جدوجہد کے خلاف ایرانی خوف کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ایرانی ریاست نے منظّم طریقے سے بلوچوں کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حقوق پر قدغن لگائی ہوئی ہے، انہیں دبائے رکھا ہے اور یہاں تک کہ فعال طور پر بلوچی زبان اور لباس کی بھی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔

پھر فائق ایران نے بلوچ کے خلاف لڑنے میں پاکستان کی مدد کی، لیکن آج کے مسائل اور ایک مختلف حکومت کے باعث پاکستان اس تعیّش کا حامل نہیں ہوسکتا۔ تاہم، اب بھی وہ بلوچ قوم پرستوں کے خلاف فعال طور پر تعاون کر رہے ہیں جنہیں وہ بلوچستان میں اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ پاکستان، فریڈرک نطشے کے اس مشورے کو عملی طور پر بروئے کار لا رہا ہے: ''دشمن کے خلاف سب سے بہترین ہتھیار ایک اور دشمن ہے''، اب وہ امریکہ کے ساتھ چین کی دشمنی کا بڑی مہارت سے استعمال کرتے ہوئے اس کے ذریعے بلوچ جدوجہد کو کچلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تاہم، یہ حکمت عملی ایک دودھاری تلوار ہے۔

پاکستان نے اپنی ظالم حکومتوں اور پالیسیوں کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیشہ سپر پاور پر تکیہ کیا

ہے۔ ایک طویل مدت تک یہ امریکہ تھا لیکن افغان جنگ کے بعد سے پرانے اتحادی ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ چین، جو کہ اب عالمی بالا دستی کا متمنی ہے، اپنے مفادات کے لیے میدان میں اتر چکا ہے۔ چین بہت سے ممالک میں مکمل آمادگی کے ساتھ اکثریتی قومیت کی حمایت کرتا ہے، جو کہ دوسروں کو طیش دلاتا ہے۔

ایک عالمی طاقت بننے اور اپنی پیداوار اور ترقی کی سطح کو برقرار رکھنے کے لیے، چین کو قابلِ اعتماد توانائی اور خام مال کے ذرائع کی ضرورت ہے۔ فی الحال، چین خلیجی تیل کو اندرون ملک بھیجنے سے قبل ملاکن آبنائے کے ذریعے اپنے بحرالکاہل کے ساحل تک ترسیل کر رہا ہے؛ لیکن وہ اسٹریٹجک طور پر کمزور ملاکن آبنائے پر اپنا انحصار ختم کرنا چاہتا ہے۔ جزائر پر تنازعات کے باعث اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ کشیدگی میں اضافے کے سبب یہ مسئلہ اور بھی زیادہ فوری طور پر حل طلب بن چکا ہے۔ چین چاہتا ہے اور یہ اس کی ضرورت بھی ہے کہ اسے توانائی اور تجارت کے لیے خلیج سے مغربی چین تک ایک گزرگاہ ملے؛ اس کے مسائل کا حل گوادر اور بلوچستان ہیں۔

گوادر کے بطور ایک گہرے پانی کی بندرگاہ کے متعدد فوائد ہیں؛ یہ سارا سال، ہر موسم میں گہری کھاڑی والی بندرگاہ ہے جو کہ اس کے سب سے بڑے آئل ٹینکروں کو بالآخر سنبھال سکتی ہے۔ یہ خلیج عرب کے قریب اور شپنگ کی اہم گزرگاہ پر واقع ہے۔ یہ مشرق وسطیٰ کے تیل اور گیس کے ذخائر کو چین کی پہنچ میں لاتا ہے۔ گوادر کو پاکستان کے شمال میں شاہراہ قراقرم کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے پہلے سے منصوبہ شدہ روڈ چین کے لیے ملاکن راستے سے تقریباً 8000 کلومیٹر (5000 میل) کا فاصلہ کم کرسکتا ہے اور یہ خلیج سے اندرن ملک اپنی توانائی کی کھپت پورا کرنے کے لیے ایک براہِ راست راستہ ہوگا۔

چین نے طویل مدت سے بلوچستان پر منصوبہ بندی کی ہوئی ہے کیونکہ بلوچستان کا گوادر پورٹ اور اس کے وسائل پر دسترس اور وہاں قدم جمانے سے چین کو اپنے عالمی عزائم کی جلد تکمیل کے لیے ایک اہم سہولت فراہم ہوگی۔ پاکستان نے گوادر کو چاندی کی تھالی پر رکھ کر چین کو پیش

کر دیا، جب سال 2000ء میں فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف نے گوادر کی ترقی کے لیے اس کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کے پہلے مرحلے میں بندرگاہ کی تعمیر کے لیے اس نے 200 ملین ڈالر سے زائد کی سرمایہ کاری کی ہے۔ تاہم، 2007ء میں پورٹ آف سنگاپور اتھارٹی انٹرنیشنل لمیٹڈ کو 20 سال ٹیکس کی رعایت کے ساتھ بندرگاہ کو چلانے کے لیے 40 سال کا ایک معاہدے کیا گیا تھا۔ اس نے پانچ سال کے دوران 525 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کا وعدہ کیا تھا لیکن سودا کارگر ثابت نہ ہوا۔ پورٹ آف سنگاپور اتھارٹی نے حکومت پر معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام لگایا بشمول اس ضروری 670 ایکڑ زمین کی عدم دستیابی کے کہ جس پر بحریہ نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اس کے بعد اگست 2012ء میں پاکستان اور چین نے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت گوادر پورٹ کا آپریشنل کنٹرول اسے دے دیا گیا۔

پاکستانی حکومت چین کو سب سے زیادہ منافع بخش شرائط پر سب کچھ دے رہی ہے اور اس سے یہ بھی التجا کر رہی ہے کہ وہ گوادر کوسٹل آئل ریفائنری کے منصوبہ پر نظر ثانی کرے جسے 2009-10ء میں لپیٹ دیا گیا تھا، جب صوبے کو چینی شہریوں کے لیے نو گو ایریا قرار دے دیا گیا، چوں کہ فروری 2006ء میں حب میں تین چینی انجینئر ہلاک ہو گئے تھے اور 4 مئی، 2003ء کو گوادر میں ایک بم حملے میں مزید چینی انجینئر مارے گئے تھے۔ پاکستان چین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے 20 سال کیلئے ٹیکس کی چھوٹ اور ایک فیصد ورکرز منافع شرکت فنڈ (WPPF) کی چھوٹ دینے کی پیشکش کر رہا ہے۔ ان تمام مراعات کا مقصد چین کے بلوچستان کے وسائل کا استحصال کرنے میں ملوث ہونے کو یقینی بنانا ہے۔ ترقی کے بہانے سے بلوچ اس بندر بانٹ اور گوادر کی دستبرداری سے سخت نالاں ہیں، کیونکہ اس سے وہاں کی آبادیاتی خصوصیات میں تیزی سے تبدیلی آئے گی اور چین کو ایک فوجی اڈہ مہیا کرے گی۔

گوادر کی عسکریت کاری بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ گوادر کے نئے ہوائی اڈے کی 5600 ایکڑ زمین ملٹری اسٹیٹس آفیسر (ایم ای او) نے 1.05 ارب روپے میں خریدی ہے، جس نے

اسے فوجی جائیداد بنا دیا ہے۔ اس رقبے کا کوئی ہوائی اڈہ ضرور فوجی مقاصد کے لیے ہے، لندن کا ہیتھرو ایئرپورٹ، جہاں مصروف ترین اوقات کے دوران ہر 46 سیکنڈ میں ایک جہاز اتر تا یا پرواز کرتا ہے، 2965 ایکڑ پر محیط ہے۔ مئی 2011ء میں چین کی طرف سے گوادر پورٹ کا انتظام چلانے کی رضامندی کے بعد، پاکستان کے سابق وزیر دفاع احمد مختار نے اپنے چین کے دورے کے دوران کہا کہ ''تاہم، ہم چین کے مزید شکر گزار ہوں گے اگر وہ گوادر میں ایک بحری اڈے کی تعمیر پر اتفاق کر لے۔''

گوادر میں بلوچ کو کئی طرح کے مسائل کا سامنا ہے۔ افسانوی طرز پر زمین کی قبضہ گیری نے انہیں اپنی سب سے قیمتی شے سے محروم کر دیا ہے؛ پینے کے پانی کی ایک شدید دائمی قلت برقرار ہے؛ روزگار میں مقامی لوگوں کا حصہ صرف جسمانی مشقت ہے، جیسا کہ انہیں ایک اقلیت میں تبدیل کیا جا رہا ہے اور ریاستی جبر بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ ترقی کے ان مفلوج حیلوں سے اپنی محرومی اور بے دخلی پر سخت نالاں ہیں۔ مارچ 2011ء میں، گوادر شہر کے باہر فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن (ایف ڈبلیو او) کے ایک کیمپ پر حملہ کیا گیا جس میں 11 افراد کو ہلاک اور دو گاڑیوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا۔ بحریہ نے ماہی گیری کے لیے اوقات مقرر کر رکھے ہیں جس پر مچھلیاں کوئی توجہ نہیں دیتیں لہٰذا ماہی گیر بھی ان اوقات کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور انتظامیہ ان کی کشتیوں کو نقصان پہنچا کر انہیں سزا دیتی ہے۔ جنوری 2006ء میں، عسکریت پسندوں نے سیکورٹی فورسز کی طرف سے ماہی گیروں کی درجنوں کشتیوں کو نقصان پہنچانے کے خلاف جوابی کارروائی کرتے ہوئے گوادر فش ہاربر میں پاکستان نیوی سب میرین فورس کی تین لانچوں کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔

تاہم، گوادر پاک چین دوستی کا واحد شکار نہیں ہے؛ سینڈک میں، چین کی میٹالرجیکل کنسٹرکشن کمپنی (ایم سی سی) کو 2012ء تک دس سال کی لیز دی گئی تھی۔ سید فضل حیدر نے 2006ء میں خبردار کیا تھا کہ چینی حد سے زیادہ کانکنی کر رہے ہیں؛ 15800 ٹن خام تانبے کے

بجائے 24000 ٹن نکالا جا رہا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی اور زہریلا کیچڑ لوگوں کے لیے سنگین مسائل ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بلوچستان کو 0.7 ملین ڈالر سالانہ کی معمولی رائلٹی موصول ہو رہی ہے، بلوچ کی ناراضی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس لیز میں پانچ سال کی توسیع کر دی گئی ہے۔

سینڈک اور گوادر بلوچستان میں موجود بگاڑ کا خلاصہ ہیں؛ مقامی افراد فوائد کے حصول سے خارج کر دیے گئے ہیں؛ آبادیاتی خصوصیات میں تبدیلی زبردستی لائی جا رہی ہے؛ زمین پر ایک حریص قبضہ گیری اور ترقی کے مفلوج حیلوں بہانوں سے وسائل کا استحصال جاری ہے؛ ضروری سہولیات کی شدید کمی دائمی ہے؛ بلوچ اثاثوں کو تحفے کے طور پر دیا جا رہا ہے؛ عسکریت کاری بلا روک بڑھ رہی ہے؛ مسلح افواج نے من مانی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور بلوچ کے ساتھ تادیبی انداز میں نمٹ رہے ہیں؛ ہلاک اور لاپتہ افراد کی فہرست طویل ہوتی جا رہی ہے، اور آخری مگر اہم بات یہ ہے کہ بلوچ ان تمام ناانصافیوں کے خلاف مزاحمت جاری رکھے ہوئے ہیں۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 3 فروری، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/default.asp?page=2013%5C02%5C03%5Cstory_3-2-2013_pg3_2

راسپوتینی و میکاولی طرز کی ذہن شوئی

حال ہی میں سب پاکستان حکومت کی بنیادی پالیسیوں میں ہونی والی قیاس شدہ تبدیلیوں پر بحث کرتے رہے ہیں۔ یہاں بنیادی پالیسی کا مطلب لازماً اپنے 'اسٹریٹجک اثاثوں' کی جانب اس کا رویہ ہے، جنہیں یہ افغانستان اور کشمیر میں توازن میں جھکاؤ کے لیے مددگار سمجھتا ہے، کیونکہ براہِ راست ریاستی مداخلت مکافات عمل کو مدعو کرے گی۔ رویے میں کسی قسم کی تبدیلی فطری طور پر بھارت اور افغانستان کی جانب رویے میں تبدیلی لائے گی، اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ دنیا بھر میں پھیلی دہشت گردی کی لعنت میں بھی، جسے ہمیشہ بلا کسر اپنا نقطہء آغاز یہیں سے ملتا ہے۔

اندرونی تبدیلیوں کے بغیر بیرونی تبدیلیاں کبھی نہیں آسکتیں اور اندرونی تبدیلی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے ہیں؛ ذہنیت کی تبدیلی کے بغیر تبدیلیاں کبھی نہیں آسکتیں۔ تبدیلی یا اس کی کمی کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پاکستان کی اصل روح کو سمجھا جائے اور اس کے راہِ عمل کا سراغ لگایا جائے۔ اس سیاق وسباق کے بغیر اس کا تجزیہ کرنے سے غلط اور عاجلانہ نتیجہ اخذ ہوگا۔

پاکستان برطانوی حکمرانوں اور ان کی تیار کردہ اشرافیہ کی فوری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آیا، جنہوں نے سوچا تھا کہ یہ بہتر طور سے برطانیہ کی خدمت کر سکے گا، اگر اس کے پاس ایک ملک کی حیثیت ہو جو ان کی چوکی یا چھاؤنی کی دور افتادہ چوکی سے منسلک ہو۔ جب ہندوستان کی آزادی کے مطالبات نے زور پکڑا تو برطانیہ نے یہ محسوس کیا کہ وہاں پر آزاد منش سیاست دانوں کی حکومت پر گرفت سے خلیج میں ان کے مفادات، خاص طور پر ان کے تیل کے مفادات، جو کہ صنعتی دنیا کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل تھے، ناقابلِ تلافی حد تک متاثر

ہوں گے۔ اس کے نتیجے میں، ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول (1943ء تا 47ء) نے سیکرٹری برائے ہندوستانی ریاست کو اپنے فروری 1946ء کے خط میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ جب کہ ہندوستان کو آزادی دی جارہی ہے، برطانیہ کو شمال مغربی ہندوستان میں ایک اور ملک کی تخلیق پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو خلیج فارس میں برطانیہ کے مفادات کا تحفظ کرے۔ اس غور وخوض نے اسے اچانک وفاق سے آزادی کی مانگ میں تبدیل کر دیا۔

بیرونی عوامل اور حالات تبدیلی لانے میں کردار تو ادا کرتے ہیں مگر اصل تبدیلی فیصلہ کن اور اہم اندرونی ضرورتوں اور اندرونی جوہر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہاں اندرونی حرکیات 1947ء سے لے کر اب تک ایک ہی ڈگر پر رواں دواں ہیں، اور جوہرِ اصل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، البتہ کچھ کاسمیٹک تبدیلیاں ضرور آئی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو ٹھگا گیا ہے، ان سے ناروا سلوک روا رکھا گیا ہے اور ان سے ہیرا پھیری کی گئی ہے، اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ابھی تک بہت سے لوگ اس ڈھٹائی کے ساتھ کی گئی جوڑ توڑ اور دھوکہ دہی کو دیکھنے تک سے انکاری ہیں۔ والٹیئر نے بجا طور پر کہا تھا، ''آپ احمقوں کو ان زنجیروں سے آزاد نہیں کرا سکتے، جنہیں وہ مقدس سمجھتے ہوں۔''

مندرجہ ذیل تمثیل اس انتہائی مایوس کن صورت حال کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ تھیئری ٹلّی، ایک ماہر سازشی شخص، کہ جس نے فرانسیسی امیر ویڈرینز خاندان کے 11 ارکان کی 'ذہن شوئی' کی اور انہیں ان کے حقوق اور دولت سے محروم کیا۔ ویڈرینز کے وکیل نے اس کی شخصیت کو اس طرح بیان کیا، ''ٹلّی راسپوٹین اور میکاولی کا ایک منفرد مرکب ہے۔'' یہ 1999ء تھا جب گھسلین ڈی ویڈرینز کو پیرس میں اس کے سیکرٹریوں کے تربیتی ادارے میں 36 سالہ تھیئری ٹلّی سے متعارف کرایا گیا۔ اس کی دل فریبی سے مسحور ہو کر انہوں نے اسے ملازم رکھ لیا اور جلد ہی وہ ایک قریبی معتمد بن گیا۔ سال 2000ء کے وسط میں، گھسلین نے ٹلّی کو مونفلا کوئن موسیقی میلے میں شرکت کرنے کی دعوت دی۔ بورڈو میں 13 ویں صدی کے گاؤں مونفلا کوئن کے قریب ان کی آبائی حویلی میں ٹلّی کا ایک مہمان کے حیثیت سے خیر مقدم کیا گیا۔ وہاں اس نے ان سے کہا ہے

کہ وہ نیٹو سے تعلقات رکھنے والا ایک خفیہ ایجنٹ ہے۔ 66 سالہ گھسلین ڈی ویڈرینز تھیئری ٹلّی کی ٹروجن گھوڑی تھی، اور ایک بار جب اس نے پہلے سے رقابت اور حسد زدہ خاندان تک رسائی حاصل کر لی، تو اس نے انہیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ خاندان کی باہمی نااتفاقی اور بداعتمادی ان پُرفریب اور خیالاتی دروغ بیانیوں کے لیے زرخیز زمین تھی، جنہیں ٹلّی انہیں بتاتا اور وہ بہ آسانی ان پر یقین کر لیتے۔ گھسلین کے شوہر جین مرچنڈ نے خبردار کیا کہ وہ ایک پیسے اینٹھنے والا بہروپیا ہے، لیکن اس کی سننے کے بجائے، ان میں طلاق ہوگئی۔

ٹلّی نے اپنی دل فریبی کے ذریعے فرانس کے سب سے قدیم امیر خاندانوں میں سے ایک کے دل میں اس طرح سے جگہ کر لی اور انہیں باور کرایا کہ ایک خفیہ مسانک آرڈر نے انہیں جان سے مارنے کے لیے ہدف بنایا ہوا ہے اور ان کی مال و دولت ہتھیانا چاہتا ہے، اور یہ کہ صرف وہ، ایک 'خفیہ ایجنٹ' اور ہیپسبرگ کی اولاد، ان کی حفاظت کر سکتا ہے۔ ٹلّی نے انہیں اس خطرے کی بابت، کہ جن کا انہیں سامنا تھا، اور اپنی افادیت پر مکمل طور پر قائل کر لیا۔ پس، جب اس نے انہیں اپنے اکاؤنٹس خالی کرنے، اپنا سامان بیچنے اور اپنی آمدنی کو بلیولائٹ فاؤنڈیشن میں محفوظ کروانے کے لیے کہا تو انہوں نے بلا کسی چوں و چرا کے ایسا ہی کیا۔ وہ اور اس کا ساتھی جیک گونزالز، ان کے خرچ پر اسراف کی زندگی کا مزہ لیتے رہے۔

سال 2003ء تک، ویڈرینز خاندان کے تمام 11 افراد اپنی حویلی چھوڑ چکے تھے اور اس کے اصرار پر وہ سب مونفلا کوئن کے قریب ٹالاڈے میں گھسلین کے 74 سالہ بھائی فلپ کے گھر میں منتقل ہو گئے۔ وہ وہاں 2003ء تا 2008ء کے درمیان بند دروازوں کے پیچھے رہتے رہے۔ ٹلّی نے تمام گھڑیوں اور کیلنڈروں کے استعمال سے بھی منع کر دیا تھا تاکہ انہیں اپنے زمان و مقام و ماحول کے احساس سے بے گانہ کر دے۔ بعد میں مکمل کنٹرول کے لیے، اس نے انہیں آکسفورڈ منتقل کر دیا تاکہ وہ ایک واقف ماحول سے مکمل طور پر کٹ جائیں۔

سال 2008ء میں فلپ نے بالآخر آکسفورڈ والا گھر چھوڑ دیا اور فرانس چلا گیا اور ٹلّی کے

خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ ایک بین الاقوامی وارنٹ جاری ہوا اور ٹلّی کو اکتوبر 2009ء میں زیورخ سے گرفتار کر لیا گیا۔ 13 نومبر، 2012ء کو ٹلّی اور جیک گونزالز کو 2001ء تا 2009ء کے درمیان ویڈرینز خاندان کی 'ذہن شوئی' کا مجرم قرار دے دیا گیا۔ خاندان کی تقریباً پانچ ملین یورو کی ہتھیائی گئی دولت میں سے صرف 220000 یورو برآمد کیے گئے۔

اپنے استغاثہ کے دوران، ٹلّی نے راسپوٹینی اور میکاولی طرز کی ذہن شوئی کے مختلف 'مراحل' بیان کیے جنہیں اس نے متاثرین کو اپنا مطیع بنانے کے لیے ان کے ذہنوں پر استعمال کیا۔ 1) خاندان کے ہر فرد کی کسی خاص کمزوری کو بھانپنا اور اس پر اس کا شکار کرنا؛ 2) وسوسے میں مبتلا ایک محصور ذہنیت کی فصل بونا؛ 3) ہر چیز کے لیے ایک جواب تیار رکھنا؛ 4) مضبوط بندھن کو توڑنا تاکہ اپنے شکار کو بہتر طور سے غلام بنایا جا سکے؛ 5) خاندان کے ہر فرد میں ان کی اپنی ذاتی زندگی پر شک پیدا کرنا۔ راسپوٹینی اور میکاولی طرز کی حکمت عملی کے ساتھ، اس نے جلد ہی ان کے ذہن پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔

پاکستان میں، 'اسٹیبلشمنٹ' تھیئری ٹلّی ہے اور عوام ویڈرینز خاندان۔ یہ راسپوٹین اور میکاولی میڈیا کو بطور اپنے فعال ساتھی کے، ٹلّی کی جوڑ توڑ والی حکمتِ عملی کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کے بھولپن اور کمزوریوں کا استحصال کرنے کے بعد انہیں لوٹتے اور خود کو مالا مال کرتے آئے ہیں۔ تقسیم کے بعد سے ان دونوں نے مل کر ہمسایہ ممالک اور اسلام کو لاحق خطرات کے خوف کے ساتھ وسوسے میں مبتلا ایک محصور ذہنیت کی کاشتکاری کی۔ انہوں نے لوگوں کے درمیان بداعتمادی پیدا کی، اور اس کے علاوہ، انہوں نے مضبوط تاریخی اور ثقافتی بندھن کو مذہب کے متبادل کے ساتھ توڑنے کی حتیٰ الوسع کوشش کی تاکہ اپنے متاثرین کو بہتر طور پر غلام بنا سکیں۔ وہ لوگوں کو جسمانی طور پر تو علیحدہ نہیں کر سکے، اسی لیے انہوں نے جعلی نظریات اور پرکشش نعروں کے ذریعے انہیں اپنے مقام کے احساس سے بیگانہ کر دیا۔

اسٹیبلشمنٹ نے کامیابی حاصل کی ہے، ماسوائے بنگالیوں اور بلوچوں کے خلاف۔ بلوچ نے

جین مرچنڈ کی طرح جلد ہی اس دھوکہ دہی کا ادراک کر لیا، جب کہ بنگالی فلپ کی طرح صعوبتیں جھیلنے کے بعد صاحبِ بصیرت بنے۔ بدقسمتی سے، متاثرین کی اکثریت راسپوٹینی اور میکاولی طرز کی حکمتِ عملی میں مسحور ہے اور لازمی طور پر وہ اسٹاک ہوم سنڈروم کا شکار رہیں گے۔ ٹلّی جیسی اسٹیبلشمنٹ نے یہاں لوگوں کی قیمت پر اسراف کی زندگی گزاری ہے۔ اصل ٹلّی تو پکڑا گیا لیکن یہاں کے ٹلّیوں کے پاس مکمل طاقت ہے اور انہیں وہ سب کچھ کھونے سے سخت نفرت ہے، جس سے وہ لطف اندوز ہوتے رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے انتہائی حد تک ظالم اور جابر بن چکے ہیں۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 10 فروری، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/default.asp?page=2013%5C02%5C10%5Cstory_10-2-2013_pg3_2

بلوچ لاپتہ افراد: ایک روح فرسا داستان

(حصہ اول)

بلوچ لاپتہ افراد اور ان کے تباہ حال رشتہ داروں کی خاموش اور دکھ بھری پکار انسانیت کی روح کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے کافی زوردار ہے، لیکن بہ ظاہر یہاں کے مرکزی دھارے کے معاشرے اور میڈیا پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا، دونوں اس دکھ بھری پکار پر بہرے ہیں۔ جو کچھ بلوچستان میں ہو رہا ہے، اسے معاشرہ اور میڈیا بڑی حد تک یا تو دیکھنے سے انکاری ہیں یا ان مظالم کو صحیح قرار دینے کے لیے جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تمام ریاستی ادارے اس جرم کے ارتکاب میں معاون اور آمادہ ہیں، اور انہوں نے متاثرہ افراد کو اپنے درد کا اظہار کرنے کے لیے اپنی زندگی اور اعضا کا خطرہ مول لینے کے لیے مجبور کر رکھا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ 10 فروری کو کراچی میں ایک بڑی بلوچ ریلی نے بینرز اور پلے کارڈز اٹھائے ہوئے تھے اور آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انہوں نے آزاد بلوچستان کا ایک بڑا پرچم بھی اٹھا رکھا تھا، یہ جان کر کہ کینہ پرور پاکستانی ریاست ان لوگوں کو بھی سزا دیتی ہے جو اغوا کیے گئے لوگوں کی لاشیں وصول کرنے جاتے ہیں۔ گُلّے، بہار خان پیرداد انی کے بیٹے نے اپنے رشتہ داروں، جبری طور پر غائب کیے گئے دو بھائی اور میرے سابقہ شاگرد محمد خان اور محمد نبی کی لاشیں وصول کی تھیں، 15 اگست، 2012ء کے بعد سے لاپتہ ہے۔ ریاست ان لوگوں کے لیے ایک مناسب تدفین بھی نہیں چاہتی جن کو وہ مار دیتی ہے۔

عام طور پر لیکن غلطی سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لاپتہ افراد کی کہانی حالیہ دنوں کی ہے۔ 6 فروری، 1974ء کو سردار عطا اللہ مینگل کے بیٹے اسد اللہ مینگل اور احمد شاہ کو انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اغوا کیا، اور اسی طرح میرے دوست دلیپ داس عرف دلی کو، میرے مری دوست شیر علی، بہار

خان لالوانی، شفیع محمد بادانی، محمد درکانی، اللہ بخش اور شاہ دوست پیرداد انی کو غائب کیا گیا، جن کی بابت پھر کبھی نہیں سنا گیا۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سارے بلوچوں کو اسی طرح کے انجام کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

یہاں بیشتر دانش وروں نے لاپتہ افراد کے مسئلے کو نظر انداز کیا ہوا ہے، ان میں سے کچھ کہ جنہوں نے اس خاموش دکھ بھری پکار کو صدا فراہم کی ہے، ان میں سے ایک 'پھٹتے آموں کا ایک کیس' کے مصنف محمد حنیف ہیں، جو کہ سب سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ فصیح ہیں۔ انہوں نے ایک پمفلٹ، 'بلوچ جو لاپتہ نہیں رہے اور وہ جو لاپتہ ہیں'، پاکستان انسانی حقوق کمیشن کی ایک رپورٹ کے طور پر لکھا ہے۔ انہوں نے چھ لاپتہ یا اب جو لاپتہ نہیں رہے، ان افراد کے رشتہ داروں کے انٹرویو لے کر اس مسئلے کو چبھتے انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ اس درد، فریب اور مایوسی کی روح شکن توضیحات ہیں کہ جنہیں انکے رشتہ دار جھیل رہے ہیں۔ شاید، آئی ایس پی آر اس پر بھی، مظالم کو بے نقاب کرنی والی دیگر رپورٹوں کی طرح، 'جھوٹ کا پلندہ' والا لیبل لگا دے گی۔ زیر نظر مضمون حنیف کے پمفلٹ پر مبنی ہے۔

قدیر بلوچ کا بیٹا جلیل ریکی، بلوچ ریپبلکن پارٹی کا سیکرٹری اطلاعات تھا۔ اس کے دو سالہ بیٹے کے دل میں ایک سوراخ تھا۔ وہ لاپتہ ساتھیوں کے لیے مہم چلا رہا تھا، اس کے دوستوں نے انہیں خبردار کیا کہ اس کو اٹھا لیا جائے گا، لیکن اس نے کہا کہ ''اگر میں بھاگ گیا تو یہ تمام پریس ریلیز کون لکھے گا؟''، اور پھر ایک دن وہ آ گئے اور تقریباً تین سال کے لیے وہ ایک لاپتہ شخص بن گیا۔ اس مدت کے دوران، اس نے ایک بار اپنے خاندان کے لوگوں سے بات کی تھی، جب ایک فوجی نے، خاندان کی طرف سے اپنے موبائل میں ہزار روپے کا بیلنس ڈلوانے کے بعد، اسے بات کرنے دی۔

لوگ ان مظالم کو عدم دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں، کیونکہ لاپتہ اور ہلاک کیے گئے بلوچوں کو محض ایک شماریاتی حیثیت دے کر خارج البلد کر دیا گیا ہے۔ تاہم، قدیر کے لیے، جو کہ اب وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کا نائب چیئرمین ہے، اس کا بیٹا جلیل محض اعداد و شمار نہیں تھا اور انہوں نے

اس کی بازیابی کے لیے حتی الوسع کوشش کی۔ قدیر نے اپنی ایف آئی آر میں جنرل پاشا کو نامزد کیا تھا۔ ایک بار ایک کرنل اس کے پاس آیا اور کہا کہ اسے ان کا درد محسوس ہوا ہے، اور اگر ان کا بیٹا صرف ایک سیاسی کارکن ہے تو اسے رہا کر دیا جائے گا۔ دو سال اور تین ماہ لاپتہ ہونے کے بعد عید الاضحیٰ سے چند روز قبل، جلیل ایک لاپتہ شخص نہیں رہا بلکہ دل میں گولی مارا گیا مردہ شخص بن چکا تھا۔ اس کی لاش تربت سے ملی۔ اس کے دل اور اطراف میں تین گولیاں تھیں۔ قدیر کو ریاست کی طرف سے تدفین کے لیے مدد کی پیشکش کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ ''آپ کا کام اسے لے جانا تھا۔ آپ کا کام اس کو مارنا تھا۔ آپ نے اپنا کام کر دیا ہے۔ باقی سب میں خود کر سکتا ہوں۔'' پھر قدیر نے کچھ ایسا کیا کہ کسی خاندان والے آدمی کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے اپنے پانچ سالہ پوتے کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے مردہ والد کی لاش دکھانے لے گیا۔ انہوں نے اس بات کو یقین بنایا کہ بچہ اپنے والد کی گولیوں سے چھلنی، بری طرح مسخ شدہ لاش کو اچھی طرح دیکھ لے۔ انہوں نے بچے سے بات بھی کی اور اسے بتایا کہ اس کے والد کو کس نے اور کیوں مارا ہے۔ پاکستان یہ سب بلوچ کے ساتھ کرتا ہے اور پھر ان سے اپنے گن گانے کی بھی توقع رکھتا ہے۔

بلال مینگل نوشکی میں ایک اعزازی صحافی تھا، اسے نو بچوں کو کھلانا تھا۔ وہ ایک کرنل کی پیشکش پر فوج کے نوشکی قلعے میں وردی ساز ٹھیکیدار بن گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی قیمت اسے اپنے پسندیدہ بیٹے خالد کی صورت میں ادا کرنی پڑے گی جسے وہ سلائی میں مدد دینے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ قلعے میں یہ مستقل ہدایات تھیں کہ کوئی افسر یا سپاہی حملوں کے خطرے کے سبب باقاعدہ اجازت کے بغیر باہر نہیں جا سکتا۔ ایک دن نائب صوبیدار رمضان نے احکامات کی خلاف ورزی کی اور فائرنگ میں زخمی ہو گیا۔ واقعہ چھ بج کر پندرہ منٹ پر ہوا اور بلال سات بج کر تیس منٹ پر قلعے سے نکلا، لیکن اس واقعے کے لیے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمے کی سماعت 10 ماہ تک چلتی رہی۔ ایک دن دوسرے قیدیوں نے اسے بتایا کہ ان کے بیٹے خالد کو اٹھا لیا گیا ہے۔ خالد 25 دن کے بعد واپس آ گیا لیکن یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی؛ 16 مئی، 2011ء کی رات کو، ان کے گھر پر چھاپہ مارا گیا اور ان کے دو بیٹوں خالد اور مرتضیٰ کو اٹھا لیا گیا۔ اپنے گھر کی چھت سے اس

نے ان گاڑیوں کو قلعے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ بلال نے پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او سے مدد مانگی، جو دروازے تک ساتھ رہا لیکن وہاں سے انہیں واپس کر دیا گیا۔ اس نے ایک ایف آئی آر درج کرائی، اور بھوک ہڑتال شروع کر دی، بعد میں بلوچستان ہائی کورٹ میں ایک درخواست دائر کی۔ اس نے کور کمانڈر کوئٹہ کے پی ایس او کے ساتھ ایک پُرتکرار ملاقات بھی کی تھی جو کہ شدید الجھن میں اختتام پذیر ہوئی، مدد کرنے کے بجائے اس نے کہا کہ اسے، یعنی بلال کو، 25 سال کی سزا سنائی گئی ہے اور اسے جیل میں ہونا چاہیے۔ بلال سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی طرف سے شروع کیے گئے سماعتوں میں بھی پیش ہوا، لیکن ایسا نہیں لگتا کہ اسے ان پر زیادہ اعتماد ہو۔ ''چیف جسٹس یہاں صرف اپنی صورت دکھانے کے لیے آتے ہیں۔ وہ صرف اپنے آپ کو بچانے کے بارے میں فکرمند ہیں۔ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا ہے، کچھ بھی تبدیل نہیں ہوگا۔'' خالد ابھی تک لاپتہ ہے۔

لاپتہ ذاکر مجید کی بڑی بہن، فرزانہ مجید، بلوچ جدوجہد کی ایک نئی صورت اور مرحلے کی نمائندگی کرتی ہے۔ پہلے کبھی بھی بلوچ خواتین نے اتنے فعال طور پر اور اتنے بڑے پیمانے پر حصہ نہیں لیا ہے؛ ریاستی مظالم نے انہیں اس کردار پر مجبور کر دیا ہے۔ فرزانہ نے بلوچستان یونیورسٹی سے بایوکیمسٹری میں ماسٹرز کیا ہے اور ایم فل کے پروگرام میں داخلہ لیا ہوا ہے۔ لیکن کلاسوں میں شرکت کرنے یا کسی تجربہ گاہ میں کام کرنے کی بجائے، وہ احتجاجی کیمپوں میں اپنے بھائی کی رہائی کا مطالبہ کرنے کے لیے بیٹھتی ہے۔ ذاکر بلوچ اسٹوڈنٹس آگنائزیشن (آزاد)، ایک قوم پرست طلبا تنظیم، کا نائب صدر تھا اور انگریزی میں ماسٹرز کا ایک طالب علم۔ اسے دوستوں کے ساتھ مستونگ سے واپس آتے وقت انٹیلی جنس اہلکاروں نے گرفتار کیا تھا۔ اس کے دوستوں کو جلد ہی رہا کر دیا گیا اور انہوں نے فرزانہ کو اطلاع دی؛ ٹی وی چینلز پر بھی یہ خبر نشر ہوئی تھی۔ ذاکر کے بھائی نے مستونگ میں ایک ایف آئی آر درج کرائی ہے۔ فرزانہ اپنی بیمار ماں کے بارے میں فکرمند تھی لیکن آخر میں اسے بتانا پڑا، خاتون شکستہ ہو گئی، دعائیں مانگنے لگی اور ابھی تک دعائیں مانگ رہی ہے۔

فرزانہ نے بلوچستان ہائی کورٹ میں ایک رٹ پٹیشن دائر کی، اور تب سے اپنے بھائی کی گمشدگی کو اجاگر کرنے کی امید میں وہ ہر جگہ احتجاجی کیمپوں سے جڑ گئی ہے۔ اس نے ماما قدیر کے ساتھ اسلام آباد میں کیمپ لگایا اور جسٹس جاوید اقبال سے ملاقات کی جنہوں نے ان سے وہی کہا جو کہ وہ ہر دوسرے بلوچ خاندان کو کہتا ہے: احتجاجی کیمپ بند کرو، گھر جاؤ، آپ کے خاندان کے افراد ایک ہفتے کے اندر اندر آپ کے ساتھ ہوں گے۔ حنیف کہتے ہیں، ''جاوید اقبال نے اس ڈراؤنے خواب کو دوام دینے میں ایک عجیب کردار ادا کیا ہے۔ اس نے بہت سے خاندانوں سے بہت سارے جھوٹے وعدے کیے ہیں کہ بہت سے لوگ ان کو اس مسئلے کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔''

فرزانہ اپنے آبائی شہر خضدار واپس چلی گئی اور انہیں یہ اطلاعات موصول ہونا شروع ہوئیں کہ ذاکر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ پھر ذاکر کے لاپتہ ساتھیوں کی لاشیں باقاعدہ وقفوں کے ساتھ نمودار ہونا شروع ہوئیں۔ انہیں غفار لانگو کی لاش ملی، پھر سمیر رند کی، جلیل ریکی، ثنا سنگت کی لاش، جسے 28 گولیاں ماری گئی تھیں۔ دو سال تک، انہیں ذاکر کے بارے میں خبر موصول ہوتی رہی لیکن پچھلے ڈیڑھ سال سے یہ سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ فرزانہ نے پاکستانی ریاست اور اس کے عوام سے آس لگانا چھوڑ دیا ہے۔ وہ کہتی ہے، ''کیا یہ بالکل واضح نہیں ہے کہ وہ ہم بلوچوں سے نفرت کرتے ہیں؟ اگر ذاکر نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے، وہ اسے عدالت میں کیوں نہیں لاتے؟ اس پر مقدمہ چلائیں، اور اسے سزا دیں، پورے خاندان اور پوری قوم کو کیوں سزا دے رہے ہیں؟'' احتجاجی کیمپوں میں وہ اپنا وقت، چے گویرا کی سوانح عمری، اسپارٹیکس، موسیٰ سے مارکس تک جیسے انقلابی اور سیاست سے متعلق کتابیں پڑھنے میں صرف کرتی ہے تاکہ دوسرے لوگوں کی جدوجہد کی بابت جان سکے۔

(جاری ہے)

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 17 فروری، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/default.asp?page=2013%5C02%5C17%5Cstory_17-2-2013_pg3_2

بلوچ لاپتہ افراد: ایک روح فرسا داستان

(حصہ دوم)

ایک لاپتہ بیٹے، بھائی، یا دوست کا درد کسی شخص کی نفسیات پر گہری چھاپ بنائے رکھتا ہے۔ یہ ایک اَن مٹ درد ہے، اسے نہ تو وقت اور نہ ہی دلاسے کم کر سکتے ہیں۔ دو ہفتے قبل، میں اپنے ساتھی 'جانی' دلیپ داس کی 91 سالہ ماں سے اپنی ادائیگیء احترام کے لیے گیا۔ اس کے پہلے الفاظ تھے، ''میرا جانی کیسا ہے؟'' وہ اب بھی یہی سمجھتی ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اگرچہ یہ 1975ء کا سال تھا جب اسے شیر علی مری کے ہمراہ فوج کے انٹیلی جنس نے بیل پٹ سے اٹھایا تھا۔ انہوں نے وہ اور ان کے شوہر، ایئر کموڈور (ر) بلونت داس، جو چند سال قبل انتقال کر گئے، نے اس کے بارے میں کوئی خبر حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن تمام محنت بے کار گئی۔ اگرچہ مسز داس کو دل کے کئی دورے پڑے ہیں لیکن لاپتہ بیٹے کی یادیں اور درد جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔

میں نے اپنے 16 سابق طالب علم کھوئے؛ ان میں صوبدار، واحد بخش، شاہ میر اور احمد مرغیانی، زمان خان اور احمد علی چھلگری، عرضو، شربت، مراد اور زمان شیرانی، محمد خان اور محمد نبی پیرداداني، فیض محمد، ناصر اور وزیر خان مزارانی، گلزار تنگیانی اور غلام قادر پیرکانی، ڈاکٹر اکبر پیرداداني سمیت کئی لاپتہ ہیں۔ ان کے ساتھ میرا تعلق بہت گہرا ہے؛ اور بہت سے اکثر مجھ سے یہ کہتے، ''استاد، تہ مئے ناروائے پت استئے'' (استاد، آپ ہمارے لیے والد کی طرح ہیں)۔ مریوں میں 'ناروائے پت' کا مطلب وہ جس سے آپ کا خون کا رشتہ نہ ہو مگر پھر بھی ایک والد۔ بہت سے کہتے، ''استاد، ماتھئی ناروائے بچّ استوں'' یعنی ہم آپ کے خونی نہ سہی مگر پھر بھی بیٹے ہیں۔

اللہ بخش بنگلزئی کا بیٹا حافظ سعید الرحمٰن 10 سال سے زائد عرصے سے لاپتہ ہے۔ اپنے بیٹے

کی تلاش کے دوران، جو اس دن سائیکل پر گھر سے نکلا تھا، انہوں نے مردہ خانوں کے چکر لگائے، قبر سے نکالی گئی ایک لاش دیکھی، اپنے بیٹے کی گمشدگی کے بارے میں مختلف باتیں سنیں، جن میں اس کا جیل میں ہونا، ایک بم دھماکے میں ہلاک ہونا شامل ہیں۔ سرکاری بیانات پر سازشی چکرداریوں کا غلبہ ہے جو مسلسل بدلتی رہتی ہیں۔ ان کے بیٹے کے لاپتہ ہونے کے دو ہفتے بعد ایم آئی کا ایک شخص آیا اور ان سے پوچھا کہ ان کے بیٹے کا جہادی تنظیموں کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ ایک مرتبہ اس کا نام بلوچستان ہائی کورٹ کی لسٹ پر جیل میں ہونے کے حوالے سے ظاہر کیا گیا تھا لیکن یہ بھی غلط ثابت ہوا۔ ایک مذہبی ذہنیت رکھنے والا بلوچ اتنے ہی خطرے میں ہے جتنا کہ ایک سیکولر بلوچ۔

سمی بلوچ بلوچستان یونیورسٹی میں ایم ایس سی کیمسٹری کی ایک طالبہ ہے، اس کے والد ڈاکٹر دین محمد خضدار کے علاقے اورناچ کے سرکاری ہسپتال میں ایک میڈیکل افسر تھے، انھیں 28 جون، 2009ء کو ان کے ہسپتال کی رہائش گاہ کے دروازے توڑنے کے بعد، انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اٹھایا۔ وہ بلوچ نیشنل موومنٹ (بی این ایم) کی مرکزی کمیٹی کے رکن تھے۔ ان کے بھائی سے ان کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی۔ سمی ایک گومگو کی حالت میں ہے، کیوں کہ اسے ہمیشہ جھوٹ بولنا پڑتا ہے، اس لیے کہ وہ نہیں چاہتی کہ اس کے اساتذہ کو یہ معلوم ہو کہ وہ کیوں کلاس میں موجود نہیں ہے، یا تو وہ کسی احتجاجی کیمپ میں ہے، یا کسی عدالت کی سماعت میں، یا پھر اس امید میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہی ہوتی ہے کہ کوئی صحافی اس کے والد کے بارے میں کچھ لکھے گا۔ اسے جھوٹ بولنا برا لگتا ہے۔ سمی اپنے والد کے انجام کی بابت فکرمند ہے اور پوچھتی ہے کہ وہ کیوں کر انہیں سالوں حراست میں رکھتے ہیں اور پھر وہ انہیں قتل کر دیتے ہیں۔ وہ کہتی ہے، ''اگر وہ میرے والد کو پھانسی دینا چاہتے ہیں، وہ اس کو عدالت میں لائیں، اس پر مقدمہ چلائیں اور ہم سب کے سامنے اسے پھانسی دیں۔ ہمیں کم از کم یہ جان کر اطمینان ہوگا کہ وہ اب نہیں رہے۔ لیکن اگر وہ اسے تین سال، چار سال تک زندہ رکھتے ہیں، اگر وہ ہر روز اس پر تشدد کرتے ہیں اور پھر اسے قتل کر کے اس کی لاش کو پھینک دیتے ہیں، آخر اس کا مقصد کیا ہے؟'' وہ

مزید کہتی ہے، ''ان لاشوں کو دیکھنے، ان کے بارے میں سننے، مزید لاشوں کے گرنے کے انتظار نے، ہمیں چلتی پھرتی لاشوں میں تبدیل کر دیا ہے، ہم خود کو ان پھینکی گئی لاشوں کی طرح محسوس کرتے ہیں۔''

سمی نے اپنی زندگی کے گذشتہ تین سال عدالتوں اور احتجاجی کیمپوں، میڈیا کو اپنے والد کا نام خبروں میں زندہ رکھنے پر قائل کرنے کی کوشش میں گزارے ہیں۔ وہ کہتی ہے، ''میں عدالت کی سماعتوں میں جاتی ہوں لیکن میرا دل اسے قبول نہیں کرتا، میں جانتی ہوں کہ ان عدالتوں سے مجھے انصاف ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' اس کے چھوٹے بھائی کو اسکول چھوڑ کر خاندان کی زمین پر کام کرنا پڑ رہا ہے تاکہ خاندان کی کفالت کر سکے۔

نصر اللہ بنگلزئی، کوئٹہ ڈگری کالج کا ایک سابق طالب علم، وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کا موجودہ چیئرپرسن، اپنے لاپتہ چچا علی اصغر بنگلزئی کی تلاش میں جٹا ہوا ہے جو کہ ایک درزی کی دکان چلاتا تھا، ایک سیاسی کارکن تھا اور خیر بخش مری کی سیاسی جماعت 'حق توار' کا ایک رکن تھا۔ اسے 2000ء میں اٹھایا گیا لیکن 14 دن کے بعد رہا کر دیا گیا۔ اس مدت کے دوران، اصغر کو ایک دیوار پر الٹا لٹکایا گیا اور اسے خیر بخش کے خلاف گواہی دینے کے لیے کہا گیا، اور ڈرایا گیا کہ ایسا نہ کرنے پر رسی کاٹ دی جائے گی، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ نصر اللہ کی لگاتار مہم اور کوئٹہ پریس کلب کے باہر اس کا مستقل احتجاجی کیمپ فوجی اسٹیبلشمنٹ کے لیے تھوڑی سی شرمندگی کا باعث بن رہے تھے، تو ایم آئی کے ایک کرنل ظفر نے ملاقات کے لیے اسے بلایا اور اس سے پوچھا، ''کیا آپ گورنر سے ملتے رہے ہو؟'' اس نے کہا کہ کم از کم سات مرتبہ۔ کرنل نے گفتگو جاری رکھی، ''اور آپ نے اسے مقامی آئی ایس آئی کے کمانڈر کو گورنر ہاؤس میں طلب کرنے کے لیے کہا؟'' اس نے ہاں میں جواب دیا۔ کرنل نے کہا کہ، ''وہ یہاں میرے سب سے زیادہ جونیئر کیپٹن تک کو طلب نہیں کر سکتا۔ وہ یہ بات جانتا ہے اور آپ کو بھی جاننا چاہیے۔'' نصر اللہ، جو ایک سیدھا جواب حاصل کرنا چاہتا تھا، اس نے کہا، ''ہو سکتا ہے کہ آپ لوگوں نے اسے مار ڈالا ہو اور اسے کسی ناقابلِ رسائی جگہ پر دفن کر دیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے اس کی قبر پر نہیں لے جا سکتے''، اور ''اگر

یہ بات ہے، تو قرآن لے آؤ، اس پر اپنا ہاتھ رکھو اور مجھے سچ بتا دو، اور میں آپ کی جان چھوڑ دوں گا۔'' کرنل ظفر پر نصر اللہ کی اس جذباتی التجا نے کوئی اثر نہیں ڈالا اور اس نے کہا کہ ''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم ایک مشین ہیں۔ ہم جذبات سے عاری ایک مشین ہیں۔''

دوسری بار جب اصغر بنگلزئی کو گرفتار کیا گیا وہ اپنے دوست اقبال کے ہمراہ تھا۔ اقبال کو بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا لیکن 24 دنوں کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ 2003ء میں نصر اللہ کا خاندان کوئٹہ کے کور کمانڈر، جو کہ خفیف تبدیلی کے لیے ایک بلوچ تھا، عبدالقادر زہری، اور بعد میں وہ گورنر بھی بنا، کے ساتھ ایک ملاقات طے کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن یہ بھی برآور ثابت نہیں ہوئی۔ انہوں نے جے یو آئی (ف) کے مرکزی رہنما حافظ حسین احمد کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی اور کوئٹہ میں آئی ایس آئی کے سربراہ بریگیڈیئر صدیق سے ملاقات کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ان کی حراست میں ہے، اور ایک سال تک وہ اس سے اکثر ملتے رہے لیکن یہ بھی ثمر آور نہ ہو سکا۔ انہوں نے اسلام آباد میں جنرل ذکی سے ملاقات کی؛ مدد کا وعدہ تو کیا گیا لیکن کوئی مدد نہیں آئی۔ ان سب سے امید کھونے کے بعد، نصر اللہ نے ایک بار پھر گورنر اویس غنی سے ملاقات کی لیکن وہ دنگ رہ گیا جب غنی نے اس سے کہا، ''اگر آپ اپنے مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں تو میں آپ کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتا۔'' نصر اللہ نے تلخی سے کہا، ''میں ایک عام شہری ہوں۔ آپ گورنر ہیں۔ ہم آپ کے گورنر ہاؤس میں بیٹھے ہیں اور آپ مجھے میرے تحفظ کے بارے میں دھمکی دے رہے ہیں۔'' سب اسے احتجاجی کیمپ ہٹانے اور ان کی مہم کا خاتمہ چاہتے تھے، گویا یہ انہیں اور ملک کو 'بدنام' کر رہے ہوں۔ وزارت داخلہ کی طرف سے ایک اعلیٰ عہدے دار جہاز کے ذریعے کوئٹہ پہنچے اور ان سے ملا۔ ''انہوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہم احتجاجی کیمپ ختم کر دیتے ہیں، تو وہ اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ علی اصغر کو دو ہفتے کے اندر اندر رہا کیا جائے گا۔'' نصر اللہ نے دوسرے خاندانوں سے مشورہ کیا اور احتجاجی کیمپ عارضی طور پر بند کر دیا گیا۔ مہینے گزر گئے، کچھ نہیں ہوا، چونکہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ایک ایف آئی آر درج کروانے کے لیے نو سال لگ گئے، اور سپریم کورٹ اور حکومت بلوچ کے لیے اپنی کوششوں کی تعریف کرتے

نہیں تھکتے۔

جب علی اصغر لاپتہ ہوا، اس کا سب سے بڑا بیٹا 12 سال کا تھا اور سب سے کم عمر بیٹی صرف چھ ماہ کی تھی۔ سب سے بڑے بیٹے کی چند سال قبل شادی ہو گئی۔ اپنے چچا کی تلاش میں 11 سال گزارنے کے بعد، نصر اللہ اپنی دماغی حالت کو بلا جھجک بیان کرتا ہے۔ ''پورا خاندان نفسیاتی مسائل سے دوچار ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم سب ذہنی طور پر بیمار ہیں۔'' اپنی غیر موجودگی میں علی اصغر ایک دادا بن چکا ہے۔ اس کا پوتا بھی اسے چاچا بلاتا ہے کیونکہ نصر اللہ اس کا حوالہ چاچا کے طور پر دیتا ہے۔

گمشدگیاں بلوچ معاشرے کے تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ہیں اور ان میں پروفیسروں جیسے دانش ور شامل ہیں؛ لالہ حمید بلوچ اور الیاس نذر جیسے صحافی؛ ڈاکٹر دین محمد اور اکبر مری جیسے ڈاکٹر؛ زمان خان مری اور علی شیر کرد جیسے وکلا، اور ذاکر مجید اور سنگت ثنا جیسے سرگرم کارکن۔ بلوچ کے ساتھ پاکستانی ریاست کا سلوک کینہ پرور اور سفاکانہ ہے اور فرنٹیئر کور کے اہلکاروں کی وردیاں پہن کر جرائم کا ارتکاب کرنے جیسے کمزور بہانے پیش کر کے وہ اپنی ذمہ داریوں سے انحراف جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس طرح کے بہانے محض ان کی ایک ریاست کو چلانے کے قابل نہ ہونے کو ظاہر کرتے ہیں۔ بظاہر لگتا ہے کہ لاپتہ افراد کی داستان جاری رہے گی اور اس میں شدت آئے گی جیسا کہ بلوچ ان مظالم اور اپنے حقوق کے انحراف سے تنگ آ چکے ہیں، وہ زیادہ فعال طور پر اور کھلے عام ریاست کے خلاف بول رہے ہیں اور آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، پیر، 18 فروری، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/default.asp?page=2013%5C02%5C18%5Cstory_18-2-2013_pg3_2

’آپ بہار کو آنے سے نہیں روک سکتے!‘

چنیدہ اور موزوں مالیخولیا ’اسٹیبلشمنٹ‘ کی نفسیات میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں، ہمیں بلوچستان میں موجود بے چینی اور مصائب کی بابت مضحکہ خیز حیلے اور توضیحات ملتی رہتی ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ کے ترجمان اس کا دفاع منطقی امر مسلمہ کے ساتھ کرتے ہیں جو کہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کافی پرکشش ہوتی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیں کہ بلوچستان کی موجودہ صورت حال گذشتہ 64 سالوں کے مظالم اور استحصال کی پیداوار ہے اور وہ اس بات پر یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ مذموم عزائم رکھنے والی چند بین الاقوامی طاقتوں کی سازشوں کی پیدا کردہ ہے۔

چند روز قبل سینیٹ کی کارروائی میں ہزارہ قتل عام کے حوالے سے سینیٹر رضا ربانی نے بلوچستان میں دہشت گردی کی حالیہ لہر کو گوادر پورٹ کو چین کے حوالے کرنے سے منسلک کیا اور کہا، ’’ہم سب جانتے ہیں کہ گوادر کتنا اہم ہے، خاص طور پر جب بات بین الاقوامی سیاست کی ہو۔‘‘ شاید، وہ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ یہ باور کرلیں کہ چین کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے امریکہ اور بھارت وہاں مسائل پیدا کر رہے ہیں۔ برطانوی ہائی کمشنر ایڈم تھامسن کے گزشتہ ماہ کے بیان؛ ’’پاکستان کو انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی وفاقی اور صوبائی حکومتیں لوگوں کے مسائل حل نہیں کر رہی ہیں‘‘، نے بھی انہیں بری طرح پریشان کیا۔ انہوں نے سوال اٹھایا، ’’آخر وہ ہوتے کون ہیں کہ اس طرح کا بیان دیں؟‘‘ جناب، وہ اس طرح کا بیان اس لیے دیتے ہیں کیونکہ وہ آپ کے پورے وجود کے قیام کی مالی اعانت کر رہے ہیں۔

یاد رہے کہ بلوچستان پر سینیٹر کا یہ مؤقف کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انہیں اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ برائے جبری و غیر رضا کارانہ گمشدگی (ڈبلیو جی ای آئی ڈی) کے گذشتہ سال ستمبر کا دورہ

بھی سخت ناگوار گزرا تھا۔ ان کی زیر صدارت، قومی سلامتی پر پارلیمانی کمیٹی (پی سی این ایس) میں فیصلہ کیا گیا کہ مستقبل میں اقوام متحدہ کے کسی گروپ کو پاکستان میں ’’حساس معاملات‘‘ پر بات کرنے کے لیے دورہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ انہوں نے فوجی حکام کے ساتھ ملاقات کرنے کی خواہش پر اقوام متحدہ کے گروپ پر سخت تنقید کی اور خوشی کا اظہار کیا کہ فوجی قیادت کی طرف سے اقوام متحدہ کے ٹیم کی کوئی خاطر مدارت نہیں کی گئی۔ پی سی این ایس نے ڈبلیو جی ای آئی ڈی کے دورے کے حوالے سے اسے مطمئن کرنے میں ناکامی پر خارجہ اور داخلہ کی وزارتوں کی سخت کھچائی کی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پی سی این ایس کی لاپتہ افراد پر 15 سفارشات ابھی تک عالم برزخ میں ہیں۔ وہ خود تو لاپتہ افراد کے لیے کچھ کرتے نہیں مگر پھر بھی لاپتہ افراد کے بارے میں بین الاقوامی اداروں کی جائز تشویش انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ مزید برآں یہ کہ جب ریاستیں لوگوں کے خلاف ’غلیظ جنگوں‘ کی قیادت کریں تو ہر ایک کو مداخلت کا حق حاصل ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عمان ٹربیون میں 27 ستمبر، 2012ء کو ذرائع کے حوالے سے ایک خبر چھپی جس میں عندیہ دیا گیا تھا کہ سینیٹر رضا ربانی کانگراں وزیر اعظم کے لیے انتخاب کا امکان ہے۔ نگران وزیر اعظم بننے کے لیے آپ کو صحیح طرح کی صوتی سرسراہٹ کرنا پڑے گی۔

میں اصل موضوع سے ہٹ رہا ہوں۔ چلیں پھر سے گوادر اور بین الاقوامی سازشوں کی طرف لوٹتے ہیں۔ گوادر مارچ 1948ء کو اس وقت عمان کو لیز پر تھا جب جناح کی قیادت میں پاکستان نے تمام معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جبری الحاق کے ذریعے بلوچ کی آزادی کو ہڑپنے کا فیصلہ کیا۔ تب کوئی سازش نہیں تھی، ماسوائے پاکستانی ریاست کی بلوچستان پر قبضہ کرنے اور بلوچ کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کی سازش کے، اور یہ سازش ابھی تک پھل پھول رہی ہے۔ حقیقی اور بنیادی سازش 1948ء سے لے کر بلوچ اور 1999ء کے بعد سے ہزارہ کے خلاف ریاستی سرپرستی میں کی جانی والی دہشت گردی کے اصل مسئلے کو دھندلانا ہے۔ سرکاری بیانیہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ جو کچھ بلوچستان میں ہوتا ہے وہ ’غیر ملکی ہاتھ‘ کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ہے۔ جو بات وہ آسانی سے بھول جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ بلوچ کی تاریخ ہے کہ انہوں نے

ہمیشہ ان لوگوں کے خلاف مزاحمت کی ہے جنہوں نے انہیں سرنگوں کرنے کی کوشش کی ہے۔ غیر ملکی ہاتھ کے بارے میں الزامات کا مقصد اپنے اُن 'اسٹریٹجک اثاثوں' کے خلاف تنقید کا رخ موڑنا ہے جو افغانستان میں امریکہ اور کشمیر میں بھارت کے خلاف کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہے، اور انہوں نے اپنا قہر یہاں کے غیر مسلح اور بے گناہ لوگوں پر برپا کیا ہوا ہے۔

ہزارہ قتلِ عام، بشمول اس سال ہوئے دو حملوں کے، کی ذمہ داری لشکر جھنگوی کی طرف سے قبول کی گئی تھی۔ تو پھر رضا ربانی کے بیان کا مطلب یہی ہوگا کہ وہ چین کے دشمنوں کے لیے کام کر رہے ہیں؛ یہ اتنی ہی بعید از قیاس اور انتہائی احمقانہ بات ہے جتنی کہ یہ ہوسکتی ہے۔ ان الزامات کا اصل مقصد بلوچ قوم پرستوں کو بدنام کرنا ہے تاکہ حکومت اور میڈیا عوام کو فوج اور فرنٹیئر کور (ایف سی) کی طرف سے بلوچ کے خلاف ڈھائے جانیوالے مظالم کے لیے جواز فراہم کرسکیں۔ جنوری میں گورنر راج کے نفاذ کے بعد، بلوچ کے خلاف کارروائیاں تیز کردی گئیں، جبکہ لشکر جھنگوی کی طرف آنکھیں بند کرلی گئیں، جس کا نتیجہ 16 فروری کے قتلِ عام کی صورت میں نکلا۔

میڈیا اظہارِ خیال کو کنٹرول کرتا ہے اور اس امر کو یقینی بناتا ہے کہ بلوچ کو بدترین رنگوں میں رنگا جائے، یہ اس برتاؤ کے بالکل برعکس جو تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) یا دوسرے بنیاد پرستوں سے برتا جاتا ہے۔ تحریک طالبان پاکستان کے ترجمان احسان اللہ احسان کا انٹرویو لیا جاتا مگر بلوچ رہنماؤں پر پابندی عائد ہے۔ سپریم کورٹ میڈیا میں بلوچ کی آرا کا نوٹس ریاست کی سالمیت کو خطرے کے طور پر لیتا ہے لیکن ٹی ٹی پی کو حلال اور جائز سمجھتا ہے۔ یہ کسی تعجب کی بات نہیں جیسا کہ میلکم ایکس نے کہا، ''اگر آپ محتاط نہیں ہیں تو اخبارات آپ کو ان لوگوں سے متنفر کردیں گے کہ جن پر ظلم ہو رہا ہو، اور ان لوگوں کے لیے محبت پیدا کریں گے جو ظلم کر رہے ہوں۔'' یہاں مظلوم سے آخرش نفرت کی جاتی ہے اور ظالم کی تعریف۔

لوگ اکثر ایسے تکلیف دہ سوال پوچھتے ہیں جو کہ لاپتہ ڈاکٹر دین محمد بلوچ کی بیٹی سمی بلوچ نے محمد حنیف سے پوچھا: ''اگر وہ میرے والد کو پھانسی دینا چاہتے ہیں، انہیں عدالت میں لائیں، ان پر مقدمہ چلائیں اور ہم سب کے سامنے انہیں پھانسی دیں۔ ہمیں کم از کم یہ جان کر اطمینان ہوگا

کہ وہ اب نہیں رہے۔ لیکن اگر وہ انہیں تین سال، چار سال کے لیے زندہ رکھتے ہیں، اور اگر وہ ان پر ہر روز تشدد کرتے ہیں اور پھر انہیں قتل کرکے ان کی لاش کو پھینک دیتے ہیں، تو اس سب کا مطلب کیا ہے؟'' اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایسا ان لوگوں کو جسمانی اور نفسیاتی طور پر خوفزدہ کرنے کے لیے کرتے ہیں جو اپنے حقوق چاہتے ہیں اور ریاست کی طاقت کو نہیں مانتے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ 1974ء کے بعد سے ہزاروں بلوچ لاپتہ ہوئے ہیں اور اب بھی ہو رہے ہیں، جب کہ ان میں سے 700 سے زائد کی تشدد زدہ لاشیں پورے بلوچستان میں پھینکی گئی ہیں۔ تاہم، یہ سفاکیت بلوچ کو خوف زدہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے جو جبر اور استحصال کے خلاف اپنی مزاحمت جاری رکھے ہوئے ہیں، کیوں کہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ ان کا اپنے حقوق، زمین اور وسائل سے دست برداری ان کی زندگی کو بے معنی اور بے وقعت بنا دے گی۔ لہٰذا، وہ مزاحمت اور جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کے لیے حتمی قیمت ان کی زندگی نہیں ہے بلکہ ان کی زمین، تاریخ اور ثقافت ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے بغیر وہ اپنے بندھن اور طرزِ زندگی سے محروم ہوجائیں گے اور یہ انہیں بغیر کسی شناخت اور بلا مقصد زندگی کی طرف دھکیل دے گی؛ جدوجہد ان کی شناخت کو محفوظ اور مضبوط کرتی ہے۔ ریاست کو ان کا پیغام یہ ہے کہ وہ ثابت قدم رہیں گے اور غالب ہوں گے۔ ان کے لیے پابلو نیرودا کا واضح بالذات اور تیکھا قول: ''تم سارے پھول کاٹ سکتے ہو لیکن تم بہار کو آنے سے نہیں روک سکتے''، محرک مقولہ بن چکا ہے۔ یہی بات ہے کہ جس پر وہ یقین رکھتے ہیں اور وہ اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے، خواہ کچھ بھی کہا جائے یا کیا جائے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 24 فروری، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/default.asp

page=2013\02\24\story_24-2-2013_pg3_2

’’سیاہ مزاح‘‘: سیاستدانوں کے وعدے

میں اس بات کا قائل ہوں کہ اگر وعدے بم ہوتے تو یہاں ایک بھی زی روح زندہ نہ بچتا۔ وعدے سستے داموں ملتے ہیں اور یہ لوگوں کو ان چیزوں کی بابت باور کرانے کیلئے بہ آسانی دستیاب ہتھیار ہے جنہیں عام صورت میں لوگ ردی سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔ یہاں پر حتیٰ کہ بلوچ لاپتہ افراد کی بازیابی کیلئے عدالتوں کے وعدوں، مشرف پر غداری کا مقدمہ چلانے، پانی پر گاڑیاں چلانے اور اچھے طالبان کی کسی صورت حمایت نہ کرنے کے پختہ مگر خالی خولی وعدوں پر بھی مکمل طور پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ لوگ سادہ لوح اور وعدہ ساز پُر فریب طور پر چالاک ہیں جو لوگوں کی انتہائی حد تک مختصر یادداشت کی بیماری پر انحصار کرتے ہیں جس میں یہاں کے لوگ مبتلا ہیں اور وہ ہمیشہ نبھائے نہ گئے وعدوں سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا تعلق اُس خود ساختہ مقدر پرستی سے ہے جو اس خطے کے لوگوں کی نفسیات کا حصہ ہے اور اس کا زیادہ تعلق مذہب اور طویل نوآبادیاتی نظام کے اثرات سے ہے جس میں تعلیم اور میڈیا کے ذریعے ’ریاستی بیانیے‘ کے غالب اثر و رسوخ کا تذکرہ اگر خارج ہو؛ ایک ایسا بیانیہ جس نے بنیاد پرستی کی شیطانیت، جمود اور بلا چون و چرا سرخم تسلیم کرنے کو فروغ دیا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کی ہے جو یہاں پھلی پھولی ہے۔

معادیات بھی اس جمود اور غیر ضروری تحمل کی روش کا ذمہ دار ہے۔ مذاہب اپنی اصل روح میں کبھی بھی ایک سی نہیں رہتیں کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ اشرافیہ کے ذاتی مفادات اور بیانیہ ان کی ضروریات کے مطابق انہیں ڈھال دیتی ہیں نہ کہ اس کے برعکس کسی اور طرح سے۔ اسی لئے مارکس نے کہا تھا کہ ’مذہب عوامی افیون ہے۔‘ بر سبیل تذکرہ مارکس کا یہ قول اس تناظر میں ہے کہ،

’’مذہب مظلوم مخلوق کی آہِ سرد ہے، ایک سنگدل دنیا کا دل ہے، بالکل اسی طرح سے جیسے یہ کسی روح سے عاری صورتحال کی روح ہو۔ یہ عوام کی افیون ہے۔‘‘ بلوچ معاشرے کی سیکولر اقدار پاکستان کیلئے ایک پھٹکار ہے جو جدوجہد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور یہ اس کے بیانیے کے برخلاف ہے۔ لہٰذا اس بات میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ بلوچستان میں تعلیم کا سب سے بڑا وکالت کرنے والا اور فراہم کنندہ فوج ہے؛ خاموشی سے سرخم تسلیم کرنے کو یقینی بنانے کیلئے بلوچ معاشرے کی موجودہ اقدار کو تبدیل کرنے کی انتھک کوشش کی جا رہی ہے۔

آواران کے حالیہ دورے کے دوران نواز شریف نے آواران کی معجزاتی بحالی کا وعدہ کیا تھا؛ وہ اس حوالے سے سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ بالاکوٹ زلزلے کو آٹھ سال بیت چکے ہیں اور وہاں بحالی کا کام ابھی تک نصف بھی مکمل نہیں کیا گیا ہے۔ 2012ء میں اس تباہ کن زلزلے کی ساتویں برسی پر ایک اخبار نے رپورٹ کیا کہ مقامی لوگوں نے بالاکوٹ اور اسلام آباد میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے احتجاج کرنے کا اعلان کیا ہے، دنیا کو یہ یاد دلانے کیلئے کہ حتیٰ کہ سات برس بعد بھی وہ بحالی کیلئے در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

پرانے شہر سے 20 کلومیٹر جنوب میں بکریال کے مقام پر ایک نیو بالاکوٹ تعمیر کیا جانا تھا لیکن یہ منصوبہ بھی رک گیا۔ وہاں کے مقامی زمین مالکان کو ادائیگی کے مطالبے کے باعث ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ 2012ء تک وہاں پر 60 فیصد سے زائد اسکولوں اور ہسپتالوں سمیت سرکاری عمارتوں کی تعمیر کا کام مکمل نہیں کیا گیا تھا۔ پرانے بالاکوٹ شہر کے بہت سے رہائشی اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (یو این ڈی پی) کی جانب سے عطیہ کردہ تیار مصنوعی گھروں میں رہ رہے ہیں۔ اس کی وجہ پیچیدہ ڈیزائن، تعمیری مواد کیلئے کثیر لاگت اور ایرا (ارتھ کویک ریکنسٹرکشن اینڈ ری ہیبلیٹیشن اتھارٹی) کی تکنیکی طور پر ناقص تعمیراتی منصوبہ بندی تھی۔ اگر بالاکوٹ کے عوام کا حال یہ ہے جن کیلئے انہیں دنیا سے کروڑوں ڈالر ملے ہیں تو آواران کے عوام کے مقدر میں کیا آئے گا؟

چونکہ نواز شریف کے پاس پیش کرنے کیلئے اور کچھ بھی نہیں تھا تو لہٰذا وہ آواران کے نام نہاد

بزرگوں سے وعدوں کا سہارا لے کر وہاں سے چلتے بنے؛ قدرتی طور پر عوام پر تو اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ ان کے قریب پھٹک سکیں۔ بزرگوں کا یہ فرض کردہ غول، کہ جنہیں مدد کی یقین دہانی کرائی گئی تھی، ایک انوکھی شے ہے کیونکہ زلزلے سے قبل وہاں پر اس کا کوئی وجود نہ تھا؛ ضرور فوج نے اسے تخلیق کیا ہوگا کیونکہ امدادی کاموں میں مدد کے بہانے وہ پوری طاقت کیساتھ وہاں وارد ہوئی تھی۔ ان بزرگوں میں سے ایک ضرور بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر قدوس بزنجو رہے ہونگے، جی ہاں وہی جنہوں نے اپنی نشست پی بی 41 آواران 544 ووٹوں کے ساتھ جیتی لیکن دی گئی خدمات کے عوض ڈپٹی اسپیکر شپ سے نوازے گئے۔ دست چنیدہ وزیر اعلیٰ سمیت باقی ماندہ بزرگ بھی شکر گزار ان سے زیادہ کچھ نہ تھے جو اس بات کو یقینی بنانے کیلئے ہر لفظ پر سر ہلاتے رہے کہ انعام و اکرام کی برسات جاری رہے۔ یہ بزرگان، سب کے سب بھوسے کے پتلے، اسٹابلشمنٹ کی حمایت کے بغیر صفر کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہیں اور اس عوام سے ڈرتے ہیں جن کے بزرگ ہونے کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔ بین الاقوامی امداد کو مسترد کرنے کے حوالے سے نواز شریف نے کہا کہ ان کی حکومت نے بحالی کیلئے غیر ملکی امداد سے انکار کر دیا ہے کیونکہ ''ہمیں باہر سے مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ بلوچستان حکومت میری ہے۔ یہ ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے۔'' نواز شریف کو لوگوں کے مصائب کی ذرّہ بھر پرواہ نہیں ہے بلکہ فقط اپنی انا کی تسکین کیلئے انہوں نے دہرایا کہ ''بلوچستان حکومت میری ہے۔''

نواز شریف موج عہد و کناں میں بہتے گئے اور مرنے والوں کے اہل خانہ کیلئے 5 لاکھ اور زلزلے کے زخمیوں کو 1.5 لاکھ روپے معاوضہ دینے کا اعلان کیا۔ انہوں نے ضرور خود کو بھی حیران کر دیا ہوگا جب انہوں نے کہا، ''حکومت آواران کو شمسی توانائی کے ساتھ 24 گھنٹے بلا تعطل بجلی کی فراہمی کو یقینی بنائے گی اور پانی کی ضروریات پوری کرنے اور علاقے کو سیراب کرنے کیلئے ڈیموں کی تعمیر کرے گی۔ میری حکومت آواران کو کراچی، اسلام آباد اور لاہور کے برابر ایک 'ماڈل ضلع' بنائے گی۔'' ایک اسٹابلشمنٹ جو شہروں کو بجلی، جنکی لازمہء حیات بجلی ہے، فراہم کرنے کے

قابل نہیں رہی ہو، اس کا آواران کیلئے سات دن رات دن بلا تعطل بجلی کی فراہمی کیساتھ ایک جنت کا وعدہ حیرت انگیز نہیں ہے؟ آواران کو کراچی کے برابر لانے کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ روزانہ ایک درجن افراد قتل کر کے اسے کراچی کی مقتل گاہوں کے قریب لانا ہے۔ ایک اسٹابلشمنٹ جو کئی دہائیوں سے بلوچ پر ظلم ڈھا رہی ہے اور ان کا استحصال کرتی آ رہی ہے اچانک سے ایک محسن بن جاتا ہے اور ایک مجازی جنت کا وعدہ کرتا ہے۔ اگر یہ سیاہ مزاح نہیں تو اور کیا ہے؟

میرا خیال ہے کہ نواز شریف کے دورے اور اُنکے وعدوں کی شہنائی کی گونج میں جس بات کی طرف لوگوں نے دھیان نہیں دیا وہ ان کے بندے ڈاکٹر مالک نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہی۔ انہوں نے کہا کہ ''میں آواران کے عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ یہ ضلع چھوڑ کر نہ جائیں جہاں ان کے باپ دادا دفن ہیں۔ حکومت ملازمتیں اور دیگر سہولیات فراہم کرے گی۔'' یہ بات صرف اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے کہ لوگ فوج کی موجودگی میں اضافے کے سبب علاقہ چھوڑ رہے ہیں اور پاکستانی حکومت پر اعتماد کے مکمل فقدان کے باعث کل چھ بٹالین اور آٹھ ہیلی کاپٹر ظاہراً امداد اور بحالی کیلئے تعینات کیے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ماڈل ٹاؤن کا کوئی منصوبہ نہیں ہے؛ فوج علاقے کو کنٹرول کرنے کیلئے ایک چھاؤنی کی تعمیر کی تیاری کر رہی ہے۔ ایک چھاؤنی فقط ایک چھاؤنی ہے خواہ کیوں نہ اس کا لیبل بھی تبدیل کر دیا جائے۔ لوگ ان کے ارادوں اور متوقع سلوک سے مکمل طور پر آگاہ ہیں اور اسی لئے اس سے دور جا رہے ہیں۔ وہ ایک چھاؤنی میں نہیں رہنا چاہتے جو کہ حکومت آواران کو بنانا چاہتی ہے۔ آواران میں فوج اور فرنٹیئر کور (ایف سی) کی خواہشات کے تابع غلاموں کی طرح رہنے کے بجائے وہ دیگر جگہوں میں غربت کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بشکریہ: نیکڈ پنچ ڈاٹ کام، 14 نومبر 2013

http://www.nakedpunch.com/articles/187

کوئی قیدی نہیں رکھنا:

پختونخواہ اور بلوچستان میں ماورائے عدالت قتل

چند دن قبل ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان (ایچ آر سی پی) کے ڈائریکٹر آئی اے رحمان صاحب نے اپنے مضمون ''قیدیوں کے حقوق'' (14 نومبر، روزنامہ ڈان) میں قیدیوں کو لاحق خطرات پر حال ہی میں فیڈرل جوڈیشل اکیڈمی میں منعقد سیمینار کے بارے میں لکھا تھا جس میں یہاں کی عدلیہ کے درخشاں ستاروں نے شرکت کی تھی۔ قیدیوں کو درپیش دیگر مسائل کے علاوہ پنجاب اور سندھ کی جیلوں میں گنجائش سے زیادہ بھیڑ نے خصوصی توجہ حاصل کی، کیونکہ پنجاب کی جیلوں میں قیدیوں کی گنجائش 21,527 ہے جن میں 52,318 قیدی رکھے گئے ہیں جبکہ سندھ میں 11,939 کی گنجائش کے برخلاف 14,119 قیدی موجود ہیں؛ اسے قطعاً ناقابل برداشت قرار دیا گیا۔

جیل کی گنجائش سے زیادہ بھیڑ ایک عالمی مسئلہ ہے جو اکثر فسادات کا موجب بنتی ہے جس میں قیدیوں کو بلا کسر تکالیف جھیلنی پڑتی ہیں۔ امریکہ میں اس وقت کم از کم سات ریاستوں کی جیلیں اپنی زیادہ سے زیادہ گنجائش سے 25 فیصد اوپر ہیں جس میں 196 فیصد کیساتھ الباما سرفہرست ہے، اس کے بعد 144 فیصد کیساتھ الینوئے ہے۔ 'اکانومسٹ' کی 2012ء کے ایک سروے کے مطابق؛ ہیٹی میں جیلوں کی گنجائش سے زائد بھیڑ تقریباً 350 فیصد، وینزویلا میں تقریباً 275 فیصد، ایران قریب 200 فیصد اور پاکستان 175 فیصد ہے۔ یہاں تک کہ برطانوی جیلوں میں بھی گنجائش سے زیادہ بھیڑ ہے۔

جیلوں کی گنجائش سے زیادہ بھیڑ قیدیوں کیلئے زبردست مسائل پیدا کرتی ہے جو یقینی طور پر

بہتر حالات کے مستحق ہیں تاہم اصل ذمہ داری ریاست پر عائد ہوتی ہے جو اپنے شاہی قیدیوں یعنی صدر اور وزیراعظم پر روزانہ لاکھوں خرچ کرتی ہے جو یقیناً قیدی ہیں کیونکہ وہ بمشکل ہی کوئی جوکھم لے کر باہر نکلتے ہوں اور حتیٰ کہ دور دراز کی اسکیموں کا افتتاح بھی وہ اپنی متعلقہ رہائش گاہوں سے کرتے ہیں، مگر ریاست عام قیدیوں کی حالت میں بہتری لانے سے انکاری ہے۔

اتفاق سے صرف 2012ء میں ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس کیلئے اخراجات روزانہ بالترتیب 1.68 ملین روپے اور 1.92 ملین روپے تھے۔ رحمان صاحب بجا طور پر کہتے ہیں کہ ''پاکستان کی جیلیں اپنے ظالمانہ قوانین، بے جا کرپشن، امیر اور غریب کے درمیان امتیاز، اور بے لگام تشدد کے حربوں کیساتھ ملک کی مجموعی صورتحال کی محض ایک چھوٹی سی تصویر پیش کرتے ہیں۔ جیلروں اور قیدیوں کے درمیان کوئی معقول رابطہ نہیں ہے بالکل اسی طرح سے جیسے کہ حکمرانوں اور شہریوں کے درمیان کوئی بامعنی گفتگو نہیں ہوتی۔''

قیدیوں کی حالت زار غیر مشروط ہمدردی کا مستحق ہے؛ تاہم یہ بھیڑ کا مسئلہ نہ تھا جس نے میرا ہوش اڑا کر رکھ دیا۔ پختونخواہ اور بلوچستان کی جیلوں میں قیدیوں کے اعداد و شمار نے بلاشبہ مجھے حیران کر دیا۔ رحمان صاحب نے لکھا ہے کہ ''خیبر پختونخواہ (کے پی کے) میں قیدیوں کی تعداد (8,113) اپنی گنجائش (7,996) کے مقابلے میں معمولی سی زیادہ تھی اور بلوچستان میں جیل کی آبادی (2,483) اور گنجائش (2,473) کے درمیان فرق بھی کم تھا، صرف 10 کا فرق۔'' کیا یہ اعداد و شمار حیرت انگیز نہیں ہیں اس حقیقت کے باوجود کہ بلوچستان میں ایک طویل سیاسی بغاوت چل رہی ہے اور خیبر پختونخوا کے بعض علاقوں میں جنگ کی حالت ہے؟

بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں جیل کی کم آبادی پر سیمینار میں سوالات اٹھائے جانے چاہیے تھے مگر گو کہ بظاہر اسے معمول کی سی چیز تصور کیا جاتا ہے، لہٰذا یقینی طور پر یہ ایک بڑی نحوست کی طرف اشارہ ہے جو کہ ان دونوں صوبوں پر چھائی ہوئی ہے۔ پوری توجہ جیل میں بند قیدیوں کی جانب وقف کی گئی لیکن افسوس کی بات ہے کہ 'لاپتہ قیدیوں' کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا؛ لاپتہ

قیدیوں کا اتنا بڑا ہاتھی سیمینار کے بغلی راستوں پر چلتا رہا لیکن اس پر ذرہ بھر بھی دھیان نہیں دیا گیا۔ یہ بات واقعتاً حیران کن بھی ہے اور خوفناک بھی کہ وہ لوگ جو عوام اور قوانین کی مقدر کا فیصلہ کرتے ہیں، جنہوں نے اس سیمینار کو آراستہ کیا ہوا تھا، لیکن ان لوگوں میں مختلف علاقوں میں جیل کی آبادی میں فرق اور اس کے اثرات کو دیکھنے کا احساس نہ تھا۔ اعداد و شمار زور زور سے چلّا کر بولتے ہیں لیکن انہیں سننے کے قابل ہونے کیلئے خواندگی سے زیادہ کسی اور شے کی ضرورت ہے۔

ان درخشاں ستاروں نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا کہ پختونخواہ اور بلوچستان کی جیلوں میں کوئی بھیڑ نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہاں ایک منظّم 'غلیظ جنگ' جو ''جان کی امان نہ دینا، کوئی رحم نہیں دکھانا، کوئی قیدی نہیں رکھنا'' کے نصب العین کیساتھ جاری ہے۔ وہ کہ جنہیں جیلوں میں رکھا جا سکتا ہو انہیں ماورائے عدالت قتل کر دیا جاتا ہے، اس طرح سے پختونخوا اور بلوچستان کی جیلوں کو قیدیوں کی گنجائش کی سطح پر رکھا جاتا ہے۔ ہزاروں لاپتہ بلوچوں اور 700 سے زائد قتل کر کے بلوچستان اور کراچی کے مختلف علاقوں میں پھینکے گئے بلوچوں نے بلوچستان کی جیلوں کو بھیڑ سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

اسی طرح کے طرز عمل نے خیبر پختونخواہ کی جیلوں میں بھی قیدیوں کی آبادی کو قابل انتظام سطح پر رکھا ہوا ہے۔ بلوچستان کی طرح خیبر پختونخوا میں بھی ماورائے عدالت قتل کا سلسلہ ایک طویل عرصے سے چلا آرہا ہے۔ خیبر پختونخوا میں صورتحال یقیناً انتہائی خراب ہے۔ مئی 2011ء میں خیبر پختونخوا کے بارے میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ماورائے عدالت قتل، صوابدیدی گرفتاریاں اور حراست، اور سیکورٹی ایجنسیوں کے ہاتھوں جبری گمشدگیاں جاری رہی ہیں جبکہ فوج کی معاونت سے چلنے والے لشکروں (مسلح گروہوں) نے بھی کسی بھی طرح کی نگرانی یا جانچ پڑتال کے بغیر سینکڑوں شہریوں کو ہلاک کیا ہے۔ ایچ آر سی پی کے اعداد و شمار کا حوالہ دیتے ہوئے، ایمنسٹی انٹرنیشنل نے کہا کہ جولائی 2009ء اور مئی 2011ء میں فوجی آپریشن کے اختتام کے درمیان وادی سوات میں مشتبہ باغیوں کی 282 لاشیں ملی ہیں۔ اس میں

کہا گیا ہے کہ علاقے کے مقامی لوگوں کی طرف سے ان ہلاکتوں کو سیکورٹی فورسز سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کہا کہ مشتبہ باغیوں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں افراد، بچوں سمیت، کو سوات میں تلاشی اور فوجی کارروائیوں کے بعد فوجی حراست میں رکھا جانا جاری ہے۔

اس سال 16 جنوری کو قبائلی علاقہ خیبر ایجنسی سے تعلق رکھنے والے قبائلیوں نے ایک رات قبل قبائلی علاقے کے باڑہ تحصیل میں مردہ حالت میں پائے گئے 15 رشتہ داروں کے جنازے لے کے پشاور میں گورنر ہاؤس کے سامنے احتجاجی دھرنا دیا۔ انہوں نے ہلاکتوں کیلئے سیکورٹی فورسز پر الزام عائد کیا اور گورنر اور حکام سے مطالبہ کیا کہ انہیں انصاف فراہم کیا جائے۔ اس سال جولائی میں ایک بار پھر کم سے کم 21 مشتبہ عسکریت پسندوں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں خیبر ایجنسی کے شورش زدہ علاقے باڑہ ڈویژن کے خانگئی علاقے میں پائی گئیں۔ ان اموات کے بعد علاقے میں عسکریت پسندوں کے مضبوط ٹھکانوں کے خلاف سیکورٹی فورسز کی ایک کارروائی عمل میں لائی گئی۔

مزید برآں بلوچستان میں شورش کے علاوہ ہزارہ اور دیگر شیعوں کو بھی ہدف بنایا جاتا ہے جبکہ خیبر پختونخوا میں بھی شیعوں پر کثرت سے وحشیانہ حملے کیے جا رہے ہیں لیکن مجرم کبھی پکڑے نہیں جاتے۔ دراصل گرفتار ہونے والے ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں کی طرح جیل توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں جبکہ بلوچستان میں اُن قیدیوں کو ہائی سیکورٹی جیلوں سے فرار ہونے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس سے بھی جیل کی آبادی کو کم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

مؤرخہ 12 نومبر 2013ء کو پشاور ہائی کورٹ (پی ایچ سی) کے چیف جسٹس دوست محمد خان نے پروانہء حاضری ملزم کی درخواست، جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ انسداد دہشت گردی عدالت سے بریت کے بعد روح اللہ کو خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں نے سینٹرل جیل پشاور سے اٹھایا تھا، کی سماعت کے دوران کہا کہ ''اگر ریاست اور استغاثہ ان کے خلاف الزامات ثابت کرنے میں ناکام ہو جائے اور بعد میں ایجنسیاں جیلوں سے افراد کو اٹھا کر لیجائیں تو عدالتوں کا مقصد اور فائدہ کیا

ہے۔اس سلسلے کو فوری طور پر بند کیا جانا چاہئے۔'' انہوں نے مزید کہا کہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کو دہشتگردی کے الزامات سے بری قیدیوں کو جیلوں سے اٹھا کر عدلیہ کی 'تذلیل' بند کرنی چاہئے۔

خیبر پختونخوا کی جیلوں کی آبادی کو اس طرح سے کنٹرول کیا جاتا ہے جبکہ بلوچستان میں مسئلے کو اس سطح تک پہنچنے سے قبل ہی حل کر لیا جاتا ہے اور ریاستی پالیسیوں کیخلاف ناراضگی ظاہر کرنے والے مشتبہ افراد کو فرنٹیئر کور (ایف سی)، انٹیلی جنس ایجنسیاں اور ان کے پراکسی گروہ قتل کر رہے ہیں جنہیں اُسی طرح کے خفیہ فنڈز سے فنڈ فراہم کیے جاتے ہے جیسے کہ انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) نے انسداد بغاوت کیلئے 2008ء تا 2009ء میں 400 ملین استعمال کیے تھے۔ مارچ 2011ء میں بلوچستان کے ایڈووکیٹ جنرل صلاح الدین مینگل نے سپریم کورٹ سے کہا تھا کہ ''ہم ہر روز لاشیں برامد کر رہے ہیں جیسا کہ ایف سی اور پولیس اپنی مرضی سے دن دہاڑے لوگوں کو اٹھا رہے ہیں لیکن ہم مجبور ہیں۔ایف سی کو کون پوچھ سکتا ہے؟''

ایسا لگتا ہے کہ بلوچ کیخلاف مظالم روکنے میں کوئی بھی آمادہ نہیں ہے اور اسی لئے ماما قدیر بلوچ اور فرزانہ مجید کی قیادت میں 20 بلوچ لاپتہ افراد کے خاندانوں کے ساتھ وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز نے کوئٹہ سے کراچی تک 750 کلومیٹر طویل ایک شدید صبر آزما مارچ طے کیا جو ابھی تک صرف کراچی پہنچا ہے۔

دلچسپ مگر غیر تعجب خیز بات یہ ہے کہ بدعنوانی کی شیطانیت انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور ظلم کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ لیے چلتی ہے۔خرم حسین نے اپنے مضمون ''پوشیدہ معیشت'' (28 فروری 2013ء، روزنامہ ڈان) میں اسٹیٹ بینک کے تحت چلنے والے 16 کلیئرنگ ہاؤسز کے اعداد و شمار دیے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''گیارہ ستمبر کے بعد نمونہء کل میں آدھے شہر اپنے کلیئرنگ ہاؤسز کے ذریعے گزرنے والی رقوم میں تیزی سے اضافے کا ایک رجحان دکھائیں گی۔ دوسرے نصف کے لئے، لکیر سیدھی ہے۔ وہ شہر کہ جن میں اضافے کا رجحان ہے ان میں پشاور سب سے آگے پھر فیصل آباد، ملتان، راولپنڈی اور کوئٹہ قریب قریب ہیں۔ 2011ء میں پشاور سے جو رقوم

چیک کے ذریعے کلیئر کروائی گئیں وہ 13 کھرب سے تجاوز کر گئی ہیں! اسی سال کوئٹہ میں یہ رقم 900 ارب روپے سے ذرا کم تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ محض ایک سال میں صرف ان دو علاقائی شہروں کے کلیئرنگ ہاؤسز کے ذریعے جانے والی رقم تقریباً 20 کھرب روپے ہے۔ان اعداد و شمار کا موازنہ فیصل آباد کے 14 کھرب روپے، راولپنڈی کے 13 کھرب روپے اور ملتان کے 826 ارب روپے کیساتھ کیا جا سکتا ہے۔'' یہ حقیقی معنوں میں حیران کن ہے، نہیں ہے!

وہ اسے پوشیدہ معیشت سے منسوب کرتے ہیں جو ''مختصر طور پر سرکاری ریکارڈ پر ظاہر ہوتا ہے اور پھر دوبارہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔'' ایسا لگتا ہے کہ یہ پیسہ اُنہی لوگوں کے پاس جاتا ہے جنہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ پیسہ کہاں جاتا ہے۔اسٹیٹ بینک کے علاوہ غیر قانونی طور پر لین دین کا پیسہ یقیناً قانونی طور پر لین دین کے پیسوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے، اور یہ اعداد و شمار بہت زیادہ ہوتے اگر انہیں بھی ریکارڈ پر لایا جاتا۔ یہ یہی بڑا پیسہ ہے جو ان طاقتوں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ صورتحال کو ہنگامہ خیز رکھیں تاکہ وہ بڑے پیمانے پر منافع کمانا جاری رکھ سکیں۔

سیاہ معیشت ہنگامہ خیز حالات میں پنپتی ہے اور اس کے نتیجے میں ہنگامہ خیز حالات کو فروغ دیتی ہے۔ وہ جو اختیار دار ہیں، اس کا استحصال کر کے اربوں کماتے ہیں۔ اختلاف رائے اور ڈائیورسٹی کو کچلنے کی ریاستی کوشش کے علاوہ یہ 'غلیظ جنگ' اسٹابلشمنٹ کے تمام اداروں میں بڑے پیمانے پر کرپشن کو فروغ دے رہی ہے۔ کرپشن غلیظ جنگ کو دوام دیتی اور اس کے پیچھے وجوہات میں سے ایک ہے۔ وہ جو ذمہ دار ہیں اور اس 'غلیظ جنگ' کو چلا رہے ہیں پیسے کی اس بارش سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور اسمگلنگ، اغوا برائے تاوان اور رشوت ستانی جیسے دیگر منافع بخش کاروبار سے بھی۔ بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں کرپشن اتنے بڑے پیمانے پر بلا روک ٹوک اور دیدہ دلیری سے ہو رہی ہے جسے صرف کوئی اندھا ہی دیکھنے سے انکاری ہو۔ جس طرح سے جیل کی آبادی کے اعداد و شمار 'غلیظ جنگ' کو بے نقاب کرتے ہیں اسی طرح سے اسٹیٹ بینک کے اعداد و شمار اس

کرپشن کو بے نقاب کرتے ہیں جو اسے جنم دیتی ہے لیکن کوئی بھی اسے دیکھنا نہیں چاہتا۔ جب تک کہ 'غلیظ جنگ' کے ذمہ داران منافع کماتے رہیں گے تب تک بلوچستان اور خیبر پختونخوا کی جیلیں بھیڑ سے آزاد رہیں گی اور انسانی اموات کی تعداد بڑھتی رہے گی اور یقیناً یہ اونٹ کی کمر توڑ دے گی اگر اس نے پہلے سے ہی نہ توڑ دی ہو۔

بشکریہ: نیکڈ پنچ، 22 نومبر 2013ء

http://nakedpunch.com/articles/188

قوم پرستی، وفاق پرستی اور علیحدگی پسندی:
مسئلہء بلوچستان

انٹرویو: گل آور خان

میر محمد علی ٹالپر کا گل آور خان کے ساتھ کیا گیا یہ انٹرویو پیش کرنے میں ہمیں بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ انٹرویو مارچ 2013ء میں لیا گیا تھا۔ اُس وقت گل آور خان ویسٹ منسٹر یونیورسٹی میں ایک تحقیقی فیلو تھے اور اپنے پی ایچ ڈی بہ عنوان 'قوم پرستی، وفاق پرستی اور علیحدگی پسندی: پاکستان میں مسئلہء بلوچستان' پر کام کر رہے تھے۔ انٹرویو آڈیو کی شکل میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ ذیل میں ہم اس کا متن پیش کر رہے ہیں۔

(نیکڈ پنچ ڈاٹ کام)

گل آور خان: میر صاحب، مختصر طور پر اپنا تعارف کریں۔

میر محمد علی ٹالپر: میں میر محمد علی ٹالپر ہوں۔ میں یہاں حیدر آباد سندھ میں رہتا ہوں۔ اصل میں ہم ٹالپر تقریباً 350 سال قبل بلوچستان سے یہاں سندھ میں آئے تھے۔ انہوں نے 1783ء سے 1843ء تک 60 سال کے لیے سندھ پر حکومت بھی کی، جب یہاں میانی کی جنگ میں برطانوی افواج نے ٹالپروں اور بلوچوں کو شکست دی۔ لیکن سندھ میں ٹالپروں کا اثر و رسوخ اب بھی موجود ہے۔ یہاں ان کے لوگوں کے ساتھ بہت اچھے اور پرانے تعلقات ہیں۔ سندھ یا دیگر علاقوں میں حکومت کرنے والے دیگر خاندانوں کے لوگ باقی نہیں رہے، چونکہ شاید ٹالپروں نے عوام کی خدمت کی تھی، اسی وجہ سے وہ ابھی تک یہاں موجود ہیں۔

اور میرے والد صاحب کی سیاست برطانوی راج کے خلاف تھی۔ وہ خاکسار تحریک اور (آل انڈیا) کانگریس میں تھے۔ اس کے بعد وہ یہاں کی سیاست میں رہے، زیادہ تر حزبِ اختلاف میں، لیکن ایک مختصر مدت کے لیے وہ (جنرل) ضیا کی حکومت میں وزیر دفاع تھے۔

میں 1971ء سے لے کر 1991ء تک بلوچوں کے ساتھ، خاص طور پر مری قبیلے کے ساتھ رہا۔ میں مری کے علاقے میں رہا اور اس کے بعد 13 سال تک افغانستان میں بہ حیثیت ایک پناہ گزین کے رہا۔ میں 1991ء میں واپس آیا۔ واپس آنے کے بعد میں خاموشی سے، طبیعتاً ہی ایسا ہے کہ میں ایک خاموش زندگی گزارتا ہوں۔ میں لکھتا ہوں جب کبھی بھی مجھے لکھنے کا موقع ملا ہے۔ پہلے میں 'دی پوسٹ' کے لیے لکھتا تھا جو لاہور سے نکلتا تھا۔ پھر میں نے چند مضامین 'ڈان' کے لیے لکھے۔ جب سے میرے دوست اور ہم سفر راشد رحمان 'ڈیلی ٹائمز' کے چیف ایڈیٹر بنے تو میں نے 'ڈیلی ٹائمز' کے لیے لکھنا شروع کیا۔ میں اب بھی 'ڈیلی ٹائمز' کے لیے لکھتا ہوں۔ بس یہی مشغلہ رہتا ہے۔

گل آور خان: میر صاحب، بلوچ کے بارے میں آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ بلوچ کون ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: بلوچ اپنے تئیں ایک قوم ہے۔ بلوچ کی تاریخ کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور ان کا ماخذ کیا ہے۔ اب بھی کئی چیزیں ہیں جو حتمی طور پر طے نہیں ہوئی ہیں۔ مثال کے طور عرب کہتے ہیں کہ بلوچ عرب ہیں۔ مطلب یہ کہ عرب یہ دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن بنیادی نقطہ یہ ہے کہ چوں کہ ان کی اپنی زبان ہے، اپنی تاریخ ہے، اپنی ثقافت ہے، وہ بذاتِ خود ایک قوم ہیں۔ بلوچ خود ایک قوم ہے۔

لوگ عام طور پر اس بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ اسے گڈمڈ کر دیتے ہیں جیسا کہ ان کا کہنا ہے کہ بلوچی فارسی یا دری کا ایک حصہ ہے، وہ کچھ اسی طرح کی بات کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں بلوچی، دری، کردی اور فارسی زبانوں کے ایک ہی ذخیرے سے تعلق رکھتے ہیں، انڈو یورپین زبانوں کے ذخیرے سے۔ یہ بذاتِ خود ایک زبان ہے۔ یہ کسی کی شاخ نہیں بلکہ بذاتِ خود ایک زبان ہے۔

اور بلوچ ایک قوم ہے۔ انہوں نے ایک قوم کی حیثیت، سیاسی طور پر ایک قوم کی حیثیت، جیسا کہ ثقافتی طور پر وہ ہمیشہ سے ایک قوم تھی اور ہمیشہ رہے گی لیکن سیاسی طور پر یہ ایک قوم نصیر خان نوری کے تحت وجود میں آئی اور ایرانی بلوچستان میں بھی دوست محمد خان کے عہد میں۔

بلوچ اس وقت بہت سے علاقوں میں منقسم ہیں۔ اس کے کچھ حصوں پر بلوچستان کے طور پر پاکستان کا قبضہ ہے، اس کا ایک حصہ پنجاب میں ہے جو پنجاب کے طور پر قبضے میں ہے۔ میرے خیال میں سندھ میں بلوچوں کی ایک بہت بڑی آبادی ہے۔ وہ سندھ میں بھی کسی اقلیت کے طور پر نہیں ہیں۔

تو لہٰذا بلوچ ثقافتی، تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے بھی ایک قوم ہے۔ وہ اپنے ملحق جغرافیائی علاقے میں رہتے ہیں۔ یہ علاقہ سندھ سے شروع ہو کر ایران کے حصوں تک جاتا ہے، افغانستان میں بھی ایک بڑی بلوچ آبادی ہے۔ تو بلوچ تاریخی، ثقافتی اور جغرافیائی طور پر ایک قوم ہیں۔

گل آور خان: میر صاحب، نظریہ دان کہتے ہیں کہ قومیں بنتی ہیں، ریاستیں بنتی ہیں، اور جب بات وفاق کی آتی ہے، جہاں یہ لسانی، نسلی، قومی گروہ ایک ساتھ ملتے ہیں اور ایک معاہدہ کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک وفاق رضامندی سے وجود میں آتا ہے، پاکستان بھی 1947ء سے ایک وفاق ہے۔ تو آپکی رائے میں اسے کس طرح قائم کیا گیا یا کیسی رضامندی کے ساتھ؟

میر محمد علی ٹالپر: درحقیقت بلوچ اس وفاق میں شامل ہونے کے لیے بالکل رضامند نہیں تھے۔ کیونکہ 4 اگست 1947ء کو برطانیہ، پاکستان اور خان کلات کے درمیان ایک اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ ہوا تھا۔ اس اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ میں کہا گیا تھا کہ 'اسٹیٹس کوو' کو برقرار رکھا جائے گا۔ چوں کہ برطانیہ اور کلات کے درمیان معاہدہ جو کہ میرے خیال میں 1876ء میں ہوا تھا، اس معاہدے کے تحت کلات کو ایک خصوصی حیثیت حاصل تھی اور اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ میں اسے قبول کیا گیا تھا اور پاکستان اس معاہدے کا ایک دستخط کنندہ تھا۔ اور پھر 11 اگست 1947ء میں کلات کو آزاد قرار دیا گیا۔ اگرچہ سرکاری طور پر اس کا اعلان 15 تاریخ کو کیا گیا تھا کہ لیکن سب سے پہلے 11 اگست کو اس کا اعلان ہوا تھا اور آل انڈیا ریڈیو پر بھی اسے

رپورٹ کیا گیا تھا۔ اور وائی بی فیل، جو کہ کلات کے وزیر خارجہ اور میرے خیال میں وزیر اعظم بھی تھے، اپنی کتاب میں کہتے ہیں کہ کلات کی آزادی، جو کہ بلوچستان تھا، کا اعلان 11 اگست کو کیا گیا تھا۔

اور جہاں تک وفاق کا تعلق ہے، وفاق کے لیے رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور وفاق کو وفاقی اکائیوں کے حقوق کو تسلیم اور ان کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہاں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ جن افراد کو پاکستان پر حکومت کرنا تھی وہ اس طرح کی کوئی چیز بنانا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اگر وہ ایک وفاق چاہتے تو وہ کبھی ایسا نہیں کہتے، جناح مارچ 1948ء میں ڈھاکہ میں کبھی یہ نہ کہتے کہ اردو اور صرف اردو اس نئے خطے، اس نئی ہستی کی زبان ہوگی۔ اس نے وفاقی اکائیوں کو بطور اکائی کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ اپنے نظریے کو تھوپنا چاہتے تھے۔

مثال کے طور پر وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام کے سبب اور ایک ہی مذہب کے ہونے کے باعث ہم مسلمان ایک ہی قوم ہیں۔ لیکن جیسا کہ غوث بخش بزنجو نے بلوچستان کے ایوان زیریں میں اپنی دسمبر 1947ء کی تقریر میں کہا تھا کہ 'اگر یہ ایسا ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں تو پھر کیوں نہ افغانستان، عربوں اور دیگر تمام کو ایک ہی قوم بنا دیا جائے۔' تو لہٰذا اس کی بنیاد جھوٹ پر مبنی ہے؛ کہ مذہب کا عنصر کسی قوم کے ہونے کو متعین کرے۔ پاکستان نے دیگر تمام اکائیوں پر اپنے نظریات، اپنے اسٹیبلشمنٹ کی حکمرانی مسلط کرنے کی کوشش کی ہے جس میں سندھ، سرحد (این ڈبلیو ایف پی) اور بلوچستان شامل ہیں۔ پنجاب نے کبھی مزاحمت نہیں کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انہیں ہمیشہ اس پر غلبہ حاصل رہے گا۔ بنگالیوں کو بھی صعوبتیں جھیلنا پڑیں کیوں کہ انہیں پاکستان کو کبھی بھی ایک وفاقی ریاست بنانا ہی نہیں تھا۔ یہ ہمیشہ سے ایک وحدانی ریاست رہی ہے اور یہ اب بھی ایک وفاق نہیں ہے۔

مثال کے طور پر، اگرچہ، بلوچستان میں موجودہ ڈھانچہ، اسمبلیاں، حکومت اور تمام ادارے کافی فرمانبردار و اطاعت شعار ہیں اور پاکستانی ریاست کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ لیکن جب گوادر چین کے حوالے کیا جا رہا ہے تو ان سے مشورہ تک نہیں کیا گیا۔ لہٰذا، یہ کبھی بھی ایک وفاق

نہیں رہا ہے اور یہ کبھی بھی ایک وفاق نہیں ہوگا۔ یہ محض... یہاں، جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ وہ تمام جن کے پاس طاقت ہے، جو کچھ چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ پنجاب کے پاس فوج ہے۔ اور افسوس کی بات ہے کہ فرنٹیئر کور (ایف سی) تمام کی تمام پشتون ہے۔ وہ ایک طرح سے کسی وفاق کی تائید نہیں کرتے۔ وہ وفاق کے نقطۂ نظر کی تائید نہیں کرتے۔ پاکستان کبھی بھی ایک وفاق نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ زیادہ تر پنجاب... یہ زیادہ تر پنجاب کی وجہ سے ہے، وہ اسے قبول نہیں کریں گے۔ انہوں نے کبھی بھی اس کو قبول نہیں کیا۔

گل آور خان: تو پھر میر صاحب، پاکستان کے وفاقی ڈھانچے میں بلوچ کے لیے کیا فوائد اور نقصانات ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: یقینی طور پر، مجھے نہیں لگتا ہے کہ بلوچ کے لیے یہاں کسی طرح کے بھی فوائد ہیں، بلوچ کا اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیوں کہ مثال کے طور پر جب پاکستان نے 27 مارچ 1948ء میں کلات پر زبردستی قبضہ کیا تھا، اس وقت بھی انہیں اپنے حقوق حاصل نہیں تھے۔ پھر 1955ء میں ون یونٹ کا اعلان کیا گیا۔ یہ کچھ اور نہیں بلکہ حتیٰ کہ بنگالیوں کو بھی ان کی اکثریت کے حقوق سے محروم کرنے کی ایک کوشش تھی۔ کیونکہ مغربی پاکستان ایک ناقابلِ تصور شئے تھی؛ یہ بذاتِ خود ایک ہستی نہیں تھی۔ کیونکہ وہاں وفاقی اکائیاں تھیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی قرارداد پاکستان کو بھی دیکھے تو اس میں آزاد ریاستوں پر مشتمل ایک وفاق بنانے کی بات کی گئی ہے نہ کہ کوئی ون یونٹ وہ چاہتے تھے۔ اور یہی چیز اس ملک کے لیے زہر قاتل رہی ہے۔ کیوں کہ ابتدائی طور پر مائنس بلوچستان، مائنس کلات، وہ اسے ایک آزاد ریاست کے طور پر دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

ابتدائی مراحل میں پاکستان کے لیے یہاں سندھ میں ایک بہت بڑا خیر سگالی کا جذبہ تھا۔ یہاں کے لوگوں نے مہاجروں کا کھلے دل اور کھلی بانہوں سے خیر مقدم کیا اور یہاں انہیں رہنے کے لیے جگہ دی۔ یہ ان کی خیر سگالی تھی۔ وہ حقیقتاً اس چیز کو ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہاں بڑے خواب دیکھے لیکن ان کے خواب بہت جلد چکنا چور ہو گئے؛ اتنی ہی جلدی جب جناح

نے کہا کہ زبان صرف اردو ہوگی، اور لیاقت علی اور دیگر نے قراردادِ مقاصد پیش کی۔ انہوں نے یہاں آئے مہاجروں (ہندوستانی مہاجرین) کو زمینیں اور حقوق دینا شروع کر دیے اور جائیدادوں کا دعویٰ کیا تو لوگ سمجھ گئے۔

بلوچستان میں انہیں کبھی حقوق نہیں ملے کیوں کہ نہ صرف 1948ء میں فوجی کارروائی کی گئی چونکہ جب آغا عبدالکریم پہاڑوں پر چلے گئے اور وہ افغانستان سے جدوجہد کر رہے تھے اور دیگر تمام بلوچ جو جدوجہد کر رہے تھے۔ اس دور میں بلوچ قیادت کی اکثریت، جیسا کہ میر گل خان نصیر، خیر بخش خان اور دیگر، کو یا تو سندھ میں جلاوطنی میں رکھا گیا تھا یا پھر حیدرآباد کے جیل میں۔ شیر محمد مری اور عطا اللہ مینگل بھی جیل میں تھے۔ 1958ء میں جب مارشل لا نافذ کیا گیا، انہوں نے مارشل لا کا نفاذ اس الزام کے بہانے کیا کہ خان کلات ایک معاہدے کے تحت افغانستان کے ساتھ شراکتِ عمل میں بلوچستان کو پاکستان سے الگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مارشل لا اس عذر پر نافذ کیا گیا تھا کہ خان کلات پاکستان کو توڑنا چاہتے تھے۔ خان کلات قید کیے گئے؛ میری (کلات شہر) پر حملہ کیا گیا اور اسے لوٹا گیا۔

تو یہ تب ہوا جب نواب نوروز خان اور دیگر جوان کے شانہ بشانہ لڑے۔ اور آپ کو پتہ ہے کہ اس کے نتیجے میں کیا ہوا۔ نواب نوروز خان کو ان کے بیٹوں سمیت قید کیا گیا۔ میرے خیال میں ان کے دو بیٹے اور دیگر دوستوں، کچھ کو سکھر جیل اور کچھ کو حیدرآباد میں قید کیا گیا۔ 15 جولائی (1960) کو مختصر سماعت کے بعد انہیں پھانسی دے دی گئی۔ ان میں سے چار کو سکھر میں اور تین کو حیدرآباد جیل میں۔

تو لہٰذا، پاکستان کا وفاق، میرا اصرار یہ ہے کہ یہ کبھی بھی ایک وفاق نہیں رہا ہے۔ میری بنیادی دلیل یہی ہے کہ یہ کبھی بھی ایک وفاق نہیں رہا ہے۔ حتیٰ کہ اگر صرف بہ خاطر دلیل آپ اسے مان بھی لیں، تو اس نے کبھی بھی وفاقی اکائیوں کی مدد نہیں کی ماسوائے ان لوگوں کے جنہیں حکمران اشرافیہ فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔ یہاں پر کبھی بھی وفاق کا وجود ہی نہیں رہا۔ میرا نہیں خیال کہ کبھی بھی اس کا وجود یہاں پر ہوگا۔ اور بلوچ 27 مارچ 1948ء کے بعد سے ہمیشہ گھاٹے میں رہے

ہیں، اس کی 65 سال کی پوری تاریخ میں۔

گل آور خان: میر صاحب، جیسا کہ ہم وفاق کے بارے میں بات کر رہے ہیں تو وفاق کے اندر بلوچوں کے اہم مسائل اور شکایات کیا ہیں؟ بلوچ کیا چاہتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: میرا خیال ہے کہ بلوچ ایک طویل عرصے سے آزادی چاہتے ہیں۔ کیوں کہ آپ کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ بلوچ، نواب خیر بخش خان یا شیر محمد خان جیسے لوگوں نے ہمیشہ صرف آزادی کی بات کی ہے۔ ان کا ہمیشہ سے یہی مطالبہ رہا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ بلوچ اب بھی یہی چاہتے ہیں۔ تمام تحریکوں، 1948ء میں آغا عبدالکریم کی، 1958ء میں نواب نوروز خان کی، اور پھر 1962ء سے لے کر 1969ء تک شیر محمد خان اور علی محمد مینگل کی۔ ان کے رویے میں وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج سختی آتی گئی۔ وہ لوگ جو شاید پہلے پاکستان سے بلوچستان کی آزادی نہیں چاہتے تھے، لیکن پاکستان کے رویے کی وجہ سے آزادی کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ان رہنماؤں میں سے چند کی پوزیشن ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ بلوچستان کو آزاد ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر خیر بخش خان، ابتدائی طور پر شاید غوث بخش بزنجو بھی اس میں تھے لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا نقطہ نظر تبدیل کر دیا۔ عطا اللہ جواب اس کو اس نظر سے نہیں دیکھتے جیسا کہ وہ دیکھا کرتے تھے۔ لیکن جس سطح پر پاکستان کے خلاف مزاحمت کی بلوچ تحریک جو بلوچستان میں چل رہی ہے، وہ آزادی سے کم کسی بھی چیز پر اتفاق نہیں کرتے۔ وہ صرف آزادی چاہتے ہیں۔

جیسا کہ آپ کو پتہ ہے کہ 2005ء سے بلوچ تحریک ایک بار پھر اتنی شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے۔ ہزاروں لوگ لاپتہ ہیں، اور حکومت کی طرف سے اغوا کیے لوگوں میں سے گذشتہ تین سال کے اندر 700 سے زائد لاشیں یہاں پھینکی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ خود سپریم کورٹ بھی مانتی ہے کہ انٹیلی جنس ایجنسیاں اور ایف سی اس میں ملوث ہیں۔ میرے خیال میں بلوچستان میں بہت کم خاندان ایسے ہیں جن کا کوئی جاننے والا، رشتہ دار یا تو غائب یا قتل نہیں کیا گیا ہو۔ لہٰذا،

میرے خیال میں بلوچ آزادی کے سوا اور کسی چیز کے بارے میں بات کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔

گل آور خان: میر صاحب، جیسا کہ آپ نے کہا کہ تمام بلوچ رہنما شروع سے ایک آزاد بلوچستان چاہتے تھے۔ لیکن اگر ہم تاریخ میں جائیں تو، 1960ء کی دہائی میں خیر بخش پارلیمنٹ کا حصہ تھے، 70ء کے عشرے میں سردار عطا اللہ مینگل وزیر اعلیٰ بنے، غوث بخش گورنر تھے۔ تو، اس تناظر میں آپ ہمیں کچھ حقائق فراہم کر سکتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: جناب، اصل میں اُس وقت بلوچ قوم میں شعور اور بیداری اس سطح پر نہیں تھی۔ آج کے اوزاروں کے ساتھ، جیسا کہ سوشل میڈیا ہے، (ماس) میڈیا ہے، سیٹلائٹ فون ہیں، انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی ہے، اور جس طرح سے لوگ اسے اپنے خیالات پہنچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جس طرح سے لوگ اس پر ردِعمل دکھاتے ہیں، یہ اس دور میں موجود نہیں تھے۔ آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو نے جب بلوچستان میں فوج بھیجی، مری علاقے میں، مری علاقہ اور سبی ایک دوسرے سے متصل ہیں، ان کی سرحد آپس میں ملتی ہیں۔ اور حالت یہ تھی کہ مری علاقوں میں جو جنگ چل رہی تھی، اس کی خبر سبی تک نہیں پہنچ پاتی۔ آج، ابھی کہیں پر کچھ ہو جائے تو اس کی خبر فوراً دنیا بھر میں پہنچ جاتی ہے۔ اس دور میں، جو اوزار ان کے حق میں تھے، بہت محدود تھے۔ تو بادل نخواستہ اسی سوچ کے تحت کہ اور کچھ نہ سہی تو اس طرح سے بلوچوں کے لیے کچھ آسانیاں پیدا کی جائیں۔

وہ پارلیمنٹ میں بھی تھے اور عطا اللہ اقتدار میں آئے لیکن آپ نے دیکھا کہ انہیں نو یا دس ماہ سے زیادہ برداشت نہیں کیا گیا۔ اور انہیں بیسیوں الزام لگا کر برخاست کیا گیا؛ بشمول عراقی اسلحے کی برامدگی کے۔ وہ عراقی شخص جو اپنے ساتھ یہاں (ہتھیار) لایا تھا، وہ خود ساواک کا ایجنٹ تھا۔ اور جب اسلحہ کراچی پہنچا تو وہ (حکومت) اس کے بارے میں جانتے تھے۔ رفیع رضا، جو اس دور کے ایک وزیر اور بھٹو کے ایک بہت قریبی ساتھی تھے، نے اس کے بارے میں ہمیں بتایا۔ جب وہ کراچی پہنچے تو انہیں اس بارے پتہ تھا اور انہوں اسے اسلام آباد میں عراقی قونصل خانے تک

پہنچانے کی سہولت فراہم کی۔ اور پھر وہ میڈیا شو کے ساتھ وہاں گئے اور اس کا الزام قوم پرستوں پر لگایا۔

تو مختلف اوقات میں جدوجہد کی مختلف شکلوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ ایک تسلسل تھا۔ خیر بخش اپنے مؤقف پر غیر مصالحت پسند رہے۔ وہ ہمیشہ اس پر ڈٹے رہے۔ باقی تمام لوگ پس و پیش کرتے رہے، اِس یا اُس چیز پر پیچھے ہٹتے رہے۔ میرے خیال میں خیر بخش خان قائم رہے اور وہ اب بھی اسی (مؤقف) پر قائم ہیں۔

گل آور خان: سوال ایک بار پھر اسی بابت ہے کہ بہت سے بلوچ قوم پرست 40، 50، 60، 70ء کی دہائیوں میں اور موجودہ دور میں پاکستانی وفاق کے ساتھ محاذ آرائی میں رہے ہیں۔ تو آپ کی رائے میں یہ تنازعہ ایک تسلسل ہے یا ان کے مقاصد مختلف تھے؟

میر محمد علی ٹالپر: میرے خیال میں یہ اسی کا ایک تسلسل ہے۔ فرض کریں کہ اگر آغا عبدالکریم نہ لڑتے تو نوروز خان والی جنگ نہیں ہوئی ہوتی۔ اگر نوروز خان نہ لڑتے تو پھر شیر محمد خان شاید نہ لڑتے۔ اگر شیر محمد نہ لڑتے تو 1973ء والی جنگ نہیں ہوئی ہوتی۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ جدوجہد کا ہر مرحلہ معیار کے اعتبار سے اعلیٰ تر تھا۔ اس نے خود اپنی پرورش کی ہے اور یہ زیادہ اہم اور زیادہ بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ 1948ء میں جب آغا عبدالکریم اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ صرف دو تین سو لوگ تھے۔ جب نوروز خان لڑے، وہ چند ہزار تھے۔ پھر جب شیر محمد خان، عطا اللہ خان اور علی محمد مینگل لڑے تو یہ اس سے کہیں زیادہ تھے۔ اور جب 1973ء کی بغاوت ہوئی، تو یہ ایک بار پھر زیادہ شدید تھی اور بہت سارے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی بشمول مکران، مینگل علاقوں، مری علاقوں اور بولان کے، یعنی کہ یہ زیادہ بڑے پیمانے پر تھی۔ اور اب صورت حال یہ ہے کہ کوئٹہ میں بھی لوگ اسکولوں میں ان کا ترانہ تک نہیں پڑھتے۔

گل آور خان: میر صاحب، انسان ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں، وفاقیں اور مملکتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں، مسائل پیدا ہوتے، اور ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ تو آپ کے خیال میں بلوچ مسئلے کا کوئی حل ہے؟ یہ وفاق پاکستان کے اندر رہتے ہوئے یا اس کے بغیر حل کیا جا

سکتا ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: میں اس کا جواب صرف اپنی طرف سے دے سکتا ہوں۔ جیسا کہ میں بلوچ تحریک کا ایک حصہ رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔ حال ہی میں ہونے والے کراچی ادبی میلے میں جہاں محمد حنیف صاحب کی کتاب کی تقریبِ رونمائی ہوئی تھی تو میں نے اپنے تعارف میں کہا کہ آج کی صورت حال ایسی ہے کہ میں پہاڑوں میں ہوتا لیکن عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے میں وہاں نہیں ہوں اور میں نے چیئرمین ماؤ کے حوالے سے کہا تھا: ''جنگ، سیاست کے تسلسل کا دوسرا ذریعہ ہے۔'' میرے خیال میں لکھنا، جنگ کے تسلسل کا دوسرا ذریعہ ہے۔ تو میں بھی لڑ رہا ہوں۔ میں نے لڑائی جاری رکھی ہوئی ہے۔

میرے خیال میں بلوچ کو جو نقصان پہنچا ہے، بلوچوں سے کی گئی اس 65 سال کی زیادتیاں، جو لوگ پاکستان کی طرف ہیں، جیسے رئیسانی والے، ڈاکٹر مالک یا ڈاکٹر حئی ہے، آپ ان سب کو جانتے ہیں، جو وفاق کی سیاست کرتے ہیں، وہ تو صرف یہی چاہتے ہیں کہ انہیں خبز ریزے ملیں۔ مطلب یہ کہ وفاق کی میز سے جو کچھ گرے، وہ انہیں نصیب ہو۔ لیکن باقی بلوچ جو ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ تصور ہی نہیں کرتے کہ بلوچستان وفاق میں رہے۔

آپ کو معلوم ہے میں سندھ میں رہتا ہوں۔ میں نے جو لوگ افغانستان میں پڑھائے تھے، مری قبیلے کے لوگ، میرا ان سے تعلق تھا، میں ان کا حصہ تھا اور وہ میرا حصہ تھے، ان میں سے میرے پڑھائے ہوئے 16 طالب علموں کو اغوا کیا گیا اور ان کی لاشیں پھینکی گئیں۔ اب میں پاکستان کے بارے میں کیا سوچوں؟ میرا تو صرف یہ تعلق تھا کہ وہ میرے طالب علم تھے، جن لوگوں کے ساتھ چلتی رہیں زیادتیاں اور ابھی تک ہو رہیں زیادتیاں، ایسا نہیں ہے کہ جنگ بندی ہوئی ہے، جنگ بندی بھی نہیں ہوئی ہے۔

ٹوئٹر پر کل حامد میر نے خضدار پر ٹویٹ کیا تھا کہ انہوں نے جو لوگ انٹرویو کیے تھے، ان میں سے تین لڑکوں کو غائب کیا گیا ہے۔ اور یہ ہر روز کی بات ہے کہ لوگ غائب ہو رہے ہیں۔ میرے جاننے والے جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں ان میں سے دس بارہ افراد ابھی تک لاپتہ ہیں۔

بلوچستان میں ہمارے ایک جاننے والے تھے ناڑی کیہر کے نام سے، وہ لاپتہ ہے۔ میرا طالب علم تھا ڈاکٹر اکبر مری، جن کی تنخواہیں وغیرہ سپریم کورٹ نے ان کے خاندان والوں کو دلوائی تھیں، وہ بھی غائب ہیں۔ حب میں میرے جاننے والے ہیں، ان میں سے ایک 17 سالہ لڑکا جس کا شناختی کارڈ بھی ابھی تک نہیں بنا ہے، اپنے بھائی کی پیشی کے لیے گیا تھا۔ اس کے بھائی کو بھی پہلے غائب کیا گیا تھا پھر الزامات کے ساتھ جیل میں ظاہر کیا گیا۔ اسے لسبیلہ سے بھائی کی پیشی سے لوٹتے وقت حب میں ساکران تھانے کے قریب اٹھا کر لے گئے، آج تک اس کا پتہ نہیں۔ یہ پچھلے سال کی بات ہے۔

تو ایسے حالات میں آپ لوگوں سے کیا توقع رکھیں گے کہ اب بھی لوگ رضامند ہوں گے کہ پاکستان کے ساتھ رہا جائے؟ میرا خیال ہے یہ ان سے بہت زیادہ کی توقع کرنا ہے۔ اس طرح کے حالات اور ان تمام زیادتیوں کے باوجود، لوگوں سے توقع کی جائے کہ وہ اب بھی پاکستان کے ساتھ رہیں گے، جیسا کہ محمد حنیف نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ ''آپ رات کو لوگوں کے ناخن کھینچ کر نکال لیں اور ان سے توقع کریں کہ وہ صبح کو 'پاکستان زندہ باد' کے نعرے لگائیں گے''، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔

گل آور خان: میر صاحب، ہم ایک بار پھر واپس تاریخ میں جاتے ہیں۔ 1977ء سے 2000ء تک یہ ایک ایسا وقت کہ یہ سلسلہ کسی حد تک رکتا ہے بلکہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ 1977ء کے بعد ضیا حکومت آئی، ایک سیاسی عمل شروع ہوا، مشرف کے آنے تک ایک خاموشی تھی۔ کیا یہ خاموشی وفاق کے ساتھ شامل ہونے کے لیے تھی یا کچھ اور؟

میر محمد علی ٹالپر: میرے خیال میں نہیں۔ لوگ یہی کہتے ہیں کہ یہ وفاق کے ساتھ شامل ہونے کی علامت تھی لیکن کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم 13 سے 14 ہزار بلوچ جو افغانستان میں بیٹھے تھے، وہ کیوں بیٹھے تھے؟ خیر بخش خان، شیر محمد خان، میر ہزار خان رامکانی، یا ہم جیسے چھوٹے موٹے کام کرنے والے، وہ 1991ء اور 1992ء تک جب تک کہ نجیب کی حکومت نہیں گئی تھی تب تک وہ افغانستان میں بیٹھے تھے۔ تو کیا وہ وفاق کی حمایت کر رہے تھے؟

نہیں۔ میرا خیال ہے نہیں کر رہے تھے۔ اس کا مقصد اپنی قوت کو قائم رکھنا تھا۔ اگر انہوں نے وفاق کے ساتھ مکمل طور پر سمجھوتہ کیا ہوتا تو... چونکہ 1977ء میں جب ضیا نے عام معافی کا اعلان کیا تھا، تو جنہوں نے سمجھوتہ کرنا تھا، جنہیں وفاق کے ساتھ رہنا تھا، مثلاً مہر اللہ مینگل، اسلم گچکی، لال بخش رند، اور بزنجو والے جو تھے وہاں پر، وہ سب واپس آ گئے۔

خیر بخش خان تب تک افغانستان میں نہیں آئے تھے، لیکن میر ہزار خان تھے، ہم جو اور سیاسی لوگ وہاں موجود تھے، ان کا یہی فیصلہ تھا کہ یہ عام معافی قبول نہیں کرنی ہے کیوں کہ اس عام معافی سے کچھ حاصل نہیں ہونا ہے اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہاں، نوکریاں شاید ملی ہوں، کچھ ٹھیکے ملے ہوں، ان لوگوں کو جو واپس آئے۔ خاموشی سی تو تھی لیکن یہ کہہ دینا کہ سب لوگ بالکل سو گئے تھے، لوگ سوئے نہیں تھے۔ کیوں کہ اتنے سارے بلوچوں کا افغانستان میں موجود رہنا، اور ان کی عام معافی نظر انداز اور رد کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چیز ختم نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ لوگ کہتے ہیں کہ ختم ہو گئی تھی۔

گل آور خان: آپ نے پارلیمنٹرین کا ذکر کیا، نیشنل پارٹی، بی این پی عوامی اور بی این پی مینگل کا ذکر کیا، اور پھر وہ قوتیں ہیں، جن کا آپ نے ذکر کیا جو افغانستان میں تھے، ان میں سے آج بھی کچھ پہاڑوں پر بیٹھے ہیں، اس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں کوئی فرق بلوچ نیشنلزم میں نظر نہیں آ رہا، کہ یہ دو طرح کی ہیں یا بلوچ قوم پرستی مختلف ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: یقینی طور پر بلوچ قوم پرستی مختلف ہے۔ کیوں کہ دو رویے ہیں۔ ایک وہ قوم پرستی ہے جو بلوچ کا نام استعمال کر کے وفاق کے اندر اپنی حکومتیں، اپنے ٹھیکے، اپنے فائدے ڈھونڈتے ہیں، یہ ایک قوم پرستی ہے۔ یہ قوم پرستی کی کرپٹ شکل ہے، یعنی قوم پرستی کے نام کا استحصال کرنا۔ باتیں تو سبھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مالک بھی لوگوں کی بات کرتا ہے، ڈاکٹر حئی اور اختر مینگل بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان کا ہدف بہت محدود ہے جس میں لوگوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، ان کا اپنا ہے لیکن لوگوں کا عمل دخل نہیں ہے۔ وہ وفاق کے ساتھ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں ہیں بلکہ اپنی فلاح و بہبود کے لیے رہتے ہیں۔

دوسری جانب ڈاکٹر اللہ نذر ہے، براہمدغ والے لوگ ہیں یا خیر بخش خان والے لوگ ہیں۔ آپ خیر بخش خان والے کہیں یا پھر، کیوں کہ خیر بخش خان خود تو عمر رسیدہ ہیں، وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ یہ صحیح راستہ تھا وہ اب تک ساتھ ہیں۔ اور یہی قوم پرستی کی اصل شکل ہے جو کہ واقعتاً آج کے بلوچستان کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔

آپ اس بات سے اندازہ کریں کہ میں اکثر لوگوں سے کہتا ہوں کہ اگر 1948ء میں آغا عبدالکریم بندوق نہ اٹھاتے تو نوروز خان بندوق نہ اٹھاتے، یا جو بندوق اٹھانے کا سلسلہ رہا ہے۔ تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ بلوچستان پر کس قسم کی یلغار ہوئی ہوتی۔ یعنی آبادیاتی خصوصیات (ڈیموگرافی) جسے کہتے ہیں، یہ لوگ ڈر کی وجہ سے وہاں نہیں گئے ہیں۔ نہیں تو آپ کے تمام بہاری، پنجاب کی اضافی آبادی، اور یہاں کے مہاجر، اردو بولنے والے لوگ، یہ سب بلوچستان پر قابض ہو جاتے۔ یہ صرف ان لوگوں کا خوف ہے کہ وہ ہمیں وہاں برداشت نہیں کریں گے، اس وجہ سے نہیں آئے۔ نہیں تو آبادیاتی خصوصیات میں اتنی تبدیلی آ چکی ہوتی کہ... اور بلوچ کتنے ہیں؟ صرف بلوچستان میں بلوچوں کی آبادی پانچ ملین ہے۔ یہاں سے دس، بارہ ملین سے بھی زیادہ لوگ چلے گئے ہوتے۔ تو یعنی آبادیاتی خصوصیات کے حوالے سے وہ ختم ہو گئے ہوتے۔ جو وہ گوادر میں کوشش کر رہے ہیں یا حب میں انہوں نے ایک صنعتی علاقہ بنایا ہے۔

تو، یقینی طور پر قوم پرستی کی دو اقسام ہیں؛ ایک وہ موقع پرست قوم پرستی ہے جو اپنے فائدے کے لیے وفاق کے ساتھ رہتی ہے۔ اور قوم پرستی کی دوسری شکل جو کہ قوم پرستی کی حقیقی شکل ہے۔ اصل میں اس قوم پرستی کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک چاہتے ہیں کہ ہم کھاتے پیتے غلام ہوں اور دوسرے کہتے ہیں ہم بھوکے رہیں لیکن آزاد ہوں۔ تو یقینی طور پر بلوچستان میں آج کے دور میں قوم پرستی کی دو اقسام ہیں، دو طرح کے رجحانات موجود ہیں۔

گل آور خان: میر صاحب، پاکستانی ریاست اس بات سے مکمل طور انکار کرتی ہے اور اس کی رائے میں چند بلوچ سردار یا قبائلی سربراہ بلوچ مسئلے کے لیے ذمہ دار ہیں، وگرنہ وہاں کوئی بلوچ مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بلوچ سرداروں کی طرف سے پیدا کیا گیا ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: یہ سرکاری بیانیہ ہے۔ میرے خیال میں بلوچستان میں 99 فی صد سردار حکومت کے ساتھ ہیں۔ مثلاً رئیسانی، شاہوانی اور باقی جو بھی سردار ہیں وہ سب وفاق کے ساتھ ہیں۔ اب، ان کے علاقوں میں ترقی کیوں نہیں ہوئی؟ یہ مانا کہ وہ زیادہ تر تین سرداروں پر الزام لگاتے ہیں۔ اکبر تو خیر آخر میں آ کر اس بات میں شامل ہوئے۔ اکبر نے تو اجازت دے رکھی تھی۔ سوئی سے گیس بھی چل رہی تھی اور سب چیزیں چل رہی تھیں۔

وہ عطا اللہ، خیر بخش اور اکبر کو کہتے ہیں کہ یہ تین سردار نہیں مانتے ہیں۔ اکبر تو مانتا تھا۔ کیوں کہ وہ 1973 میں گورنر بھی بنا۔ لیکن اب تو عطا اللہ بھی ان 'شر پسند' سرداروں میں نہیں رہا۔ تو کیا وجہ ہے کہ اب تک وہاں کسی بھی قسم کی ترقی نہیں ہوئی؟ مکران میں کوئی سردار تو نہیں ہیں، وہاں پر ترقی نہیں ہوئی۔ چلیں اس کو بھی چھوڑیں، یہ جو رحیم یار خان میں غربت ہے یا کراچی کی کچی آبادیوں میں یا حیدرآباد میں یا سندھ کے دیہی علاقوں میں غربت ہے، اس کے بھی ذمہ دار بلوچ سردار ہیں؟ یہ بہانے ساز کرتے ہیں۔ یعنی ناقص کارکردگی ہمیشہ اپنے اوزار کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ جب ان کو اپنی حماقتوں، نااہلیوں اور کرپشن کو چھپانے کے لیے کوئی اور عذر نہیں ملتا تو وہ بلوچ سرداروں کو دوشی ٹھہراتے ہیں۔ یعنی واقعی سندھ اور کراچی میں جو غربت ہے اس کے لیے بھی بلوچ سرداروں کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے؟ یا وہ سردار جو حکومت کے ساتھ ہیں؟

اب حال یہ ہے کہ خاران کے نواب نوشیروانی نے بلوچستان ہائی کورٹ میں ایک رٹ دائر کی ہے کہ پاکستانی حکومت ابوظہبی کے شیخ زید بن النیہان کو اجازت دے کہ وہ واشک اور خاران میں آ کر تلور کا شکار کریں۔ وہ جب شکار کے لیے آتے ہیں تو ان کے اہلکار چوکیاں قائم کرتے ہیں اور وہاں کے کسان نہ کاریز استعمال کر سکتے ہیں نہ اپنی زمینوں پر جا سکتے ہیں۔ یہ تو حال ہے ان سرداروں کا جنہوں نے 1948ء میں، خاران اور مکران کے نوابوں نے سب سے پہلے پاکستان کے ساتھ الحاق کے کاغذات پر دستخط کیے تھے۔ اور اسی کو بنیاد بنا کر جناح نے پھر زبردستی احمد یار خان سے دستخط کروائے تھے۔ تو وہ لوگ جنہوں نے ان کی خدمت کی، ان کی حالت یہ ہے کہ انہیں بلوچستان ہائی کورٹ میں رٹ دائر کرنی پڑتی ہے کہ عرب جو یہاں آتے ہیں وہ ہمیں جینے نہیں

دیتے، وہ اپنی من مانی کرتے ہیں اور ہم بے بس ہیں۔ اس میں بھی سرداروں کا گناہ ہے؟

آپ اس نقشے پر نظر ڈالیں، پاکستان حکومت نے عرب حاکموں کو 30 پرمٹ دیے ہیں، وہ بلوچستان میں کس طریقے سے کتنے بڑے علاقوں میں کہاں کہاں شکار کرتے ہیں۔ اسے بھی بلوچ سرداروں کے گناہوں میں شمار کیا جائے؟ سب سے آسان طریقہ یہی ہے دوسروں پہ الزام لگا دو۔ اصل بات یہ ہے کہ سرکاری بیانیہ اتنا بااثر رہا ہے کہ لوگ واقعی یہ مانتے ہیں کہ بلوچستان میں جو بھی خرابیاں ہیں، جو بھی بدکاریاں ہیں وہ سرداروں کی وجہ سے ہیں۔ یہ سرکاری بیانیہ ہے۔ ساری کتابیں انہوں نے چھاپی ہیں، بچوں کو انہوں نے پڑھایا ہے، گزشتہ 65 سال سے جو کچھ بھی بچے پڑھے ہیں۔ انہی کے پاس ریڈیو رہا، انہی کے پاس ٹیلی وژن رہا، انہی کے پاس سب چیزیں رہیں، آج بھی ہیں۔

جو متبادل نقطہ نظر ہے اسے شاذ و نادر ہی پیش کیا جاتا ہے۔ مجھے کتنے لوگ پڑھتے ہوں گے؟ میں جو اتنا واویلا مچاتا ہوں، لکھتا ہوں، مجھے کتنے لوگ پڑھتے ہوں گے؟ 2000، 4000، 5000، 10000، 20000، یہ بہت زیادہ بتا رہا ہوں۔ کیوں کہ یہ انٹرنیٹ پر جاتا ہے، وہاں کتنے لوگ اسے پڑھتے اور کتنے لوگ اسے پھیلاتے ہیں۔ لیکن ان کے بیانیے کا ایک تسلسل ہے کہ یہ سرداروں کی غلطی ہے، سرداروں نے یہ سب کام خراب کیے ہیں اور ہم پاک وصاف ہیں۔

گل آور خان: سر، پھر اگر ہم دیکھتے ہیں جیسا کہ باقی ماندہ پاکستان ہے، جو ترقی یافتہ علاقے ہیں، اگر بلوچ معاشرہ یا بلوچستان علاقائی طور پر اُس طرح سے ترقی یافتہ ہوتا، سڑکیں، اسپتال، کالج وغیرہ ہوتے تو کیا بلوچ پھر بھی اسی جگہ پہ ہوتا جہاں وہ آج ہے یا تھوڑی بہت تبدیلی ہوتی؟ اگر وہ وفاقی نظام نافذ کرتے، جو 1940ء کو ایک قرارداد پاس کی گئی تھی، کہ یہ چار چیزیں مرکز کے پاس ہوں گی، باقی سب یونٹس کو دی جائیں گی؟

میر محمد علی ٹالپر: اصل میں یہ ایک فرضی سوال ہے کہ ''اگر ایسا ہوتا؟'' اصل میں بات یہ ہے کہ انہیں یہ کرنا ہی نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ ان کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ اگر ارادہ ہوتا تو وہ کر لیتے، کچھ تو وہ کر لیتے۔ آپ اگر ہیومن ڈیولپمنٹ انڈیکس پر نظر ڈالیں تو پاکستان میں جو سب

سے زیادہ پچھڑے اضلاع ہیں، وہ سب بلوچستان میں ہیں۔ آپ کوئٹہ کو اس میں سے نکال دیں کیوں کہ وہ تو چھاؤنی کا شہر ہے۔ انہوں نے پیسے دینے کے لیے جو بے نظیر انکم سپورٹ سکیم بنائی ہے، ان کے سروے کے مطابق، اور وہ غیر جانبدار نہیں ہیں، جانب دار ہیں، وہی کہتے ہیں کہ 66 فیصد خاندان ایسے ہیں کہ جنہیں یہ مدد ملنی چاہیے۔ اور میں کہتا ہوں کہ یہ انہوں نے کم بتایا ہوگا۔

ان 65 سالوں میں، تمام علاقوں میں تو جنگ نہیں تھی۔ مثلاً مکران میں آج سے پہلے کوئی جنگ نہیں تھی۔ وہ لوگ جو اِس وقت تربت یا مند اور پورے علاقے میں لڑ رہے ہیں، یہ تب تو نہیں تھی۔ وہاں انہوں نے کیا کیا؟ ان کو کرنا ہی نہیں تھا۔ حامد میر پروگرام میں دے رہے تھے کہ مستونگ وغیرہ میں یونیورسٹیوں کی تعمیر کے منصوبے تھے، انہوں نے اسے سنسر کیا تھا۔ کم از کم حیدرآباد میں سنسر کیا تھا، حامد میر کا پروگرام جو پرسوں یہاں چل رہا تھا، وہ یہاں پر کیبل 'نوسگنل' دے رہا تھا۔ اشتہار کے دوران جیو ٹی وی چینل بالکل ٹھیک چل رہا تھا لیکن جب بات کرنا شروع کرتے تو 'نوسگنل' آجاتا تھا۔ وہاں پر بچے کہہ رہے تھے کہ یہاں پر خوف کا عالم طاری ہے۔ استاد کہہ رہے تھے کہ جنریٹرز کام نہیں کرتے، بجلی نہیں ہے ہمارے پاس۔ یہ تو صورتحال اس علاقے کی ہے جہاں رئیسانی رہتے ہیں۔

گل آور خان: سر، تو پھر ان حالات میں کہ ایک طرف بلوچ قوم پرستی ہے اور دوسری طرف پاکستانی وفاق ہے، ایک بداعتمادی بھی پائی جاتی ہے (میر محمد علی ٹالپر: بالکل ہے، بداعتمادی کا ایک نہ پُر ہونے والا خلا ہے) تو آپ بلوچ قوم پرستی اور پاکستان کا مستقبل کیسے دیکھتے ہیں؟ اگر میں سوال کچھ اس طرح سے کرلوں کہ وفاق مضبوط ہے، اس کے پاس فوج ہے اور سب کچھ ہے، اور بلوچ منقسم ہیں، تو آپ خاص طور پر بلوچ قوم پرستی اور وفاق پاکستان کا مستقبل کیسے دیکھتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: سر، اب وفاق میں مذہب کا جو عنصر متعارف کرایا گیا ہے، اور جس طرح سے مذہبی انتہا پسندی ظاہر ہو رہی ہے یہ کسی بھی طرح سے وفاق کی تقویت کا باعث نہیں بن سکتی۔ کیوں کہ طاقت کے اتنے سارے مراکز انہوں نے خود بنا دیے ہیں کہ، یعنی یہ سب

طاقت کے مراکز ہیں: مثلاً طالبان ہیں، لشکر جھنگوی ہے، ایم کیو ایم (مہاجر/متحدہ قومومنٹ) ہے یا دیگر جو انہوں نے طاقت کے مراکز بنا رکھے ہیں۔ اور جب کسی بھی علاقے میں، کسی گھر میں یا ملک میں، ملک تو خیر اس کو کہنا زیادتی ہے چونکہ ایک ملک کی اپنی خاص معیار ہائے اہلیت ہوتی ہیں، لیکن خیر اگر بالفرض محال اس کو ملک کہا بھی جائے یا ریاست کہا جائے تو جس میں اتنے سارے طاقت کے مراکز ہوں اور اس میں توڑنے والی اتنی کشش ہو تو میرا خیال ہے کہ اس کے لیے قائم رہنا بہت مشکل ہے۔

اور بلوچ قوم پرستی بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ یعنی یہاں پر جو جدوجہد ہے۔ اور بلوچ قوم پرستی کو آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک ترقی پذیر قوت ہے۔ اس میں اب زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہو رہے ہیں، حصہ لے رہے ہیں۔ آپ نے خود دیکھا ہے کہ 2005 سے لے کر اب تک یہ چیز بڑھی ہے، کم نہیں ہوئی ہے۔

مثلاً یہاں 10 فروری کو کراچی میں بلوچ نیشنل فرنٹ نے ایک جلوس نکالا تھا، اس میں 15 سے 20 میٹر لمبا بلوچستان کا ایک جھنڈا لوگ اٹھائے ہوئے تھے۔ پلے کارڈز پر سیدھے سادے نعرے تھے کہ 'ہم آزادی چاہتے ہیں' اور اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس جلوس میں بلوچ خواتین کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ بلوچ قوم پرستی کی نوعیت اب تبدیل ہوئی ہے کہ کراچی میں لوگ، اس سے قطع نظر کہ انہیں کیا بھگتنا پڑے گا، وہ آزادی کی بات کرتے ہیں، آزادی کا جلوس نکالتے ہیں، اتنا بڑا جھنڈا لے کر ساتھ چلتے ہیں۔ تو میرا خیال ہے کہ بلوچ قوم پرستی آہستہ آہستہ تقویت حاصل کر رہی ہے۔ اور کچھ نہیں تو، جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ، یہ مخاصمت کی ایک طویل جنگ ہوگی۔

اب اس میں ایک اور بھی عنصر ہے۔ بلوچستان اب صرف اس خطے تک محدود نہیں رہا۔ اب باہر کے ممالک بھی اس کو سمجھتے ہیں، دیکھتے ہیں، اس کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ میں رورا بیکر (امریکی سینیٹر) کی تقاریر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن بہرحال یہ اس کا حصہ تو ہیں۔ یا حال ہی میں یو این پی او (اَن ری پریزینٹڈ نیشنز اینڈ پیپلز آرگنائزیشن) کی لندن کانفرنس ہوئی تھی۔ تو

یہ سب حصہ ہیں اور یہ بلوچ قومی تحریک کی تقویت کے آثار ہیں۔

گل آور خان: میر صاحب، آپ نے ایک لفظ استعمال کیا، میں لفظ کی بات نہیں کر رہا ہوں مگر عموماً بلوچ نیشنلزم کے اندر رہتے ہوئے آزادی، کشمیر والے بھی کہتے ہیں ''ہمیں آزادی چاہیے''، ''بلوچستان کی آزادی''، کیا آزادی؟ وسائل پر کنٹرول؟ ساحل پر کنٹرول؟ اپنی زمین پر رہتے ہوئے اپنے معاملات پر کنٹرول؟ یا ''آزادی'' سے مراد ایک مکمل طور پر آزاد اور خودمختار ملک ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: میرے خیال میں وہ ایک آزاد خودمختار ملک ہی چاہتے ہیں۔

گل آور خان: تو پھر میر صاحب، اس تناظر میں، ایک طرف سے ایران، سیستان و بلوچستان کے علاقے، ایک طرف سے ہلمند نمروز افغانستان کے علاقے، اور پھر بلوچ خود بھی، جیسا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ آپ لوگ یہاں پر تین سو سالوں سے ہیں، بہت سارے بلوچ اور بھی ہیں سندھ میں، پنجاب میں بھی ہیں، حتیٰ کہ سرحد میں بھی ہیں، تو بلوچ مزید منقسم ہوگا۔ اور اگر ایک آزاد بلوچستان بنتا ہے تو پھر دو ریاستیں (ایران اور افغانستان) وہ ہیں، اور تیسری ریاست یہ ہوگی جو کہ ایک دشمن ریاست ہی ہوگی، اگر آزاد بلوچستان بن جاتا ہے، تو ان کے درمیان ایک بلوچ ریاست کا قائم رہنا اور اس کا مستقبل آپ کیا دیکھتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: اصل میں یہ سوال عطاءاللہ مینگل نے بھی اٹھایا تھا۔ آپ کو شاید یاد ہوگا؟ (گل آور خان: جی ہاں، مجھے یاد ہے۔) انہوں نے کہا تھا کہ ''وہ جو آزاد بلوچستان کی بات کرتے ہیں اگر آزاد ہوئے بھی تو کیا وہ اپنی آزادی سنبھال سکیں گے؟'' میری ناقص رائے یہ ہے کہ ''جب پل کو پہنچیں گے تو تب ہم اس پل کو پار کرنے کی سوچیں گے۔'' ہم پل کو پہنچے نہیں ہیں پہلے ہی سے اپنے لیے ذہنی رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں کہ بھائی یہ ہوگا وہ ہوگا، ایسے ہوگا، ویسے ہوگا۔

آپ اندازہ کریں کہ جب 1971ء میں برطانیہ نے دبئی کو اپنی پروٹیکٹوریٹ سے نکالا تھا،

آپ کیا سمجھتے ہیں کہ دبئی کیسا تھا؟ دبئی میں ہندوستانی کرنسی چلتی تھی اور ریت کے ٹیلے تھے اور کچھ چھوٹی موٹی عمارتیں تھیں۔ آج دبئی ایک بین الاقوامی شہر ہے اور امارات عالمی معیشت میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایران نہیں چاہتا تھا کہ یہ سب ہو۔ وہ کہتا تھا کہ یہ علاقے میرے ہیں۔ آپ کی شاید عمر کم ہو لیکن ایران اس بات پر رضامند نہیں تھا، وہ کہتا تھا کہ یہ حصے میرے ہیں۔ ایران کو بھی خطرہ تھا۔

اگر بلوچستان، بالفرض محال اور میرا خیال ہے کہ بلوچ اسی طرف گامزن ہیں، آزاد ہو جاتا ہے تو آپ سمجھتے ہیں کہ بلوچستان کے لوگوں میں یا بلوچستان کے ذرائع اور وسائل میں اس قدر قوت نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال سکیں؟ میرا خیال ہے سنبھال لیں گے اور بڑھ سکیں گے اور اپنی حفاظت بھی کر سکیں گے۔ اور اس بات سے میں انکار نہیں کرتا کہ رئیسانی اور بہت سارے ایسے لوگ ہیں جو اس کی مخالفت میں ہیں۔ مثلاً شفیق مینگل یا نصیر مینگل والے ہیں جنہوں نے ان کے خلاف ڈیتھ اسکواڈ بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن میری رائے میں بہت سے بلوچ ایسے بھی ہیں جو باڑ پر بیٹھے ہیں، اور دیکھ رہے ہیں اور وہ بجائے اُن کی طرف جانے کے اِسی طرف آئیں گے۔

گل آور خان: میر صاحب، 1948ء میں یہ سلسلہ شروع ہوا ہے، اور لوگ کہتے ہیں کہ (پاکستان کے آئین کی) اٹھارویں ترمیم بھی بلوچوں کے درد کو کم کرنے کے لیے، ان کی شکایات دور کرنے کے لیے ایک قدم ہے۔ تو اس کے بعد بھی آپ سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں بلوچستان یا بلوچ اٹھارویں ترمیم کو لے کر یہ سمجھ لیں گے کہ اب ہمارا افاقہ ہو گیا ہے یا پھر...؟

میر محمد علی ٹالپر: صرف اٹھارویں ترمیم نہیں، این ایف سی (نیشنل فنانس کمیشن) ایوارڈ بھی ہے جو کہ گیلانی (پاکستانی وزیراعظم) نے گوادر میں ایک جہاز پر جا کر بڑے دھوم دھام سے دستخط کیے تھے۔ حال یہ ہے کہ اٹھارویں ترمیم کے بعد بھی، جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا کہ گوادر پورٹ کو یہ لوگ چین کو اٹھا کر دے دیتے ہیں تو اس سے کیا بلوچ راضی ہوگا اور یہی سمجھے گا کہ مجھے مل گیا ہے یا جن کے پاس تھا ویسے کے ویسے حالات ہیں؟ یہ سب صرف زبانی جمع خرچ ہے۔

اٹھارویں ترمیم یا آغاز حقوق بلوچستان پیکیج، یا این ایف سی ایوارڈ، یا زرداری کا بلوچوں سے معافی مانگنا۔ زبانی جمع خرچ سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ جو زمینی حقائق ہیں، آپ کوئٹہ میں تھے آپ کو پتہ ہے کہ کوئٹہ کے حالات کیا ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں، آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ میں تو صرف ایک آدھ دفعہ کوئٹہ سے گزرا ہوں لیکن وہاں ٹھہرا نہیں۔ تو کوئٹہ کے حالات اگر ایسے ہیں، خوف و ہراس ہے۔ جیسا کہ حامد میر کے پروگرام میں طالب علم کہہ رہا تھا کہ ہمیں خوف و ہراس رہتا ہے ہم اس میں کیا تعلیم حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ میں رئیسانی کے علاقے مستونگ کی بات کر رہا ہوں۔

بلوچستان میں ایف سی، کوسٹ گارڈز، لیویز اور فوج کی ہزارہا چوکیاں بنی ہوئی ہیں جو پورے بلوچستان میں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ ایک محاصرہ ہے۔ یعنی آپ اٹھارویں ترمیم، این ایف سی ایوارڈ اور آغاز حقوق کی باتیں تو کر لیتے ہیں لیکن بلوچستان محاصرے میں ہے۔ اور وہ لوگ جو محاصرے میں ہوں وہ این ایف سی، اٹھارویں ترمیم، یا پاکستانی حکمران یا اہلکار جو بھی باتیں کرتے ہیں، انہیں کیا سمجھیں گے؟ میرے خیال میں ان کے لیے یہ سب بے معنی سی باتیں ہیں۔

گل آور خان: ایک مختلف زاویے سے یہ بھی کہا جاتا ہے، بلوچستان پر جو تحقیق ہوئی ہے، یا لوگ جو بات کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ بلوچ قوم پرستی پاکستان کے غیر جمہوری رویے اور بلوچستان کی معاشی و معاشرتی ناانصافیوں کا ایک ردِعمل اور پیداوار ہے۔ اور کچھ بلوچ قوم پرستوں کا کہنا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ پاکستان کو بلوچ کی سرزمین اور وسائل چاہئیں بلوچ نہیں۔ تو اس بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: پہلا سوال کیا تھا؟

گل آور خان: بلوچ قوم پرستی پاکستان کے رویے کے ردِعمل میں پیدا ہوئی ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: نہیں، میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ بلوچ قوم پرستی اس کے ردِعمل کی پیداوار نہیں ہے، کیونکہ بلوچ آزاد تھا اور بلوچ اپنے آپ کو آزاد سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے خان کلات نے پاکستان بننے سے پہلے جو اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ اور معاہدے کیے تھے، وہ

کوئی ردِعمل نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک آزاد ریاست اور ملک سمجھتے تھے۔ لہٰذا، یہ اس کے ردِعمل کے طور پر نہیں ہے۔ یہ جو قوم پرستی ہے یہ اسی قوم پرستی کا ایک تسلسل ہے۔ یہ نصیر خان نوری والی قوم پرستی ہے یا دوست محمد (مغربی/ایرانی بلوچستان کے آخری حکمران) والی ہے۔ یا بلوچ سرداروں کی اپنی، ہر علاقے کے اپنے، مثلاً مری سردار خان کلات بیگلر بیگی کو فرماں روا مانتا تھا لیکن وہ اپنے علاقے کا حاکم تھا۔ بگٹی والے اپنے علاقے میں حاکم تھے۔ تو یہ اسی قوم پرستی کا ایک تسلسل ہے۔ لیکن وہ قوم پرستی مری، بگٹی، بنگلزئی اور دوسروں کی قوم پرستی سے اب بڑھ کر تقلیمی شکل اختیار کر کے بلوچ قوم پرستی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یہ قبائلی قوم پرستی سے بلوچ قوم پرستی میں تبدیل ہو چکی ہے۔

کیوں کہ مریوں نے انگریزوں کی مخالفت کی۔ انہوں نے چار پانچ جنگیں لڑیں۔ 1917ء میں بھی آخری جنگ لڑی۔ 1843ء سے پہلے بھی لڑی ہیں، سارتاف اور نفسک کی جنگیں۔ بگٹی لڑے ہیں، بروہی قبائل لڑے ہیں۔ تو میرا خیال ہے کہ یہ پاکستانی جبر کا ردِعمل نہیں ہے۔ یقینی طور پر پاکستان کے بننے بعد یہ عنصر بھی شامل ہوا ہے لیکن بلوچ قوم پرستی بہت پرانی ہے۔

میر محمد علی ٹالپر: اور دوسرا سوال کیا تھا؟

گل آور خان: بلوچ قوم پرستوں کا کہنا ہے کہ پاکستان کو بلوچ زمین اور وسائل چاہئیں نہ کہ بلوچ۔

میر محمد علی ٹالپر: جی ہاں۔ اس بات سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ آپ یوں اندازہ لگا سکتے ہیں کہ، میں آپ کو دوبارہ 1971ء میں واپس لے جاتا ہوں۔ آپ بنگال کی مثال لے لیں۔ آج تک جو بنگال کے بارے میں روتے ہیں، کسی بھی پاکستانی دانشور کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ بھئی وہاں پر لاکھوں لوگوں کی بے حرمتی ہوئی، لاکھوں لوگ مارے گئے، لاکھوں لوگوں کی زندگیاں وہاں الٹ پلٹ ہوئیں، اس کے بارے میں کبھی بات نہیں کرتے، بس کہتے ہیں کہ ''ہم سے بنگلہ دیش چلا گیا۔'' وہ اسے ایک ریئل اسٹیٹ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ انہوں نے بنگلہ دیشیوں کو بحیثیت انسان اور بنگالی قوم کے دیکھا ہی نہیں؛ ان کو تو وہ صرف

زمین کا ایک ٹکڑا نظر آتا ہے، آج تک۔ تب بھی یہی نظر آتا تھا، آج بھی یہی نظر آتا ہے۔

یہاں پر بھی یہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو، جس اصول کے تحت برطانیہ نے جا کر آسٹریلیا پر قبضہ کیا تھا، جسے 'ٹیرانلیئس' کہتے ہیں... یعنی کہ یہ غیر آباد زمین ہے۔ برطانیہ نے کہا کہ یہ ایک غیر آباد علاقہ ہے؛ یہ جو ٹیرانلیئس کا اصول یا طریق مسئلہ یا نظریہ ہے یہ لوگوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ یعنی کہ لوگ تو کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہمیں صرف زمین چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عرب امارات کے حاکموں کو اس طرح کیسے اجازت دے دیتے کہ وہ واشک اور خاران میں جا کر اس طرح سے پڑاؤ ڈالیں اور لوگوں کو وہاں پر ہاتھ پیر بھی مارنے نہ دیں؟

سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو بھی ذرائع ہیں، جو بھی وسائل ہیں، یا گوادر ہے، کس کی بہبود کے لیے انہوں نے کوششیں کی ہیں؟ انہوں نے اپنے ہی لیے کی ہیں۔ یا اورماڑہ میں بڑی بندرگاہ بنائی ہوئی ہے؟ یا سومیانی کے قریب خورکلمت میں وہ جو نیا نیول بیس بنا رہے ہیں؟ اس بات سے آپ اندازہ کریں کہ گوادر میں 2007 یا 08 میں بلوچ قوم پرستوں نے پاکستان بحریہ کی لانچیں جلائی تھیں۔ کیوں جلائی تھیں؟ کیوں کہ نیوی والوں نے بلوچ مچھیروں کی کشتیاں توڑ پھوڑ دی تھیں۔ کیوں توڑیں؟ کیونکہ جہاں کہیں بھی نیوی بیٹھتی ہے، انہوں نے وہاں پر وقت مقرر کر رکھا ہے، یعنی اس وقت سے لے کر اس وقت تک مچھیرے مچھلیاں پکڑ سکتے ہیں باقی پھر پابندی ہے۔ تو پھر کیا یہ لوگ وہاں پر بلوچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بیٹھے ہیں یا اپنے مفادات و مقصد کے لیے بیٹھے ہیں؟ یا پھر سوئی کا گیس کوئٹہ کب پہنچا؟ (گل آور خان: 80ء کی دہائی میں۔) اس زمانے میں کسی نے مجھ سے کہا کہ 'مبارک ہو گیس کوئٹہ پہنچ گئی ہے۔' تو میں نے کہا کہ بھئی ہم سوئی گیس کو جلانے کا حق نہیں مانگتے ہیں کہ ہمیں جلانے دیا جائے، ہم کہتے ہیں کہ یہ ہمارا ہے، ہم جیسے استعمال کرنا چاہیں ہماری مرضی سے استعمال ہو۔

بلوچستان ان کو صرف اور صرف اس لیے عزیز ہے کہ: ایک تو اس کا خطہ بہت بڑا ہے، ان کی نوآبادیات کو بحال رکھنے کے لیے اور اس میں اتنے ذخائر اور وسائل ہیں کہ اس سے وہ اپنے لوگوں کو مزید آسودہ کر سکیں۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس بات پر کوئی

تضاد ہو ہی نہیں سکتا جو مثالیں میں نے دی ہیں، سوئی گیس کو کب کوئٹہ میں استعمال کیا، یا جو بحری اڈے ہیں، وہ کس طرح لوگوں پر پابندیاں لگاتے ہیں، یا آج 2013ء میں بھی دبئی کے امیر واشک اور خاران میں آ کر ایسے کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے جو میرانی ڈیم بنایا تھا، وہ اس لیے بنایا تھا کہ وہ وہاں پر سعودیوں کو زمینیں دے رہے تھے۔ آپ کو شاید یاد نہ ہو کہ دو سال قبل اسلم بھوتانی نے بلوچستان ہائی کورٹ میں ایک درخواست دائر کی تھی کہ وفاق کو روکا جائے کہ وہ لسبیلہ میں عرب شیخوں کو 70,000 ایکڑ کی زمینیں دے رہے تھے۔ وہ کون سا ایئر بیس تھا جو متحدہ عرب امارات نے ڈرون کارروائیوں کے لیے امریکیوں کو دے رکھا تھا؟ (گل آور خان: شمسی [شمشی] ائربیس یا کچھ ایسا ہی نام تھا۔) یہ جیکب آباد والا نہیں، بلوچستان (افغان سرحد) کے قریب والا۔ یہ ان کے شکار کے لیے بنایا گیا تھا۔ تو انہیں زمین چاہیے، انہیں لوگوں سے تو کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

گل آور خان: تو پھر میر صاحب، جب ہم دنیا بھر میں تنازعات کو دیکھتے ہیں، جیسے کیوبک کا ہے، کیٹالونیا کا ہے، (میر محمد علی ٹالپر: کورسیکا کا ہے، باسک کا ہے۔) تو دنیا میں آج متحدہ ریاست کے اندر جو بن رہی ہیں، جیسا کہ افغانستان کے بارے میں سوچا جا رہا ہے کہ ایک وفاقی طرزِ حکومت ہو، ہم عراق کے بارے میں بھی یہی سنتے ہیں۔ تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ بلوچ کا مسئلہ، کس طرح کا وفاق ہو، جیسے یوروپین یونین بن رہی ہے، کئی ممالک اکٹھے ہو رہے ہیں دوبارہ، قومیں ہیں، ممالک ہیں لیکن اکٹھے ہو رہے ہیں، تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ بلوچ کس طرح سے وفاق کا حصہ رہنا چاہے گا؟

میر محمد علی ٹالپر: سائیں، اصل میں بات یہ ہے کہ، وہ اردو میں کہتے ہیں کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اس کے لیے یہ دونوں اطراف سے ایک بڑی فہم و فراست کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ 1945ء تک فرانس اور جرمنی کس قدر ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ فرانس پر جرمنی نے قبضہ کیا تھا۔ یا پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ کے دوران جرمنی اور برطانیہ کے درمیان یا اس سے پہلے کے جو تضادات رہے ہیں، افریقہ میں کالونیوں پر،

وہ سب چیزیں کیسے جا کر آخر ختم ہوئیں؟ وہ اس وقت ختم ہوئیں جب دونوں نے اس بات کا اندازہ کرلیا یا سمجھ لیا کہ یہ جو ہمارا تضاد ہے یہ ہمیں کہیں پر نہیں لے جائے گا۔ اگر ہمیں جینا ہے، آگے بڑھنا ہے تو ہمیں اسے مل جل کر ساتھ بیٹھ کر حل کرنا ہے۔ اب نہ فرانس کی حاکمیت ہے، کہ وہ کہے میں حاکم ہوں، یا جرمن کہے کہ میں حاکم ہوں، وہ بھائی ہیں آپس میں۔ یہ تب ہوسکا جب انہوں نے سوچا کہ ہم بھائی ہیں۔

اور یہاں پر آپ سمجھتے ہیں کہ... جنرل کیانی نے کچھ عرصہ قبل ایک بیان دیا تھا، میں نے اس پر آرٹیکل بھی لکھا تھا، 'ایسے بھی بلوچ ہیں جنہوں نے دس روپے کا نوٹ نہیں دیکھا ہے۔' میں نے کہا بھئی کس دنیا میں رہتے ہو؟ آپ ایک سرپرستانہ رویہ اپناتے ہیں، کہ یہ تو جانور ہیں ہم انہیں انسان بنائیں گے۔ کب بنیں گے انسان یہ؟ کہ 'ہم انہیں انسان بنائیں گے جب ہمیں انہیں دس روپے کا نوٹ دکھائیں گے تب جا کے یہ انسان بنیں گے۔' یہ جو سارا ان کا رویہ ہے یہ متکبرانہ ہے؛ طاقت کی بنیاد پر تکبر۔ یعنی یہ لوگ اپنی قوت پر نازاں ہیں: 'ہمارے پاس فوج ہے اور ہم بڑے بہادر ہیں، اور ہم مارشل نسلیں ہیں۔' یعنی جو انگریزوں نے انہیں مارشل نسلیں بنا دیا۔

یہاں پر انہیں اپنا رویہ تبدیل کرنا ہی نہیں تھا۔ پہلے دن سے ان کو اجازت تھی اگر وہ چاہتے تو بلوچستان کی آزادی کو برداشت کرتے... خان کلات کی جناح کے ساتھ ایک خاص دوستی تھی۔ جناح کی جتنی مدد خان کلات نے کی اتنی شاید بہت کم لوگوں نے کی ہو۔ اور جناح تو ان کا وکیل بھی تھا۔ اگر وفاق ہی بنانا تھا تو تب بناتے، بنا سکتے تھے، بنانا ہی نہیں تھا۔ آج بھی نہیں بناتے۔

گل آور خان: پھر سر، اگر ہم بین الاقوامی سیاست یا بلوچستان کے جغرافیائی محل وقوع کو دیکھتے ہیں تو، جیسے کہا جاتا ہے کہ جبری الحاق ہوا ہے کلات کا، اگر اس تناظر میں دیکھا جائے کہ عالمی طاقتیں تھیں، جو جانے والی تھیں، شاید وہ بھی نہیں چاہ رہی تھیں کہ بلوچستان آزاد ہو اور روسی اثر ورسوخ ہو، گرم پانیوں تک ان کی رسائی ہو، اس حوالے سے آپ کیا کہتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں، 1947ء کے زمانے کے سیاسی شعور اور آج کے سیاسی شعور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس نے ایک طویل سفر طے کیا

ہے۔ اس وقت کی عالمی طاقتوں کو اس میں اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ میری رائے ہے۔ اس کے برعکس اس دور کے مقابلے میں آج وہ بلوچستان میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

آج اس دلچسپی کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ اگر بلوچستان میں بھی بنیاد پرستی قابض آجاتی ہے، جس طریقے سے پاکستان کے باقی حصوں میں بنیاد پرستی میں اضافہ ہو رہا ہے، اگر بلوچستان میں بنیاد پرستی قابض ہو جاتی ہے تو یہ ان کے لیے اور سب کے لیے، یہ عالمی امن اور علاقائی امن کے لیے ایک بڑا خطرہ ثابت ہوسکتا ہے۔ تو بلوچ قوم پرست قوت جو ہے وہ ایک سیکولر قوت ہے۔ اس کی نظریاتی اساس سیکولر اصولوں پر مبنی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ سیکولرازم کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ ڈیتھ اسکواڈز جو شفیق مینگل اور سراج رئیسانی والوں نے بنائے ہوئے ہیں، انہوں نے یہ ڈیتھ اسکواڈ اسلام کی بنیاد پر بنائے ہوئے ہیں۔ ابھی جو لندن میں یو این پی او کی طرف سے بلوچ کانفرنس ہوئی تھی تو تنظیم نفاذ امن بلوچستان (ٹی این اے بی) کے ترجمان نے غازی بلوچ کے نام سے اخبار میں دھمکی دی تھی کہ جنہوں نے بھی وہاں شرکت کی ہم ان کو ماریں گے اور جہنم رسید کریں گے۔

تو میرا خیال ہے کہ آج کی دنیا بلوچستان کو ایک مختلف زاویے سے دیکھتی ہے۔ خاص طور سے اس علاقے کی اور پاکستان کی جو بنیاد پرستی ہے، اس کی بڑی اہمیت ہے آج۔ میں نے اپنے مضامین میں لکھا ہے کہ آج کی جو مغربی عالمی طاقتیں ہیں وہ اس بات سے نہیں ڈرتیں کہ ایٹمی ہتھیار غلط ہاتھوں میں چلے جائیں گے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ ہتھیار پہلے سے ہی غلط ہاتھوں میں ہیں۔ بنیاد پرستی کی جو یہ ساری کارروائی ہے یہ پاکستانی ریاست اور پاکستانی فوج سے الگ نہیں ہے۔ اتنا تو سب سمجھتے ہیں۔ یہ ان کے اسٹریٹجک اثاثے تھے جو انہوں نے کشمیر میں اور افغانستان میں استعمال کیے، آج بھی افغانستان میں استعمال ہو رہے ہیں۔

بہرحال وہ بلوچستان کے مسئلے کو مکمل طور پر ایک مختلف انداز میں دیکھتے ہیں، جس انداز میں وہ اسے 1947ء میں دیکھتے تھے۔ یعنی کہ عالمی طاقتوں کا جو رویہ تھا وہ لاتعلقی کا تھا۔ 1947ء اور 1948ء میں عالمی طاقتیں لاتعلق تھیں۔ وہ ان کے فیصلے میں ملوث نہیں تھے کہ یہ روسی اثر ورسوخ

میں آجائے گا۔ یہ ان کے قریب تھے۔ ایک طرف پاکستان تھا، ایک طرف ایران تھا اور ایک طرف سمندر تھا۔ تو کس طریقے سے...خان کلات کی ایک طرح سے بادشاہت تھی۔ یہاں خان ایک بادشاہ کی حیثیت کے ساتھ تھا۔ تو اس سے ان کو کیسے خطرہ ہوتا کہ وہ یکسر تبدیل ہو کر روس کی طرف چلا جائے گا؟ تو وہ اس وقت لاتعلق تھے لیکن آج وہ لاتعلق نہیں ہیں۔

گل آور خان: سر، آخر میں کوئی چیز ایسی جس کا آپ اضافہ کرنا چاہیں؟ کوئی چیز جو آپ سمجھ رہے ہیں کہ ایسی رہ گئی ہے شامل ہو؟

میر محمد علی ٹالپر: سائیں، میرا خیال ہے کہ آپ کی تحقیق میں آپ کو اس بات پر اہمیت دینی چاہیے، میں نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ آپ کو بلا حجاب وہ باتیں کہوں، یعنی بلوچ کے مسئلے کو ایک صحیح صورت میں پیش کیا جائے تا کہ لوگ سمجھیں کہ بلوچ کیا چاہتے ہیں۔ کیونکہ بلوچوں کے بیانیے کی نمائندگی آج تک صحیح طریقے سے ہوئی نہیں۔ ہم بلوچوں کے ساتھ حادثہ یہ ہے کہ مقامی پریس میں تو شاید دوست اس کے بارے میں لکھتے ہیں لیکن بین الاقوامی پریس میں یہ بہت کم جاتا ہے۔

میرے لکھنے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جو بلوچ نقطہء نگاہ ہے لوگوں تک پہنچے، لوگ سمجھیں اور کم از کم انہیں معلوم ہو کہ مسئلہ کیا ہے۔ تو آپ پر بھی یہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ آپ اس کو اس طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کریں۔ اور ہم مستقبل میں بھی رابطے میں رہیں گے۔

گل آور خان: انشااللہ۔ بڑی مہربانی صاحب۔

میر محمد علی ٹالپر: اللہ سلامت رکھے آپ کو۔

بشکریہ: نیکڈ پنچ ڈاٹ کام

تاریخ اشاعت: 6 دسمبر 2015

http://nakedpunch.com/articles/242

کسی بھاری قیمت کی ادائیگی کچھ نہیں

گزشتہ 64 سالوں سے بلوچ حقوق کی پامالی سزا سے مستثنیٰ رہی ہے۔ اس زخم پر توہین کی کاری ضرب لگانے کے لیے عرب شیوخ بھی اپنی سالانہ پکنک کے دوران بلوچستان میں آزادی سے بلوچ حقوق کو روندتے چلے آرہے ہیں۔ نواب خاران امیر حبیب اللہ خان نوشیروانی (1911 تا 1955) کے قانونی ورثا نے بلوچستان ہائی کورٹ میں خاران اور واشک کے اضلاع میں شکار کے علاقوں کی الاٹمنٹ پر متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ خلیفہ بن زید کے خلاف آئینی درخواست دائر کی ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی زرعی زمینوں، جنگلات، پانی کے گزرگاہ، چشموں، کاریزوں، پھلوں کے باغات اور چراگاہوں، جو کہ ایک وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں، کسی مشاورت یا اجازت کے بغیر ان کی متحدہ عرب امارات کے صدر کو شکار کے لیے غیر قانونی الاٹمنٹ کے خلاف استدعا کی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ ہر سال متحدہ عرب امارات کے صدر کا عملہ شکار کی چوکیاں قائم کرتے ہیں اور اپنی گاڑیوں پر علاقے میں گشت کرتے ہیں، یہاں تک کہ زمین مالکان، مزارعوں اور چرواہوں کو اس علاقے میں اپنی زمینوں، فصلوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال کی بھی اجازت نہیں دیتے۔

درخواست میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ خاران کے نواب اور محمد علی جناح کے درمیان 1948ء میں ہوئے الحاق کے دستاویز کی خلاف ورزی کی جارہی ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس وقت کے نواب نے عوام کے اعتماد کی خلاف ورزی کی اور انہوں نے غیر قانونی طور پر اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے الحاق کی دستاویز پر دستخط کیے، جس نے قلات کے جبری الحاق کے لیے جواز فراہم کیا۔ بلوچ عوام سے کی گئی ان کی بے وفائی کا صلہ انہیں قدرت کے انصاف کی صورت میں یہ ملا کہ اب عرب شیوخ ان کی اولاد کے حقوق پامال کر رہے ہیں۔

خاران کے نواب بااثر تو ہیں لیکن پھر بھی من موجی عرب شیوخ کے سامنے اس حد تک مجبور ہیں کہ انہیں امداد کے لیے بلوچستان ہائی کورٹ کے مداخلت کی ضرورت آن پڑی ہے۔ تاہم، کچھ نہیں ہوگا۔ اگرچہ ریاستی اداروں اور ان کی معاونت سے چلنے والی قاتل دستوں کے براہِ راست اور ڈھٹائی کے ساتھ ملوث ہونے کے ثبوت مان لیے گئے ہیں، مگر پھر بھی اعلیٰ عدالتیں لاپتہ افراد کی زندگیاں بچانے میں بے بس ہیں۔

شیوخ کے جھتے 'معدومیت کے خطرے سے دوچار فہرست میں شامل' تغ دار تلور کی نقل مکانی کے راستوں اور مسکنوں پر یلغار کرتے ہیں۔ اجازت ناموں کے علاوہ انہیں اپنی جائیداد اور شکار کے مقاصد کے لیے درآمد شدہ اشیا کے لیے ٹیکس سے بھی چھوٹ دی گئی ہے۔ انہیں بھدے قسم کے تلور کو باہر لے جانے کے لیے پورا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ متحدہ عرب امارات کے شیخ تلور کے شکار کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور بہترین اضلاع حاصل کر لیتے ہیں۔ پاکستانی حکمران انہیں مطمئن کرنے کے لیے پیچھے کی طرف جھک کر کورنش بجالاتے ہیں۔ بدقسمتی سے، تلور خطرے سے دوچار جنگلی جانور اور نباتات کی بین الاقوامی تجارت پر معاہدے (سی آئی ٹی ای ایس) کے ضمیمہ نمبر ایک میں شامل ہے، جو اس کی کمرشل تجارت کی ممانعت کرتا ہے۔ عالمی تحفظ یونین (آئی یو سی این) اس کی حیثیت کو خطرے سے دوچار کے قریب تفویض کرتا ہے، یعنی بے جا ہلاکتوں کے سبب اس کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے، اور اسے خطرے سے دوچار ہونے یا حتیٰ کہ مکمل طور پر معدوم ہونے کا بھی سامنا ہے۔ گویا کہ اس کا سالانہ قتلِ عام کافی نہیں، پانچ ہزار سے لے کر دس ہزار کو زندہ پکڑ کر جزیرہ نما عرب میں شاہین مالکان کو شاہینوں کی تربیت کے لیے فراہم کیا جاتا ہے۔ چوں کہ تلور ایک نازک صورت حال سے نبرد آزما ہے، اس کی معدومیت میں معاونت ایک جرم ہے، لیکن پھر ایک ایسی 'اسٹیبلشمنٹ' سے، جسے انسانوں کی کوئی پرواہ نہ ہو، جیسا کہ بلوچ، ہزارہ اور شیعہ نسل کشی سے ثابت ہوتا ہے، تو جانوروں کے حقوق کی دیکھ بھال کی توقع نہیں کی جاسکتی، خاص طور پر جہاں بات عرب شیوخ کی ہو۔

عربوں کے یہ سالانہ 'حملے' بلوچ کے لیے تلخ یاددہانیاں ہیں کہ ان کی آبائی زمین پر ان کے

حقوق پر قدغنیں لگائی گئی ہیں۔ لیکن اصل میں یہ ان بہت ساری ناانصافیوں میں سے صرف ایک کی مثال ہے کہ جن کا بلوچ سامنا کر رہے ہیں۔ ایک اور ضرر رساں ترقیاتی منصوبہ کہ جس نے ان کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہوا ہے۔ میرانی ڈیم، کہ جس نے پندرہ ہزار خاندانوں کو اپنی زمین سے اکھاڑ پھینکا، اس ڈیم کو ان زمینوں کو سیراب کرنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا کہ جنہیں متحدہ عرب امارات کے شیوخ چاہتے تھے اور یہ ایک مسلسل تباہی کا باعث بنا ہوا ہے۔ ہاشم بن راشد نے اپنے مضمون ''ترقی یافتہ بلوچ؟'' میں اس تباہی کو بے نقاب کیا ہے۔ جون 2007ء کی موسلا دھار بارشوں کے دوران اس کے ناقص ڈیزائن کے سبب مخالف سمت میں پانی کے بہاؤ کی وجہ سے وہاں سیلاب آیا اور تقریباً 36 افراد جاں بحق اور 250,000 افراد بے گھر ہوگئے، کھجور کے نخلستان اور کاریز کا نظام تباہ و برباد ہوگیا۔ اسے 33,000 ایکڑ زمین کو سیراب کرنا تھا لیکن اس سے 50,000 ایکڑ سے زائد قابل کاشت زمین ناقابلِ استعمال ہوگئی اور مستقبل میں آب پاشی کے ذرائع بھی ختم ہوگئے۔ ڈیم نے اس سے کئی گنا زیادہ زمین تباہ کر دی جتنی کہ یہ کبھی بھی سیراب کر پاتا۔ اس کے علاوہ، بے گھر خاندانوں کی اکثریت کو ابھی تک کوئی معاوضہ نہیں ملا ہے۔

گوادر پورٹ، ایک اور بیزار کُن مسئلہ ہے کہ جس کو یہاں تک کہ بلوچستان کی کٹھ پتلی انتظامیہ سے مشورہ کیے بغیر ہی چین کے حوالے کر دیا گیا۔ گوادر کو بلوچستان میں آبادیاتی خصوصیات اور فوجی توازن کو تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ چین یقینی طور پر بلوچ قوم پرستوں کے خلاف اقدامات میں پاکستان کی مدد کر رہا ہے۔ یہ امر بلوچ کے اندر نفرت کو مزید گہرا کر رہا ہے۔

ایک اعلیٰ پولیس افسر کے مطابق، صرف چمن میں حکام کروڑوں روپے کما رہے ہیں، اس پر طرہ یہ کہ ان غیر قانونی سرحدی چوکیوں کی آمدنی اور یہ حقیقت کہ بلوچستان کو اربوں ڈالر مالیت کے منشیات کی تجارت کے لیے ایک گزرگاہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور آپ کو اندازہ ہو ہی جائے گا کہ اس سیاہ معیشت میں وہاں کیا کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ سیاہ معیشت افراتفری کے عالم میں پروان چڑھتی ہے اور اس کے نتیجے میں پُرآشوب حالات کو فروغ ملتا ہے۔ وہ کہ جن کے پاس

اختیارات ہیں، اس صورتحال کا اربوں روپے کمانے کے لیے استحصال کر رہے ہیں۔ خرم حسین نے اپنے مضمون ''پوشیدہ معیشت'' میں اسٹیٹ بینک کے تحت چلنے والے 16 تصفیہ گھروں کے اعداد و شمار دیے ہیں۔ ہر ماہ یہ لین دین کی رقم کا ڈیٹا جاری کرتی ہیں۔ 1999ء کے بعد سے ڈیٹا کچھ بڑا ہی ظاہر کرتا ہے، واقعی بہت ہی بڑے تناسب کے ساتھ، جو کہ نظروں سے اوجھل ایک بڑی کاروباری گرما گرمی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کوئٹہ اور پشاور میں ایک غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے، اگرچہ وہ فیصل آباد اور راولپنڈی جیسے اقتصادی مراکز نہیں ہیں۔ اول الذکر کے اعداد و شمار بالترتیب محض 900 ارب روپے اور 13 کھرب روپے سے نیچے ہیں، اور مؤخر الذکر کے لیے اعداد و شمار بالترتیب 13 کھرب روپے اور 14 کھرب روپے کے ہیں۔ غیر قانونی طور پر لین دین کی رقم یقیناً قانونی طور پر کی گئی لین دین کی رقم سے بہت زیادہ ہے اور یہ یہی پیسہ ہے جو کہ حکام کو صورتحال کے پُرآشوب رکھنے کی طرف راغب کرتا ہے تاکہ وہ بڑے پیمانے پر منافع کماتے رہیں۔

'اسٹیبلشمنٹ' اپنے اور اپنے دوستوں کی ان مراعات کو برقرار رکھنے کی خواہش میں غیر انسانی بربریت پر اتر آئی ہے اور اسے بلوچ کے خلاف 'غلیظ جنگ' کے ساتھ جاری رکھا ہوا ہے۔ اس کی تازہ ترین جدت یہ ہے کہ اس نے مغوی بلوچوں کی لاشیں کراچی میں پھینکنا شروع کر دی ہیں۔ خاران اور پنجگور سے تعلق رکھنے والے اقرا یونیورسٹی کراچی کے دو طالب علم مقبول اور بابو افتخار، جنہیں جنوری میں اغوا کیا گیا تھا، کی لاشیں حال ہی میں منگھو پیر کے قریب سے ملی ہیں اور ان کے ساتھ کراچی سے ملنے والی مغوی بلوچوں کے لاشوں کی تعداد سات تک پہنچ چکی ہے۔ 'اسٹیبلشمنٹ' بلوچ کو خطرے سے دوچار حیات کی فہرست میں دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔ اس کے اسٹریٹجک اثاثے ہزارہ اور شیعہ کو اس فہرست میں شامل کرنے کے لیے اوور ٹائم لگا رہے ہیں۔

معمولی سی توہین اور اپنے حقوق کی چھوٹی سی خلاف ورزیوں کو عاجزی سے قبول کرنے کا انجام سب سے زیادہ مکروہ خلاف ورزیوں کی قبولیت پر ہوتا ہے۔ ہر خلاف ورزی آپ کی آزادی کو محدود کر دیتی ہے، لہٰذا اس کے خلاف مزاحمت کرنی چاہیے۔ خاران کے نواب اور وہ لوگ جو

اس توہین کو قبول کرنا جاری رکھے ہوئے ہیں، فریڈرک نطشے کو ملاحظہ فرمائیں، ''اپنا مالک خود بننے کے استحقاق کے لیے کسی بھی بھاری قیمت کی ادائیگی کچھ بھی نہیں۔'' پروقار زندگی کے لیے کوئی بھی قیمت بڑی نہیں ہوتی۔

اکبر الہ آبادی (1846 تا 1921) نے بھی اسے شاندار طریقے سے بیان کیا ہے:

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبؔر نے سنا ہے اہلِ غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 10 مارچ، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/default.asp?page=2013%5C03%5C10%5Cstory_10-3-2013_pg3_2

مبہم سچ اور مستحکم جھوٹ

متعدد انعام یافتہ کتاب، ''پھٹتے آموں کا ایک کیس'' کے مصنف مسٹر محمد حنیف نے مجھ سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اپنی کتاب ''وہ بلوچ جو لاپتہ نہیں رہے اور دیگر وہ جو ہیں'' کی گذشتہ ماہ کراچی ادبی میلے میں منعقد ہونے والی تقریبِ رونمائی میں میزبانی کی درخواست کی۔ کتاب میں لاپتہ ڈاکٹر دین محمد بلوچ کی بیٹی سمی بلوچ حنیف سے ایک انتہائی تکلیف دہ سوال پوچھتی ہے کہ، ''اگر وہ میرے والد کو پھانسی دینا چاہتے ہیں تو وہ اس کو عدالت میں لائیں، اس پر مقدمہ چلائیں اور ہم سب کے سامنے اسے پھانسی دیں۔ ہمیں کم از کم یہ جان کر اطمینان ہوگا کہ وہ اب نہیں رہے۔ لیکن اگر وہ اسے تین سال، چار سال تک زندہ رکھتے ہیں، اگر وہ ہر روز اس پر تشدد کرتے ہیں اور پھر اسے قتل کر کے اس کی لاش کو پھینک دیتے ہیں، آخر اس کا مقصد کیا ہے؟'' تقریب کو شروع کرنے کے لیے میں نے یہ سوال وہاں موجود پینل کے ارکان کے سامنے رکھا اور حنیف نے بجا طور پر کہا کہ، ''وہ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ وہ اس سے بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔'' میرا خیال یہ تھا کہ یہاں سزا سے استثنیٰ کا ایک کلچر غالب ہے اور یہ ان لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جو اسٹیبلشمنٹ کی طاقت سے منحرف ہیں اور اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں۔

متعدد (مارچ کے پہلے 12 دنوں میں 11 برآمد ہوئی) مغوی بلوچوں کی لاشیں کراچی سے ملی ہیں۔ وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے کیمپ کے منتظمین نے، جو کہ گزشتہ کئی ماہ سے کراچی پریس کلب کے باہر احتجاجی کیمپ لگائے بیٹھے ہیں، ان کی تصاویر کو لاپتہ افراد کے حصے سے ہٹا دی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی نے بھی ان لرزہ خیز ہلاکتوں کی مذمت نہیں کی؛ 35 سالہ اسکول ٹیچر ماسٹر عبدالرحمٰن اور 22 سالہ طالب علم زاہد حسین کے جسم سے ان کے اعضا نکالے گئے تھے؛ ان دونوں کو پنجگور سے بالترتیب 12 اور 24 فروری کو اٹھایا گیا تھا۔ نہ تو سیاسی جماعتوں نے اور نہ

ہی سندھی قوم پرست یا سول سوسائٹی نے ان ہلاکتوں پر احتجاج میں ایک لفظ کہا۔ سکندر قمبرانی اور باز خان مری کی لاشیں آبِ گم، بولان سے 12 مارچ کو ملیں۔ بم رکھنے کے جھوٹے الزام میں گرفتار کیے گئے 11 نوجوان بلوچ لڑکوں کے رشتہ داروں نے کوئٹہ میں احتجاج کیا۔ پولیس کا دعویٰ ہے کہ انہیں ایک مقابلے کے بعد گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ دعویٰ مشکوک طور پر انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ لوگوں کی اس اشتعال انگیز خاموشی پر ہنری فریڈرک امیل (1821 تا 1881)، سوئس فلسفی اور شاعر کا کہنا ہے کہ، ''صرف باطل حق سے دست درازی نہیں کرتا؛ خاموشی بھی یکساں طور سے اس کی بے حرمتی کرتا ہے۔''

ایسا لگتا ہے کہ ان ہلاکتوں اور کراچی میں وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے جاری احتجاج کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں؛ دراصل بلوچ کے خلاف ڈھائے جانے والے تمام مظالم پر تقریباً کسی کا دھیان نہیں جاتا اور نہ ہی ان کا تذکرہ ہوتا ہے۔ عمومی بے حسی، جو کہ یہاں پر غالب ہے، کے علاوہ دیگر وجوہات بھی ہیں۔ ریاست کا غالب بیانیہ، اس کے پاس عقائد ذہن نشین کرانے کے لیے بہت سارے وسائل موجود ہیں، اس نے کامیابی سے اس بات کو باور کروایا ہے کہ بلوچ اسی لائق ہیں کہ ان پر جبر کیا جائے اور ان کا خاتمہ کیا جائے۔ لوگ اس بات پر مائل ہیں کہ جو لوگ جبر کے خلاف لڑ رہے ہیں، ان لوگوں کا بیانیہ نقارے کی مانند مسلسل بجتے جابر کے بیانیہ میں غرق ہو جائے۔

ریاست کے بیانیے کی تاثیر کی ایک مثال کو، ریاست کی پس پردہ حمایت کے ساتھ بنیاد پرستوں کے بیانیے میں غیر معمولی اضافہ جبکہ سیکولر قوتوں کے بیانیہ کے ناتواں ہونے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے؛ اور اس امر نے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ بنیاد پرستی طاقت ور سے طاقت ور تر بنتی جائے گی جب کہ یہ اس حد تک بڑھے گی کہ غیر جانبداروں کے لیے بھی جگہ سکڑ جائے گی۔ آج کل توہین رسالت کے الزام میں لوگ ہجوم کے عتاب کی نذر ہو رہے ہیں اور اس کے بعد متاثرین کو محض ایک سرد مہری حمایت ہی نصیب ہوتی ہے۔ ریاست کے بیانیے نے اس بات کو یقینی بنایا ہوا ہے کہ ممتاز قادریوں کو سلمان تاثیروں کی نسبت زیادہ حمایت حاصل ہوگی۔ بلیز پاسکل (1623 تا

1662)، فرانسیسی ریاضی دان، طبیعیات دان اور مذہبی فلسفی نے بجا طور پر فرمایا تھا کہ، ''آج کل سچائی بہت مبہم ہو چکی ہے اور جھوٹ بہت مستحکم کہ جب تک ہمیں حقیقت سے محبت نہ ہو، ہم اسے پہچان نہیں پائیں گے۔'' ریاست کے بیانیے نے لوگوں کے ذہنوں کو اس قدر متاثر کیا ہوا ہے کہ 8 مارچ کو خواتین کے عالمی دن پر وہاں لاپتہ افراد کی ماؤں اور بہنوں کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ صعوبتوں کی شکار یہ خواتین نہ تو خواتین کے گروہوں اور نہ ہی سول سوسائٹی کے ریڈار پر آتی ہیں اور انہیں اُن تمام دنوں اور خواتین کے حقوق کے حوالے سے منعقد تقاریب میں بھی بہ آسانی بھلا دیا جاتا ہے۔ خواتین کے حقوق اور حالتِ زار کے بارے میں لکھنا ایک فیشن ہے لیکن لاپتہ افراد کی ان خواتین رشتہ داروں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ خواتین جو کہ ان تمام منفی حالات میں سب سے زیادہ مشکلات کا شکار ہیں۔

قرآنِ مقدس نے ایک شخص کے قتل کو انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے جبکہ یہاں سماج صرف اس وقت وقتی طور پر متحرک ہو جاتا ہے جب بہت سارے لوگ مارے جائیں، جیسا کہ فرقہ وارانہ اور ہزارہ ہلاکتوں پر ہوا۔ وہ لوگ جو بلوچ کو مار کر ان کی لاشیں بلوچستان میں، اور اب کراچی میں پھینک رہے ہیں، اس معاشرے کی نفسیات کو مکمل طور پر سمجھتے ہیں اور انھوں نے درست طریقے سے اس بات کو بھانپ لیا ہے کہ سست رفتار نسل کشی کوئی ڈرامائی ردِعمل پیدا نہیں کرے گی۔ تا آنکہ بلوچ اپنے خلاف مظالم کے جواب میں عوامی سطح پر ڈرامائی انداز میں ردِعمل نہیں دکھاتے، جس نے ان کی حالتِ زار کو مبہم کر کے رکھ دیا ہے۔

یہاں قبولیت کو یقینی بنانے کے لیے لوگوں پر جھوٹ کی بمباری والی ڈاکٹر گوئبلز کی حکمت عملی بڑی حد تک کامیاب رہی ہے، کیوں کہ لوگوں کے ذہنوں کو پہلے ہی سے متعصب نظام تعلیم اور لگاتار پروپیگنڈے کے ذریعے کافی حد تک ریاست کے بیانیے کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس طرح کے حد سے زیادہ کنٹرول کے ساتھ مقتدراؤں کو لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لیے کسی فوج کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے لیکن اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے اس آلہء جبر کو عوام کے خلاف زیادہ دیدہ ودانستگی سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک منصفانہ اور برابری پر مبنی معاشرے کی

کامیابی سے قیام کے لیے سماج کو بڑے پیمانے پر لوگوں کے ذہنوں پر اس کثیر الجہتی حملے کا مقابلہ کرنا ہوگا، اگر وہ اس بچی کھچی تھوڑی سی آزادی سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔

فرسودگی کی اس جنگ میں اسٹیبلشمنٹ کے وسائل بلوچ کے وسائل سے کئی گنا زیادہ ہیں اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بلوچ کو اپنی حکمت عملی دوبارہ جانچنا ہوگی اور تیزی سے بدلتے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تدابیر اپنانا پڑیں گی۔ آج کی صورتحال کی سب سے اہم ضرورت بلوچ کے درمیان اتحاد ہے جو ریاستی دہشت گردی اور بیانیہ کے خلاف ایک مانع عنصر کے طور پر کام کر سکے گا۔ ہنری فریڈرک امیل کا ایک مشورہ ہے اور بلوچ کو اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں، ''وہ جو خاموش ہے اسے بھلا دیا جاتا ہے؛ وہ جو اجتناب کرتا ہے اپنے الفاظ سے مار کھاتا ہے؛ وہ جو آگے نہیں بڑھتا، پسپا ہو جاتا ہے؛ وہ جو رُکتا ہے مغلوب ہو جاتا ہے، دور کر دیا جاتا ہے، مسل دیا جاتا ہے؛ وہ جو نشوونما روک دیتا ہے چھوٹا بن جاتا ہے؛ وہ جو ترک کرتا ہے، دستبردار ہو جاتا ہے؛ ساکن حالت خاتمے کا آغاز ہے، یہ خوف ناک علامت ہوتی ہے، جو کہ موت سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔ زندہ رہنے کے لیے، دائمی فتح کا حصول ضروری ہے: یہ کسی کا تباہی کے خلاف، بیماری کے خلاف، اپنے جسمانی اور اخلاقی وجود کی تنسیخی اور انتشار کے خلاف اپنے آپ کو منوانا ہے۔ یہ اپنی چاہ کو باز رہے بغیر زندہ رکھنا ہے یا بلکہ اپنی چاہ کو آئے روز دوبارہ تازہ کرنا ہے۔'' ان کا پیغام مسلسل جدوجہد ہے اور اس مشکل ترین گھڑی میں صرف خود سے اور اس کے ساتھ ساتھ بیرونی طاقتوں کے خلاف جدوجہد ہی بلوچ کے لیے کامیابی کو یقینی بنا سکتی ہے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، پیر، 17 مارچ، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/default.asp?page=2013%5C03%5C17%5Cstory_17-3-2013_pg3_2

جلتی پر تیل

جب کوئی شخص اپنے ابتدائی کلمات میں 28 مئی 1998ء کو چاغی میں کیے گئے جوہری دھماکے کو تاریخی قرار دے تو یہ بات اس تحریر کو لکھنے کے مقصد کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتی ہے۔ مسٹر اسامہ نظامانی نے اپنے مضمون ''گوادر: پاکستان اور خطے کے لیے ایک ابھرتا ہوا مثالی نمونہ'' (''ڈیلی ٹائمز'، 19 مارچ، 2013) میں یہی کیا ہے۔ کسی بھی ایٹمی دھماکے کا جشن منانا ہیروشیما اور ناگاساکی کے متاثرین کی یاد کی ایک سیدھی سادی توہین ہے۔ یہ امر 'چیچک' اور 'وبائی موت' کو لوگوں کے لیے ایک نعمت کے طور پر ان کا جشن منانے کے مترادف ہے۔ وہ ایٹمی دھماکہ کہ جس نے ایک پہاڑ کو مار ڈالا اور وہاں رہنے والوں پر اس کے منفی اثرات کو صرف وہی لوگ ایک تاریخی واقعہ قرار دے سکتے ہیں جو صرف اور صرف اس دنیا کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہوں۔

اور پھر نظامانی ''ملک کو قریبی اور بین البراعظمی روایتی فوجی خطرات سے نمٹنے کے لیے صحیح نشانے پر لگنے والے، بہتر اور کامیاب ترسیلی نظام کی ترقی'' کی ستائش کرتے ہیں۔ خاص طور پر فاسد طبیعت والے افراد اور اداروں کے ہاتھوں میں اس کی تعیناتی کا نظام ہونا جوہری ہتھیاروں کو شرحاً مزید خطرناک بنا دیتے ہیں۔ اسٹریٹجک کمانڈ اینڈ کنٹرول سپورٹ سسٹم (ایس سی سی ایس ایس) جیسے آرائشی نام دینے سے جوہری ہتھیار کبھی بھی وینٹی فیئر کے شائع کردہ سیاہ موت یا چیچک کے اشتہارات کے مقابلے میں زیادہ پُرکشش نہیں ہو سکتے۔

مصنف گوادر، چین کے حوالے کرنے کو ''دیر آید درست آید'' کے طور پر سمجھتا ہے اور امید کرتا ہے کہ ''گوادر پورٹ کو چین کے حوالے کرنے سے جو اقتصادی اور اسٹریٹجک مواقع پیدا ہوئے ہیں'' اس سے ایک نیا ''اسٹریٹجک اور اقتصادی افق'' نمودار ہوگا۔ وہ بلوچ کی ناراضگی کو با آسانی نظرانداز کرتا ہے لیکن پھر بلوچ خدشات کی ان لوگوں کے نزدیک کوئی اہمیت بھی تو نہیں ہے جو

بلوچستان کو ٹیرا نلیئس (غیر آباد یا غیر مسکونہ زمین) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ گوادر کے استحصال کی حمایت کرنا، اسٹیبلشمنٹ کے بلوچ کے منظّم خاتمے کے نقطہءنظر کی حمایت کرنے کے مترادف ہے۔ یہ نقطہءنظر ان لوگوں کو با اختیار بننے میں بھی مدد دیتا ہے جو بلوچ عوام کے خلاف مظالم کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اس عمل میں شریک کار ہیں۔

نظامانی مستقبل میں گوادر سے ملنے والے غیر حقیقی اقتصادی فوائد کو بیان کرتا ہے اور اندازہ لگاتا ہے کہ ''40 ارب ڈالر کی آمدنی اور بیس لاکھ ملازمتوں کا پیدا ہونا، بطور ایک ابھرتی ہوئی معیشت کے، پاکستان کے لیے مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔'' وہ بنیادی ڈھانچے کی تعمیر میں نجی شعبے کی سرمایہ کاری کی ضرورت پر زور دیتا ہے تاکہ اسے ''شہری سہولیات سے آراستہ ایک مکمل ساحلی شہر'' بنایا جاسکے۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ ماضی میں نجی اور سرکاری شعبوں کی شہرکاری کی کوششیں کرپشن اور لوٹ مار کا مثالی نمونہ رہی ہیں۔

اس لوٹ مار کی وضاحت سپریم کورٹ کے جسٹس جاوید اقبال اور جسٹس راجہ فیاض احمد پر مشتمل ڈویژن بنچ کے سول پٹیشن نمبر Q-123، 2006 کے حوالے سے دیے گئے فیصلے میں اچھی طرح سے کی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''گوادر میں زمینوں کی الاٹمنٹ خود حکومت کی طرف سے بنائی گئی پالیسیوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کی گئی ہیں۔ صوابدیدی اختیارات کو من مانے اور غیر مناسب طریقے سے استعمال کیا گیا ہے، جس کا حوالہ اختیارات کے غلط اور طاقت کے ناجائز استعمال کی ایک واضح مثال کے طور پر دیا گیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا ہے کہ مسکونہ علاقے کی زمین، جو کہ حکومت کی ملکیت تھی، کس طرح سے نجی شعبے کو منتقل ہوئی، اور وہ بھی مونگ پھلی کے داموں، اس سے شفافیت کی کمی اور بدانتظامی ظاہر ہوتی ہے۔'' لوٹ مار جاری ہے، جیسا کہ سپریم کورٹ کی ہدایات کی وقعت اس کاغذ جتنی بھی نہیں کہ جن پر انہیں لکھا جاتا ہے۔ دسمبر 2009ء کو دی گئی میکرو حبیب کی عمارت کو گرانے کی ہدایت پر تاحال عمل نہیں ہوا ہے۔ پرویز مشرف اور اعلیٰ بیوروکریٹس سمیت ملک کی اعلیٰ قیادت گوادر کے سنگھار ہاؤسنگ کالونی میں من پسند پلاٹوں کی مالک ہیں۔ یہ تو صرف تودے کا سرا ہے۔ یہ تودہ ایک ہزار ٹائی ٹینک تو خود ہی ڈبو دے گا اور یہ ان تودوں میں سے

صرف ایک ہے۔ ظلم اور جبر کا تو دہ تو بہت بڑا ہے۔

حتیٰ کہ مئی 2003ء تک، اسٹیبلشمنٹ کی حامی جماعتوں نے بھی گوادر ماسٹر پلان کے خلاف ہڑتالیں کی تھیں۔ گوادر کی وجہ سے صوبے کی آبادیاتی خصوصیات میں تبدیلی سے آنی والی تباہی کے حوالے سے بلوچ کی تشویش کو نظامانی نہ صرف نظر انداز کرتا ہے بلکہ اسے ایک مثبت عمل سمجھتا ہے۔ گوادر پر اسٹیبلشمنٹ کی پالیسیاں جلتی پر تیل ڈال رہی ہیں۔ وہ غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ ''سب کو ایک ساتھ ملانے سے گوادر ملک میں ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے لیے ایک زرخیز زمین بن جائے گا۔'' یہ دلیل غلط اور گمراہ کن ہے؛ کراچی، جو کہ دو کروڑ آبادی والا شہر ہے، اس نے اس خیالی مڈل کلاس کو پیدا کرنے کی بجائے کئی مافیا پیدا کیے۔ ایک شہر کہ جس کی تعمیر کا مقصد بلوچ کو ان کے حقوق سے محروم کرنا ہو اور اس کی بنیاد تنگ نظرانہ عسکریتی اسٹریٹجک اہداف کے حصول پر مبنی ہو، تو وہ اس مقصد کو کیسے حاصل کر پائے گا؟ وہ غلطی سے یہ فرض کر لیتا ہے، جبکہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اسلام آباد کی ہو بہو نقل کہیں بھی نہیں بنائی گئی ہے کہ گوادر کی ایک سے زائد نقلیں بنائی جائیں گی۔ درمیانے طبقے کے ظہور اور نئے شہروں کے قیام جیسے بہانے مصنوعی کی ترقی کے نام پر لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لیے کوئی جواز فراہم نہیں کر سکتے۔

نظامانی بلوچستان کے ساحل پر بحری مشقوں کی تعریف کرتا ہے اور اس گوہر بیانی کے ساتھ کہتا ہے: ''پاکستان اور رائل سعودی نیول فورسز (آر ایس این ایف) کے درمیان باہمی دلچسپی کا کلی میل دونوں بحری افواج کو خلیج فارس، خلیج عدن اور بحیرہ احمر میں عمومی روایتی اور غیر متناسب خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت مشترکہ آپریشنل تیاری کے قابل بنائے گا۔ پاکستان کی جانب سے ایٹمی سہ پیوندہ کا حصول بحری میدان میں اس کی ڈیٹرنس کی صلاحیت کو مزید مضبوط بنائے گا اور اس سے وہ اپنے نئے بحری قوت کے استعمال کے ذریعے مشرقی اور مغربی پانیوں میں امن و استحکام کو برقرار رکھنے اور جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اس کی ضرورت پڑی، وہ اس کو مذاکراتی اوزار کے طور پر استعمال کرنے کے قابل ہوگا۔'' واہ! وہ عسکریت کاری اور ترقی کے درمیان تفریق کو سمجھنے میں ناکام ہے، وہ سمجھتا ہے کہ آخر الذکر اولالذکر ہے۔ وہ یہ تصور پیش کرتا

ہے کہ گوادر کی ترقی بحری عسکریت کاری کے ساتھ ساتھ ہو، جو کہ خطے میں استحکام کی بجائے مزید نقطہ ہائے اشتعال پیدا کرے گا۔ اس منطق کا منبع وہ لوگ ہیں جن کو لگتا ہے کہ بلوچستان کا مسئلہ عسکری طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔ نظامانی، بلوچ عوام کے خلاف اسٹیبلشمنٹ کی ظالمانہ پالیسیوں کا ایک معذرت خواہ ہے اور خطے میں عسکریت کاری کا ایک وکیل ہے۔

جدید ہتھیاروں کے اس دور میں یہ سمجھنا خام خیالی ہے کہ دفاعی اعتبار سے کراچی کی نسبت گوادر زیادہ محفوظ ہے۔ خطے میں عسکریت کاری کے لیے گوادر کو تختۂ مشق کے طور پر استعمال کرنا بلوچ عوام سے سراسر ناانصافی ہے اور اس سے ان کی پرامن زندگی کے حق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ گوادر کی عسکریت کاری نہ صرف لوگوں کی زندگی کو خطرے میں ڈالے گی بلکہ ساحلی بلوچ برادریوں کو ماہی گیری کے ان مواقع سے بھی محروم کر دے گی جن پر ان کا روزگار منحصر ہے۔ حتیٰ کہ منصوبہ شدہ توسیع کے بغیر بھی ان کی سرگرمیوں پر سخت پابندیاں عائد ہیں اور انہیں تادیبی اقدامات کا بھی سامنا ہے، جیسا کہ بڑے پیمانے پر ان کی کشتیوں کو نقصان پہنچانا، جب کبھی بھی وہ ان ظالمانہ نظام الاوقات کے نفاذ کی خلاف ورزی کرتے ہیں؛ قوم پرست بھی جوابی کارروائی میں بحریہ کی کشتیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ماضی میں چینی انجینئروں کو ہلاک کیا گیا ہے اور دوبارہ ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے بلوچ کے خلاف جابرانہ اقدامات میں تیزی سے اضافہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ نظامانی خود قبول کرتے ہیں کہ گوادر سے چین کو زیادہ فائدہ ہے اور یہ اس کی فوری ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ گوادر چین کی گہری وابستگی کے سبب، پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور چینی مفادات کے درمیان، بلوچ قوم پرستی کا نیا میدان جنگ بن جائے گا۔ استحصال کی تمام کوششیں تنازعے کی شدت میں اضافہ پر ہی منتج ہوں گی۔ تنازعات کا حل محض زبانی جمع خرچ سے کبھی نہیں نکل سکتا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ گوادر، بلوچ عوام کے استحصال، ان کے حقوق سے مکمل انکار اور خطے کی عسکریت کاری کا ایک مثالی نمونہ ہے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 24 مارچ، 2013

غیر معمولی نظر مگر بصیرت کی کامل کمی

ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک توہین آمیز طعن وہ دھیان نہ دے سکے؛ سردار اختر مینگل کا آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ ٹھیک 27 مارچ کو سامنے آیا، وہ دن کہ جسے بلوچ قوم پرستوں نے 'یوم سیاہ' کے طور پر منایا، کیونکہ 1948ء کو اسی دن بلوچستان پر زبردستی قبضہ کیا گیا تھا اور بلوچ کو اپنی آزادی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 25 مارچ کو انہوں نے پہنچنے پر کہا تھا کہ ان کے گذشتہ سال ستمبر میں سپریم کورٹ میں پیشی کے بعد سے اب تک کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ تب سے اب تک 70 لاشیں پھینکی گئی ہیں اور 60 ٹارگٹ کلنگ ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ادارے اپنے خیالات کو غلطی سے طاقت کے ذریعے تھوپنے کی کوشش کر رہے ہیں اور انہی اداروں نے بلوچستان کو موجودہ نازک صورتحال کی طرف دھکیلا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر ملک میں آئینی حکمرانی ہوتی تو وہ چار سال جلاوطنی میں نہ رہتے اور ان کا خیال یہ تھا کہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف سے مداخلت کو ختم کیے بغیر آزادانہ، منصفانہ اور شفاف انتخابات کا انعقاد نہیں ہوسکتا، اور مزید براں یہ کہ نگراں حکومت کا دو ماہ کے اندر امن وامان بحال کرنے میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے، جہاں پچھلے حکمران اس میں ناکام رہے ہوں۔ انہوں نے زور دے کر مزید کہا کہ یہ واضح نہیں ہے کہ 'خون آلود' بلوچستان میں انتخابات کا انعقاد کس طرح کیا جائے گا۔

ظاہر ہے، کسی نہ کسی طرح سے صورتحال اچانک تبدیل ہوئی اور مینگل نے اس صف میں شمولیت اختیار کر لی۔ اگرچہ زمینی حقیقت یہ تھی کہ ان کے آنے کے بعد کراچی اور حب میں چند مزید لاشیں پھینکی گئیں۔ یہ اغوا اور قتل نگراں حکومت کی مدت کے دوران یا انتخابات کے بعد بھی ختم نہیں ہوں گے کیونکہ کسی ایک شخص کو بھی جواب دہ نہیں ٹھہرایا گیا ہے۔ 21 مارچ کو ایک اخباری

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سپریم کورٹ کے تین رکنی بنچ کو سی آئی ڈی کے ڈی آئی جی بلوچستان فیروز شاہ کی طرف سے بتایا گیا ہے کہ 10 فوجی افسران بلوچستان میں لاپتہ افراد کے اغوا میں ملوث ہیں۔ انہوں نے کہا کہ، ''گھر واپس لوٹنے والے 12 لاپتہ افراد کے بیانات پر عمل درآمد کرتے ہوئے بلوچستان پولیس نے فرنٹیئر کور (ایف سی) سے کہا ہے کہ وہ پتہ لگائیں کہ فوج سے تعلق رکھنے والے یہ ملزمان کہاں ہیں، بشمول دو لیفٹیننٹ کرنل، چھ میجر اور دو صوبیداروں کے۔'' انہوں نے انکشاف کیا کہ ایف سی نے کہا ہے کہ ان افسران میں سے کچھ اس ادارے سے تعلق نہیں رکھتے، اور باقی لوگ فوج میں واپس چلے گئے ہیں۔ یعنی کہ معاملہ وہیں اٹکا ہوا ہے، کسی جواب دہی کے بغیر لوگوں کا لاپتہ ہونا جاری ہے۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ثبوت پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی ہوئی ہے؛ پیپلز پارٹی بلوچستان کے صدر صادق عمرانی نے 6 فروری، 2012ء کو بلوچستان اسمبلی میں حیرت انگیز انکشاف کیا کہ انہوں نے اور دیگر دو وزرا، یٰسین ملازئی اور ظفر زہری نے کوئٹہ قلات نیشنل ہائی وے پر ایف سی اہلکاروں کے ہاتھوں دو شہریوں کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس بات کو اور سی سی ٹی وی کے ثبوت کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، لہٰذا بلوچ کی جانب اسٹابلشمنٹ کے رویے میں کسی تبدیلی کی کوئی امید نہیں ہے۔

انتخابات صرف وہیں جمہوریت کو مضبوط کرنے میں مدد دے سکتے ہیں جہاں جمہوری روایات اور حالات موجود ہوں۔ انتخابات کا انعقاد تو حسنی مبارک اور رابرٹ موگابے بھی کرواتے تھے، لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ پیپلز پارٹی کی منتخب حکومت نے مرکز میں پانچ سال مکمل کیے، اور بلوچستان میں ایک مخلوط حکومت نے بھی، مگر اس کے باوجود اس مدت نے بلوچ کو بدترین مظالم کا نشانہ بنتے دیکھا۔ آخر یہ امید کہاں سے آئی ہے کہ یہ صورتحال اس نئے انتظامی ڈھانچے کے ساتھ تبدیل ہو جائے گی؟

قدرتی طور پر لوگ یہ پوچھیں گے کہ بائیکاٹ کس طرح سے مددگار ثابت ہوگا؛ ممکن ہے کہ یہ کوئی تبدیلی نہ لا سکے لیکن کم از کم بلوچ کے خلاف مظالم کو جواز تو فراہم نہیں کرے گا۔ بات صرف

مینگل کی نہیں ہے، بلکہ ان تمام لوگوں کی ہے جو محض فوائد کے عوض مظالم کو جائز قرار دینے کے لیے تیار ہیں۔

یقیناً، یہاں کی سیاست کا حصہ ہونے میں کافی بڑے فوائد ہیں۔ یہی بات عاصم سجاد اختر نے ایک ملکی روزنامہ میں 29 مارچ کے اپنے مقابل اداریہ، ''عرضیت میں ان سب سے آگے'' میں کہی ہے؛ ''بلوچستان کی مثال لے لیں جہاں انتخابات کے انعقاد کی قانونی حیثیت بذاتِ خود ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔ یہ بات قابل ذہن نشین ہے کہ حتیٰ کہ جب بلوچ سماج کا ایک بڑا حصہ مرکزی دھارے سے الگ تھلگ ہے، جیسا کہ اختر مینگل نے بھی درد بھرے انداز میں اس کی طرف اشارہ کیا، آئندہ انتخابات میں اب بھی بہت سارے سیاسی اور اقتصادی وسائل داؤ پر لگے ہوئے ہیں، اور وہاں بہت سے بلوچ ہیں کہ جن کا تعلق اعلیٰ، درمیانے اور نچلے طبقے سے ہے، ممکنہ طور پر ان وسائل کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں ہوں گے۔ مثال کے طور پر اسمگلنگ کی سیاسی معیشت (اور ٹرانسپورٹ) ایک پیچیدہ معاملہ ہے کہ جس میں لاکھوں بلوچ شامل ہیں۔ تجارت اور کئی اقسام کی اجناس کی نقل وحمل کو سہولت فراہم کرنے کے لیے کئی طرح کے لائسنس اور اجازت ناموں کی ضرورت ہوتی ہے کہ جنہیں سرکاری حکام جاری کرتے ہیں۔ ممکن ہے بلوچ عوام پاکستانی ریاست کے ساتھ کسی بھی طرح کا کوئی نظریاتی عزم رکھنے سے متنفر ہوں، لیکن چوں کہ اس کے باوجود اقتصادی ادغام کی حقیقت کا مطلب یہ ہے کہ اس سے بہت سارے لوگوں کی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں، اس لیے انتخابات ایک اہم مشق ہے، وگرنہ دوسری صورت میں ممکن ہے کہ وہ سیاسی طور پر علیحدگی پسند تحریک کی حمایت کریں۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ کوئٹہ کے تصفیہ گھروں کے اعداد وشمار اس میں غیر معمولی مالی اضافہ ظاہر کر رہے ہیں؛ لازم وملزوم طور پر، وہاں مختلف اداروں اور سیاسی جماعتوں کے درمیان ایک شدید بے چینی موجود ہے کہ کس طرح سے وہ اس لوٹ مار کو سیاسی طور پر جائز قرار دیتے ہوئے اپنے لیے ایک بڑا حصہ ہتھیا لیں۔ اس میں کوئی تعجب نہیں کہ بلوچستان کی تقریباً پوری پچھلی اسمبلی بھی کابینہ کے طور پر دگنی ہو چکی تھی۔''

لہٰذا یہاں انتخابات میں حصہ لینا ان لوگوں کے لیے ایک لاحاصل مشق نہیں ہے جو اس بہتی گنگا میں نہانا چاہتے ہوں، جس کی ایک مثال سجاد صاحب نے دی ہے۔ استخراجی ادارے مصنوعی طور پر جائز قرار دیے گئے حالات میں پنپتے اور ترقی کی منازل طے کرتے ہیں، اور نام نہاد قوم پرست جماعتوں کی انتخابات میں شرکت ان اداروں کو بالکل یہی چیز فراہم کرے گی۔ ان جماعتوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بلوچ کے حقوق کی خاطر اور ہزارہ کے لیے ایک محفوظ ماحول پیدا کرنے کے لیے اپنے فوائد کو ترک کر دیں گے، کچھ زیادہ ہی بڑی مانگ ہے۔

مینگل کو سب سے زیادہ لعنت ملامت اس لیے کیا جا رہا ہے کیوں کہ ان کے خاندان کی قوم پرست سیاست میں پچھلے ریکارڈ کی وجہ سے لوگوں کو ان سے بہت زیادہ توقعات تھیں۔ دیگر تو ڈنکے کی چوٹ پر اسٹابلشمنٹ نواز رہے ہیں، اور اسی وجہ سے، ان سے تو وہی توقع رہے گی جو وہ ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں۔ شاید وہ لیون ٹراٹسکی کے قول، ''انجام ذرائع کا جواز پیش کر سکتا ہے جب تک کہ وہاں انجام کا جواز پیش کرنے کے لیے کچھ ہو''، کی تشریح اتنے بہتر انداز میں کرتے ہوں کہ جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تاہم، یہاں انجام صرف اور صرف ذاتی مفادات ہیں۔ محض اس لیے کہ سب سے زیادہ لوگ اس صف میں شامل ہو گئے ہیں، تو ضروری نہیں کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ حق پر ہیں۔ بلوچ مطالبات کو نظر انداز کرتے ہوئے، سیاسی جماعتوں کا اپنے مفادات کے لیے کیا گیا فیصلہ اور جلد بازی سے بہتی گنگا میں کودنے اور اس کا حصہ بننے کے نتائج کو سمجھنے میں بصیرت کی کمی ان کی ناپختگی اور موقع پرستی کی ایک واضح علامت ہے۔ شیخ سعدی کی ایک حکایت اس کی وضاحت کر سکتی ہے؛ اس حکایت میں، ایک گدھ چیزوں کو انتہائی دور سے دیکھنے کی اپنی غیر معمولی صلاحیت کی تعریف بڑے گھمنڈ سے کرتے ہوئے ایک چیل سے کہتا ہے: ''کسی کی نظر مجھ سے زیادہ تیز نہیں۔'' چیل اس کے دعوے کو آزمانے کے لیے اس سے پوچھتا ہے کہ اسے میدانوں میں کیا دِکھ رہا ہے۔ گدھ اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر کہتا ہے، ''تم یقین کرو گے کہ مجھے ایک دن کی مسافت کی دوری پر گندم کا ایک دانہ دکھ رہا ہے۔'' دعوے کی تصدیق کرنے کے لیے وہ اس طرف پرواز کرتے ہیں اور حیرت انگیز طور پر وہ وہاں موجود ہے۔ لیکن جیسے ہی گدھ اسے چننے کی

کوشش کرتا ہے، اچانک ایک پھندا اس کی گردن جکڑ لیتا ہے۔ چیل ادراکاً کہتا ہے، ''ایسی غیر معمولی نظر کا فائدہ کیا جو دور سے گندم کے ایک دانے کو تو دیکھ لیتی ہے مگر اس قابل نہیں کہ وہ اس پھندے کا ادراک کر سکے جو کہ اس کے ساتھ تاک میں پڑا ہوا ہے۔'' گدھ کی غیر معمولی نظر مگر بصیرت کی کامل کمی، اس کے دام میں پھنسنے اور مصائب کا سبب بنی۔

یہاں پر گدھ کی طرح نظر، باقی سب کچھ کی قیمت پر، صرف اور صرف فائدہ حاصل کرنے کے مقصد پر ٹکی ہوئی ہے، جو انتخابات کی بہتی گنگا فراہم کرتی ہے۔ بلوچستان میں سیاسی جماعتوں کو بہت کم اس بات کا ادراک ہے کہ تباہی، غارت گری اور ویرانی کا پھندا عوام کی گردن کے گرد کسا جائے گا۔ مزید برآں، اس سے بلوچ سماج ماضی کی نسبت بہت زیادہ انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا جس کی سادہ وجہ یہ ہے کہ وہ صرف اناج کے اس دانے کو دیکھ سکتے ہیں مگر ان تمام مسائل کو نہیں دیکھ سکتے جنہیں یہ عمل پیدا کرے گا۔ یہ انتخابات ایک طرف تو محض اسٹابلشمنٹ اور اسٹابلشمنٹ کی حامی جماعتوں اور سیاست دانوں کے درمیان تقسیم کو وسعت دیں گے اور دوسری طرف قوم پرست بلوچ کے درمیان، اور آخر کار یہ کسی کے لیے بھی مددگار ثابت نہیں ہوں گے۔ اس کا نتیجہ ایک انتہائی کدورت زدہ اور تیزی سے تقسیم شدہ بلوچستان کی صورت میں نکلے گا۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 31 مارچ، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/default.asp?page
=2013%5C03%5C31%5Cstory_31-3-2013_pg3_2

درویش اور فریب کار

نگران وزیر اعظم جسٹس (ر) ہزار خان کھوسہ کو مبینہ طور پر 'ناراض بلوچ رہنماؤں' کو عام انتخابات میں حصہ لینے کے لیے قائل کرنے کی خاطر بلوچستان کے دورے پر جانا تھا۔ یہ نگراں، اپنے پیشروؤں کی طرح، ایک غیر حقیقی سعیء لاحاصل میں مبتلا ہیں۔ اس سعیء لاحاصل پر مجھے شیخ سعدی کی ایک تمثیل یاد آ رہی ہے۔ ایک بادشاہ کو اپنے دائرۂ اقتدار میں رہنے والے بہت سے درویشوں (سادھو، سنیاسیوں) کی فلاح و بہبود کے بارے میں تشویش لاحق ہوتی ہے، اپنے وزیر کو کچھ پیسے دیتا ہے کہ ان کے درمیان تقسیم کر دے۔ کچھ دنوں کے بعد وزیر پوری رقم کے ساتھ واپس آیا اور کہا کہ اسے کوئی درویش نہ مل سکا۔ برہم بادشاہ نے کہا کہ وہاں تو بہت سارے ہوا کرتے تھے۔ وزیر نے پرسکون انداز میں وضاحت کی، ''اے بادشاہ، اصلی درویش پیسے کو نہیں چھوتے اور وہ جو اسے چاہتے ہیں وہ درویش نہیں بلکہ فریب کار ہیں، اس لیے میں نے انہیں نہیں دیے۔'' وہ لوگ جو انتخابات کی مخالفت کر رہے ہیں، وزیر اعظم سے نہیں ملیں گے اور وہ لوگ جو پہلے ہی سے دل کی گہرائیوں سے ملوث ہیں اور جنہیں اس بات پر قائل کرنے کی ضرورت ہی نہیں، وزیر اعظم سے ملنے کے لیے ایک دوسرے کو روند رہے ہیں۔ درویشوں کی تلاش میں نگراں وزیر کی کوئٹہ یاترا بے کار جائے گی۔ وہ جو حقیقتاً اہمیت رکھتے ہیں، کوئٹہ میں نہیں ہیں، جب کہ وہ جو بات کر رہے ہیں پہلے ہی سے تابعداری میں پیچھے کی طرف جھک رہے ہیں اور یقیناً یہ فریب کار بلوچستان کے مسائل کا حل نہیں ہیں۔

سردار اختر مینگل انتخابی عمل سے وابستہ ہیں لیکن بیک وقت شور بھی مچا رہے ہیں، جس سے انہیں 'بلوچ حقوق کے محافظ' کے طور پر آگے بڑھنے میں مدد ملے گی۔ اتھل میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا، ''بلوچستان میں منصفانہ، آزادانہ اور شفاف انتخابات ممکن نہیں ہیں

جہاں اب بھی لوگوں کو اپنے پیاروں کی مسخ شدہ لاشیں موصول ہو رہی ہیں۔'' انہوں نے دعویٰ کیا کہ خضدار ضلع میں ''ریاستی سرپرستی میں چلنے والے قاتل دستوں'' کے خوف کے سبب کوئی بھی ان کی پارٹی کا جھنڈا نہیں اٹھا سکتا۔ انہوں نے شکایت کی کہ ''صرف خضدار سے 50 فیصد سے زائد لوگ نقل مکانی کر کے اب کراچی سمیت سندھ کے محفوظ علاقوں میں رہ رہے ہیں۔'' انہوں نے زور دے کر کہا کہ ''بلوچستان میں کئی 'نو گو' ایریا ہیں جہاں اسٹابلشمنٹ اور نیم فوجی فرنٹیئر کور کے زیر سایہ مسلح قاتل گروہوں کا بول بالا ہے،'' اور ''بلوچستان میں بندوق کی نوک پر انتخابات کا انعقاد کیا جا رہا ہے جو کہ کبھی بھی آزادانہ اور منصفانہ نہیں ہو سکتے۔'' لیکن پھر ایک ہی سانس میں انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر ان کو اور ان کے سیاسی ساتھیوں کو بلوچستان کے عوام کے حقوق کے حصول کے لیے کوئی بھی آپشن دستیاب ہو تو ''ہم یقیناً ان آپشن کو استعمال کریں گے، اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نہیں روک سکتی۔'' ظاہر ہے کہ وہ آپشن انتخابات کے بعد حکومت کا برائے نام سربراہ بننا ہے۔

بلوچستان میں انتخابات جعلی ہیں، حتیٰ کہ جب مینگل بھی یہ دعویٰ کرتا ہے اسٹابلشمنٹ کی کھلی حمایت کے سبب وہاں 'قاتل دستوں' کا بول بالا ہے اور یہ واحد رکاوٹ نہیں ہے۔ حال ہی میں بلوچستان میں ٹارگٹ کلنگ کے مقدمات کی سپریم کورٹ میں سماعت کے دوران، بلوچستان حکومت کے وکیل شاہد حامد نے عدالت کو آگاہ کیا کہ ڈیرہ بگٹی کے بے گھر افراد کی طرف سے معاوضے کے لیے تقریباً 18000 درخواستیں دائر ہوئی ہیں اور اس مد میں حکومت کی طرف سے 136 ملین روپے جاری کیے گئے ہیں۔ ڈیرہ بگٹی جیسی ایک چھوٹی سی جگہ کے لیے 18000 افراد ایک خاصی بڑی تعداد ہے اور یہ بات عوام کے خلاف آپریشن کی شدت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ صرف ڈیرہ بگٹی اور خضدار وہ جگہیں نہیں ہیں کہ جہاں سے لوگوں کو نکلنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ کیا یہ لوگ اس قابل ہوں گے کہ ووٹ ڈال سکیں؟

وہ لوگ کہ جنہوں نے اسٹابلشمنٹ کے ساتھ ہاتھ ملائے ہوئے ہوں اور بیک وقت اپنے آپ کو بلوچ حقوق کا چیمپیئن بھی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہوں، عوام کو بے وقوف نہیں

بنا سکتے۔ ایساپ کی ایک حکایت سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ شدید سردیوں کی ایک رات ایک آدمی جنگل میں اپنا راستہ کھو دیتا ہے۔ جب وہ یہاں وہاں بھٹک رہا تھا تو ایک ساطیر نے اس کی تکلیف کو بھانپ کر اسے ایک رات کے لیے اپنی جگہ پر ٹھہرانے اور صبح کو اسے وہاں سے باہر نکلنے کے لیے رہنمائی کا وعدہ کیا۔ جیسے ہی وہ ساطیر کے مسکن کی طرف بڑھے تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور منہ سے ان پر پھونکنے لگا۔ ساطیر نے پوچھا، ''تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' اس آدمی نے جواب دیا، ''میرے ہاتھ ٹھنڈ سے سن ہو چکے ہیں، اور میری سانس انہیں گرم کر رہی ہے۔'' ساطیر کی جگہ پر پہنچنے کے بعد ساطیر نے اسے انتہائی گرم دلیہ پیش کیا۔ اس آدمی نے چمچہ اپنے منہ کی طرف اٹھایا اور اس پر پھونکنے لگا۔ ساطیر نے پوچھا، ''اور اب تم ایسا کس لیے کر رہے ہو؟''، ''دلیہ بہت گرم ہے، اور میری پھونک سے یہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' ساطیر نے کہا، ''دفع ہو جاؤ۔ میں کسی ایسے شخص سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا جو ایک ہی سانس کے ساتھ گرم اور سرد پھونک سکتا ہو۔'' ساطیر کی طرح بلوچ عوام بھی کسی ایسے شخص سے کوئی لین دین نہیں رکھے گا جو ایک ہی سانس کے ساتھ گرم اور سرد پھونکنے والا ہو۔ چونکہ مینگل اور ان جیسے دیگر ایک ہی سانس کے ساتھ میں گرم اور سرد پھونکتے ہیں، لوگ ان کے ارادوں سے سخت چوکنا ہیں۔ آپ کیک کو کھائیں بھی اور لے جائیں بھی، ایسا نہیں ہو سکتا۔ لوگ ایک واضح پوزیشن کا مطالبہ کر رہے ہیں؛ پس و پیش کرنے والے افراد اعتماد پیدا نہیں کر سکتے۔

چند وجوہات کہ جن کا انہیں بہ خوبی علم ہے؛ کچھ لوگوں کے لیے منتخب ہونا ایک جنون ہے۔ پاکستان مسلم لیگ ن کی محترمہ سکینہ مینگل نے، پارٹی کا ٹکٹ دینے سے انکار کے بعد، کوئٹہ میں پریس کانفرنس کے دوران خودسوزی کی کوشش کی۔ دنیا میں خودسوزی کے ایسے یادگار واقعات رونما ہوئے ہیں، سب سے حالیہ واقعہ تیونس کے ایک خوانچہ فروش محمد بوعزیزی کا ہے، جس نے میونسپل حکام کی طرف سے اس کا سامان ضبط کرنے اور اسے ہراساں اور اس کی تذلیل کرنے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے 17 دسمبر 2010ء کو اپنے آپ کو آگ لگا دی، جس سے عرب بغاوت بھڑک اٹھی۔ اور اب ان شعلوں نے پورے مشرقِ وسطیٰ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ تھک کو انگ دک،

ایک ویتنامی مہاجن بدھ راہب نے 11 جون، 1963ء کو سائیگون کی ایک مصروف سڑک کے چوراہے پر خودسوزی کی۔ چارلس یونیورسٹی میں تاریخ اور سیاسی معیشت کے ایک 21 سالہ چیک طالب علم یان پلاخ نے چیکوسلواکیا پر حملے اور پراگ بغاوت کو کچلنے کے لیے 1968ء میں کیے گئے وارسا پیکٹ کے خلاف سیاسی احتجاج کے طور پر 19 جنوری 1969ء کو خودسوزی کی۔ ان خودسوزیوں نے دیرپا اثرات چھوڑے اور یہ علامتی تھے؛ محض ایک پارٹی ٹکٹ کے لیے خودسوزی کرنا عقل کو چکرا دینے والی بات ہے۔

منتخب ہونے کے جنون کے پیچھے یقیناً ایک محرک موجود ہے؛ مالی فوائد اور اثر ونفوذ کے حوالے سے وہاں بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ منتخب ہونے کے لیے کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں اور اس کا مقصد بے لوث خدمت تو نہیں ہے؛ اس کھیل میں وہاں اور بھی بہت کچھ ہے جتنا کہ انتخابات میں کھیلا جاتا ہے۔ سندھی دانا وتایو فقیر کے ایک مزاحیہ چٹکلے سے یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔ ایک دن ایک آدمی نے وتایو فقیر کو بتایا کہ اس کی ماں پاگل ہو چکی ہے اور بازار کے وسط میں خاک پر لوٹ رہی ہے۔ گھر پہنچنے پر اس نے واقعے کے بارے میں اپنی ماں سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اسے زمین پر ایک روپیہ دکھائی دیا اور اگر وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکتی تو خدشہ تھا کہ اس کے لیے وہاں اور بھی دعوے دار ہوتے، اس لیے اس نے اسے اٹھانے کے لیے پاگل ہونے اور خاک پر لوٹنے کا ڈرامہ رچایا۔ مسکراتے وتایو نے کہا، ''بہرحال میری ماں اتنی پاگل تو نہیں سکتی۔'' سردار اختر مینگل اور دیگر جو مقابلے پر اتر آئے ہیں، یہ سب درحقیقت پاگل نہیں ہیں بلکہ وتایو کی ماں کی طرح انہوں نے زمین پر کچھ دیکھا ہے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 7 اپریل، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/default.asp?page=2013%5C04%5C07%5Cstory_7-4-2013_pg3_2

آواران

آواران، ایک ایسی جگہ جو کہ پہلے ہی سے اطاعت شعاری کے ساتھ استحصال کی کوششوں کے خلاف بہادر اور مصمّم ارادے رکھنے والے رہنما ڈاکٹر اللہ نذر اور وہاں کے لوگوں کی مزاحمت کے سبب ایک طویل عرصے سے فوج اور فرنٹیئر کور کے آپریشن کے جھٹکوں کی مار جھیل رہا تھا، میں 24 ستمبر کو 7.8 شدت کا زلزلہ آیا۔ اقوام متحدہ کے انسانی ہم دردی کے سفیر ڈاکٹر عبداللہ المطوق نے کہا کہ اقوام متحدہ بلوچستان کے زلزلہ سے متاثرہ علاقوں میں امدادی کام کے ساتھ مدد کرنے کے لیے تیار تھی لیکن پاکستانی حکام نے انکار کر دیا۔ یہ پہلی بار نہیں ہے کہ آفت زدہ بلوچ کو قدرت کے غیر یقینی رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہو اور سیکورٹی خدشات جیسے کم زور نوعیت کے بہانے تراشے گئے ہوں کہ جن کے لیے بنیادی طور پر اسٹابلشمنٹ خود ذمہ دار ہے۔ جون 2007ء میں جب سائیکلون یمین نے بلوچستان میں تباہی مچائی اور وہاں سیلاب آیا جس کے باعث پندرہ لاکھ افراد متاثر ہوئے، بین الاقوامی امدادی تنظیموں کو اچانک سیکورٹی خدشات کے بہانے روک دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بی ایس او) اور دیگر قوم پرست تنظیموں کی امدادی کارروائیوں کو بھی روکا گیا اور ان کے کیمپوں کو اکھاڑا گیا۔ آج کی حقیقت بھی ویسی ہی ہے؛ جمعرات کی صبح ڈیرہ غازی خان میں بعض بلوچ طلبا نے آواران کے زلزلے کے متاثرین کے لیے سامان جمع کرنے کے لیے ڈی جی خان پریس کلب کے قریب ٹریفک چوک پر ایک کیمپ قائم کیا لیکن جلد ہی اسے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اہلکاروں نے بدتہذیبی کے ساتھ بند کرا دیا۔ آزاد ذرائع کی خبروں کے مطابق اس بات کی تصدیق ہوئی ہے کہ نجی افراد اور غیر سرکاری تنظیموں کی طرف سے بھیجے گئے امدادی سامان کو ایف سی کی جانب سے روکا جا رہا ہے، جس کا کہنا ہے کہ صرف

وہ خود ہی ان کی تقسیم کریں گے۔ نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (این ڈی ایم اے) اور صوبائی ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کی جانب سے جاری کردہ ریلیف کے دعووں کے اعلامیے بوگس ہیں کیونکہ رپورٹوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ تک گجّر یا مالار میں کوئی امدادی سامان نہیں پہنچا تھا۔

ریلیف کا کام بنیادی طور پر سویلین حکام، ہلال احمر، اقوام متحدہ اور دیگر انسانی ہمدردی کی تنظیموں کی ذمہ داری ہے لیکن وزیر داخلہ چوہدری نثار کا کہنا ہے کہ پاکستان فوج کے 1000 فوجی زمین پر پہنچ چکے ہیں اور دیگر یونٹوں کو بھی روانہ کیا جا رہا ہے، یہ تعداد وہاں پہلے سے ہی موجود ایف سی کے ہزاروں اہلکاروں کے علاوہ ہے۔ ثنا اللہ بلوچ نے ٹویٹ کیا تھا کہ این ڈی ایم اے حکام کا کہنا ہے کہ وہ آئی ایس پی آر کی طرف سے کلیئرنس کے بغیر معلومات فراہم نہیں کر سکتے۔ اس زلزلہ سے قبل آواران کے لوگ فوج اور ایف سی کی جانب سے تادیبی کارروائیوں کا نشانہ بنتے رہے ہیں کیوں کہ نڈر ڈاکٹر اللہ نذر مارچ 2005ء میں اپنی گرفتاری اور سفاکانہ تشدد کے بعد قرب المرگ حالت میں جون 2006ء میں اپنی رہائی کے بعد مسلسل اور مؤثر طریقے سے جدوجہد کرتے آ رہے ہیں۔ انہیں 2002 میں بھی گرفتار کیا گیا تھا، جب انہوں نے بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد) کی بنیاد رکھی تھی، لیکن طلبا کی بھوک ہڑتال کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا تھا۔ آج بلوچ سرزمین پر وہ یکتا طور پر سب سے زیادہ مؤثر اور افسانوی مزاحمت کا رہنما ہیں جو اپنی تنظیم بلوچستان لبریشن فرنٹ (بی ایل ایف) کی قیادت کر رہے ہیں اور انہیں غیر مغلوب بلوچ لبریشن آرمی (بی ایل اے) اور بلوچ ریپبلکن آرمی (بی آر اے) کی طرف سے بھی اچھی خاصی پذیرائی حاصل ہے۔ جب کہ آواران میں لوگ فوج اور ایف سی کو دشمن کے طور پر دیکھتے ہیں۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ نے کہا کہ وہ، جام کمال خان، این ڈی ایم اے کے چیئرمین میجر جنرل محمد سعید علیم اور ان کے ہیلی کاپٹر جمعرات کو مشکے کے علاقے پر پرواز کر رہے تھے کہ سرمچاروں (باغیوں) کی طرف سے ان پر فائرنگ کی گئی۔ بعد ازاں نامہ نگاروں سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ، ''گولیاں ہیلی کاپٹروں کے بہت قریب سے گزریں۔ تاہم،

ہماری جانیں محفوظ رہیں۔'' انہوں نے کہا کہ عسکریت پسند رہنما اللہ نذر کو یہ سمجھنا چاہیے کہ فوج اور فرنٹیئر کور کے اہلکار زلزلے سے تباہ ہونے والے لوگوں کی مدد کے لیے علاقے میں آئے ہوئے ہیں۔ ''میں عسکریت پسند رہنما اللہ نذر اور ان کے ساتھیوں سے درخواست کرنا چاہوں گا کہ وہ ان لوگوں کے درد کو کم کرنے کے لیے ریسکیو اور ریلیف آپریشن میں شامل ہو جائیں جن کے پیارے ہلاک یا زخمی ہوئے ہیں۔'' حقیقت یہ ہے کہ اسٹابلشمنٹ اپنی جارحیت کے خلاف سرمچاروں کی طرف سے کی جانے والی جائز کارروائیوں کے ردِعمل میں بین الاقوامی تنظیموں کی امداد سے انکار کر کے لوگوں کو سزا دینا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر اللہ نذر نے امدادی سرگرمیوں میں ملوث سول تنظیموں اور نجی افراد کو مکمل تحفظ دینے کی یقین دہانی کرائی اور کہا کہ وہ ہیلی کاپٹر معاندانہ سرگرمیوں میں مصروف تھے، اس لیے ان پر حملہ ایک جائز ردِعمل تھا۔ آواران میں ایک فوجی اہلکار نے بھی تصدیق کی کہ باغی صرف سیکورٹی فورسز پر حملے کر رہے ہیں، عام شہریوں پر حملے نہیں کر رہے ہیں۔

فوج کے ساتھ ساتھ حکومت اور اس کے وزرا امدادی کاموں میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے فوری طور پر بلوچ کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ سوشل میڈیا اور مرکزی دھارے کے ذرائع ابلاغ بھی ان کی ہم نوائی میں شامل ہو چکے ہیں اور بلوچ سرمچاروں کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں کہ وہ لاپروا اور سنگ دل ہیں اسی لیے امدادی کاموں میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ افسوس کی بات ہے یہاں تک کہ پاکستان انسانی حقوق کمیشن (ایچ آر سی پی) بھی کبھی کبھار ایسے بیانات جاری کرتی ہے کہ گویا وہ آئی ایس پی آر کے اعلامیے ہوں۔ ان کی حب الوطنی انہیں بلوچ عوام کی حالتِ زار اور ناپسندیدگی کے ان جذبات کو دیکھنے سے قاصر کر دیتی ہے جو سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں بے لگام مظالم کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ انہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ وہاں کے لوگوں کے لیے فوج اور ایف سی کے ذہن میں کیسی تصویر ہے، جنہیں فوجی آپریشن، دہشت اور صدموں کی مار جھیلنا پڑی ہو، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ بی ایل ایف کے مچھلی (گوریلوں) کو (لوگوں کے) سمندر سے محروم کیا جائے جس میں وہ جو 2006ء کے بعد سے تیرتے آئے ہیں۔ وہاں کے لوگ

اورفوج کے دوجنگی فریق ہیں؛ وہاں چھ دہائیوں سے زائد عرصے کی ناقابلِ حل تلخ عداوتیں اور دشمنیاں موجود ہیں جن کی پرورش سفاکانہ مظالم اور وعدہ خلافیوں کے ساتھ ساتھ اقتصادی استحصال نے کی ہے۔ استدعا کریں اور مجھے بتائیں کہ اسٹالن گراڈ کے باشندے کس طرح کے ردِ عمل کا اظہار کرتے اگر وہ ہر ماخت کی چھٹی فوج اور چوتھی پانزر آرمی محاصرہ میں گھرے لوگوں کی مشکلات کم کرنے کے لیے امدادی اشیا لے کر آئی ہوتیں؟ بہت سے متاثرہ افراد فوج سے امدادی سامان لینے سے انکار کر رہے ہیں کیوں کہ ان کے عزیز اور پیارے یا تو لاپتہ ہوئے ہیں یا مار دیے گئے ہیں۔ میرے معزز دوست اور بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد) کے سیکرٹری جنرل شہید شہہ مرید بلوچ (رضا جہانگیر)، جنہیں 14 اگست کو ایف سی نے قتل کر دیا تھا، کا تعلق بھی آواران سے تھا۔

اگر قارئین کو لگتا ہے کہ میں مبالغہ آرائی کر رہا ہوں تو یہ خبر ان کی غلط فہمی دور کرنے میں مدد دے سکتی ہے کہ فوج کوئی غلط کام نہیں کرتی۔ حال ہی میں، اسلام آباد پولیس نے ایک فوجی افسر سمیت اسٹریٹجک پلاننگ ڈویژن (ایس پی ڈی) کے 30 سیکورٹی اہلکاروں کے خلاف قتل، اقدام قتل اور دہشت گردی کے الزامات کے تحت مقدمہ درج کیا ہے۔ نیلور کے دیہاتی جو کہ ایک دیہاتی کی پٹائی کے خلاف احتجاج کر رہے تھے، ان پر فائرنگ کی گئی جس کے نتیجے میں ایک دیہاتی ہلاک اور 10 زخمی ہو گئے۔ جولائی میں فوج کے کھلاڑیوں نے نیٹ بال میچ ہارنے کے بعد بلوچستان کے ٹیم کی پٹائی کر دی۔

اس زلزلے اور ابھرتی ہوئی صورتحال نے اسٹابلشمنٹ کو مزاحمت کی سطح اور شدت، کہ جن کا انہیں سامنا ہے، کو بادل نخواستہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ فوج امدادی کاموں کی آڑ میں علاقے میں اپنے پیر جمانے کی کوشش کر رہا ہے اور سرمچاروں کے لیے ان کی کثیر حمایت کے سبب بین الاقوامی امداد کی اجازت نہ دے کر وہاں لوگوں کو سزا دے رہا ہے۔ تاہم یہ عمل، صرف اور صرف ان کے عزم کو مضبوط ہی کرے گا۔ دیگر بلوچوں اور این جی اوز کی طرف سے مدد کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی

جائے گی اور زلزلے سے متاثرہ علاقے میں لوگوں کا وجود قائم رہے گا، لیکن پہلے ہی سے ناقابلِ علاج زخم اور ان کے نشانات مزید گہرے ہوں گے اور وہ جن مصائب سے گزر رہے ہیں، ان کے لیے وہ اسٹابلشمنٹ کو کبھی بھی معاف نہیں کریں گے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 29 ستمبر، 2013

http://www.dailytimes.com.pk/default.asp?page=2013%5C09%5C29%5Cstory_29-9-2013_pg3_2

اُس خواب سے محبت

(نوٹ: یہ ان چار مضامین کی پہلی قسط ہے جو بیک وقت شائع ہوئیں)

بلوچستان کی وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی اور وقفے وقفے کے بعد دیر تک جاری رہنے والی انقلابی حالت، سیاسی شورش کو 'غیر ملکی شہ' کے طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ موجودہ حالات کے خلاف عوام کی طرف سے محسوس کی جانی والی آزردگی اور مایوسی کی شدت اور وسعت کی آئینہ دار ہے۔

سب سے زیادہ غلط فہمیاں بلوچ جدوجہد کے بارے پائی جاتی ہیں اور اس میں بلوچ کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ پاکستانی اسٹابلشمنٹ کا مذہب کے زیر اثر ریاستی بیانیہ ہے۔ کوئی بھی نام یا ثقافتی نسل جس کا دُور سے بھی مسلمانوں کے ساتھ قریبی تعلق ہو تو اس کے لیے تاکید پر مبنی ان کی محبت غیر مشروط ہے؛ پاکستانی فلسطین، کشمیر، روہنگیا اور کوئی بھی جس کا مسلمانوں کے ساتھ کسی بھی طرح کا کوئی تعلق ہو، ان کی حمایت کرتے ہیں۔ تاہم اسی بنیاد پر وہ بلوچ کو غدار اور اسلام دشمن قرار دیتے ہیں، کیوں کہ وہ پاکستان سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔

کتنا اور کس حد تک یہ ملک اسلامی ہے، یہ سب دیکھ سکتے ہیں۔ ریاستی بیانیہ بلا کسی چوں چرا کے قبول کیا جاتا ہے اور یہی چیز ریاست کے لیے ذہنوں اور رائے کے توڑنے مروڑنے میں آسانی پیدا کرتی ہے۔ مرکزی دھارے کے ذرائع ابلاغ کے لیے بلوچ مسئلہ شجر ممنوعہ ہے اور سوشل میڈیا عام طور پر یا تو غلط معلومات پھیلاتا ہے یا منفی طور پر جانبدار ہوتا ہے۔ گراؤنڈ پر اس کام کو سرانجام دینا کافی کٹھن ہے اور میڈیا کی گنجھلدار کوریج اسے دوگنا مشکل بنا دیتی ہے۔ بہت کم کالم نگار بلوچ مسائل کے بارے میں لکھتے ہیں اور حتیٰ کہ بہت ہی کم اخبارات عام رجحان

کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انہیں چھاپتے ہیں، یہاں تک کہ بلا گز بھی انہیں قبول نہیں کرتے۔

بلوچستان کے ماضی اور حال کا تعین بلوچ بہ حیثیت قوم اپنے استقلال اور صلاحیتوں کا لوہا منوا کر کیا کرتا اور اس کا مستقبل نئے چیلنجز پیش کر رہا ہے جو کہ بلوچ سے بطور ایک قوم کے زیادہ برتر اور غیر متزلزل نقطہء نظر کا تقاضا کرتا ہے۔ بلوچ قوم کی استقامت اور جذبے کا امتحان ان کے خلاف جاری منظّم 'غلیظ جنگ' سے لیا جا رہا ہے۔ گذشتہ تین سالوں میں پاکستانی اسٹابلشمنٹ اور اس کے پراکسی قاتل دستوں کی طرف سے 700 سے زائد بلوچ کارکنوں اور عام لوگوں کو اغوا کر کے، تشدد کا نشانہ بنا کر، قتل کر کے اور پھر بلوچستان کے مختلف علاقوں میں پھینک دیا گیا ہے تاکہ بلوچ آبادی میں خوف اور دہشت کے بیج بوئے جائیں اور وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے سے پرہیز کریں۔ یہ سفاکیت وبہیمیت بلوچ کو اطاعت گزاری کروانے میں ناکام رہی ہے۔ پاکستانی اسٹابلشمنٹ سے یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ لگائے گئے داؤ کو بڑھائے چونکہ ویسے بھی وہ معاشی طور پر دیوالیہ ہیں، انہیں بلوچ وسائل کی ضرورت ہے اور چین اس جرم میں ان کا شراکت دار ہے اور اس نے انہیں بلوچستان کے وسائل کا استحصال کرنے میں مدد دینے کا وعدہ کر رکھا ہے، گوادر کا شغر سڑک اور پائپ لائن جیسے آرائشی ناموں والے منصوبوں کے ساتھ جن کا بلوچ مفادات سے کوئی لینا دینا نہیں بلکہ چین کو ایک آسان اور سستا توانائی کوریڈور (راہداری) فراہم کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔

'غلیظ جنگ' کے مرتکبین کے لیے ارجنٹائن اور چلی کے طرز پر ایک عام معافی پر غور کیا جا رہا ہے۔ یہ عام معافی لوگوں کو یہ باور کروائے گی کہ جرائم کے مرتکبین کو پہلے سے استثنیٰ حاصل نہیں ہے؛ وہاں کبھی بھی نہ کوئی گرفتاری عمل میں آئی اور نہ ہی 'غلیظ جنگ' کے مرتکبین کے خلاف کبھی کسی مقدمے کی سماعت ہوئی ہے لیکن یہ بالکل کسی تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ 1971ء میں بنگلہ دیش میں کئی ملین افراد قتل ہوئے اور لاکھوں خواتین کی عصمت دری کی گئی اور وہاں کسی ایک پر بھی مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ بلوچ کے لیے انصاف کی توقع رکھنا بعید از عقل ہے لیکن اس سے ان تمام

بلوچوں پر ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے، جنہیں اپنے لوگوں سے محبت ہے، کہ وہ پاکستانی مظالم کو اجاگر کرنے کے لیے آواز بلند کریں خواہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں اور جس طرح سے بھی کر سکتے ہوں۔

بلوچ کو ریاست کے بیانیے کو چیلنج کیے بغیر دنیا کو اپنا بیانیہ پیش کر کے ریاست کے بیانیے کو چیلنج کرنا چاہیے۔ ریاست کے بیانیے کو چیلنج کیے بغیر وہ کبھی بھی دنیا کو اپنی جدوجہد اور اپنے خواب کو سمجھانے کے قابل نہیں ہوں گے۔ بلوچ کو اپنی بے مثال جدوجہد کی تاریخ پیش کرنے اور اسے محفوظ کرنے کے اس بنیادی اہمیت کی حامل بات کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی آنے والی نسلیں اس سے سیکھیں اور باقی ماندہ دنیا اس کی حقیقت کو جانے۔ ٹویٹر پر ٹویٹس اور فیس بک پر اسٹیٹس خواہ جتنی بھی اہم، بامعنی اور عمیق کیوں نہ ہوں مگر وہ کبھی بھی سنجیدہ اور سرشار ادب کا متبادل نہیں ہوں گی۔

جدوجہد کے کلچر کو فروغ دیا جانا چاہیے تاکہ بلوچ متاثر ہو کر اور متحرک رہ کر ثابت قدم اور ڈٹے رہیں کیوں کہ پاکستان اپنے تمام وسائل کے ساتھ مالی منفعت کے لیے محبت اور غلامی کے فوائد کی رغبت پیدا کرنے کے لیے بلوچوں کی ذہن شوئی میں مصروف ہے۔ اگر یہ مشکل حالات ہمیں اپنی جدوجہد کی سطح میں اضافے کے لیے ہماری روحوں کو جدوجہد اور مزاحمت کی ثقافت کے لٹریچر کی تخلیق کے لیے اکسا نہ سکیں تو ہم بلوچ قوم کے لیے اپنی تاریخی ذمہ داریوں کو نبھانے میں ناکام ہوں گے۔ بلوچ اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں؛ یہ وہ مقصد ہے جس کی وہ آرزو رکھتے ہیں اور یہ وہ خواب ہے کہ جسے وہ تعبیر ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کے لیے، اس کے پاس دستیاب رقم کے ساتھ، یہ کام انتہائی آسان ہے کہ وہ اطاعت گزاری اور غلامی کے بدلے ملنے والے فوری انعامات کی لالچ سے نئے رنگروٹ حاصل کر لے جب کہ ہمیں ایک خواب کے لیے قربانیوں کی حوصلہ افزائی کرنی ہے، ایک خواب جو سب سے زیادہ محبوب ہے مگر پھر بھی اس کا حقیقت میں بدلنا انتہائی مشکل ہے اور لوگوں کو اس پر قائل کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ ہمیں اس

خواب سے محبت کرنی ہے تاکہ ہم اس خواب کے ساتھ لوگوں کو متاثر کرنے کے قابل ہوں۔ میں تمام بلوچوں سے ایک پرخلوص اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس خواب کے لیے متحد ہو جائیں کیونکہ جب تک کہ ہم متحد نہیں ہوں گے، یہ خواب ہمیشہ صرف ایک خواب ہی رہے گا۔

تاریخ

بلوچ کو اب اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہے یا اب وہ اس بابت فکرمند نہیں ہیں کہ وہ پاکستان سے اپنی علیحدگی کے لیے کوئی تاریخی، سیاسی یا اقتصادی جواز پیش کریں لیکن وہ لوگ جنہیں اس موضوع پر علمی اور تاریخی دلچسپی ہے، ان کے لیے میں یہ تاریخ پیش کر رہا ہوں۔

بلوچ کا ماخذ اور ابتدائی تاریخ' اساطیر اور لوک داستانوں کے دھند میں لپٹی ہوئی ہیں۔ بعض مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ وہ کلدانی ہیں؛ کچھ کا اصرار ہے کہ وہ عرب ہیں کیونکہ اسی طرح کے نام کے حامل قبائل اب بھی وہاں رہتے ہیں جب کہ دیگر کا کہنا ہے کہ وہ ترکمان ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ بلوچ وقت کے ساتھ ساتھ ہجرت کر کے یہاں آئے، شاید ظلم وستم کی وجہ سے، چونکہ بلوچ کا اس سنگلاخ و ناہموار قطع زمین کو اپنے مسکن کے طور پر انتخاب کرنے سے یہی پتہ چلتا ہے۔

وہاں کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے جو ان پیش کیے گئے نظریات کو ثابت کرنے میں معاون ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس خطے کے قریبی علاقوں میں بہت سارے بلوچ رہتے ہیں جو موجودہ دور کے پاکستان، افغانستان اور ایران میں آباد ہیں اور قبائلی، لسانی، سماجی اور خونی بندھن کا دعویٰ کرتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ میں ایک نسل ہیں۔ اس کے علاوہ، ان کا اپنے بھائیوں کے لیے احساسِ انسیت، خواہ وہ جہاں کہیں بھی رہتے ہوں، بذاتِ خود ان کی تاریخی وحدانیت کی طرف ایک اشارہ ہے اور یہ امر ان کے اپنے اقتدار کے تحت اتحاد کے لیے ان کی خواہش کا اظہار بھی ہے۔

قبائلی داستانیں ضرورت کے وقت مختلف افراد یا گٹوں کو قبیلے کی مختلف پرتوں میں یکجاہ

کر کے ساتھ لینے کے واقعات سے بھری پڑی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان داستانوں میں ان علاقوں کے نام اور وہاں قدم جمانے کے لیے لڑی گئی لڑائیوں کا ذکر بھی ہے، جہاں آج بلوچ قبائل موجود ہیں۔ یہ شریک کار بنانے کا عمل بلوچی اور براہوی زبانوں کے درمیان فرق کی بھی وضاحت کر سکتے ہیں۔ دری، فارسی اور کردی کے ساتھ ساتھ بلوچی بھی انڈو یوروپی زبانوں کی شاخوں میں سے ہے؛ کچھ مورخین کہتے ہیں کہ اس کا ماخذ ایک معدوم زبان ہے۔

مختلف اوقات میں کوششیں کی گئیں کہ بلوچ اور براہوی کے درمیان فرق پیدا کیا جائے اس امید میں کہ یہ فرق ان کے درمیان موجود اتحاد کو کمزور کر دے گا لیکن یہ کامیاب نہیں ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد جب بلوچستان کو عارضی طور پر آزادی کا درجہ حاصل تھا، خان کلات کی اسمبلی کے غالب براہوی بولنے والے ارکان کی اکثریت نے کثرت رائے سے بلوچی کو قومی زبان کے طور پر قبول کرنے کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

فردوسی کے 'شاہنامہ' میں بلوچ کا ذکر موجود ہے جو اشارہ کرتا ہے کہ وہ کافی حد تک ایک اہم قوت تھے کہ اس میں ذکر کے مستحق قرار پائے۔ ایران میں ان دونوں نسلوں کے درمیان مخاصمت اور مذہبی اور سیاسی اختلافات کی وجہ سے وہاں بلوچ کی تاریخ جان بوجھ کر مٹائی یا مسخ کر کے پیش کی جا رہی ہے۔

بلوچ لوک داستانوں میں 12 ویں صدی میں کرمان اور سیستان سے میر جلال ہان کی قیادت میں مکران میں 44 بلوچ قبائل کی آمد کا بھی ذکر موجود ہے۔ وہاں کے مقامی حکمران کو شکست دینے کے بعد سب سے پہلی بلوچ کنفیڈریسی کا قیام عمل میں آیا۔ میر احمد یار خان کہتے ہیں کہ اصل مرکزی گروہ مکران آیا، ایک چھوٹا گروہ سیستان گیا اور براہوی نامی ایک گروہ کلات میں بس گیا۔ میر جلال ہان کی موت اس کے بیٹوں کے درمیان عداوت اور مکران اور کلات کے درمیان تنازعے پر منتج ہوئی۔

پھر یہاں میر چاکر خان رند یا 'بلوچِ اعظم' آئے جنہوں نے آج کے بلوچستان کے بڑے

حصے پر حکومت کی اور اس کا دارالحکومت سبی (سیوی) کو بنایا۔ رند اور لاشار کے درمیان خانہ جنگی بلوچ حکمرانی کے لیے کمزوری کا موجب ثابت ہوئی۔ 1511ء میں چاکر نے ہجرت کی اور ست گرہ ملتان میں جلاوطنی کے دوران انہوں نے وفات پائی۔ بلوچ نے شیر شاہ سوری سے تخت دوبارہ حاصل کرنے میں ہمایوں کی مدد کی اور انہیں دہلی کے قریب فراخ نگر اور بہادر گڑھ کے نام سے جانے جانی والی دو جائیدادیں دی گئیں۔ بہت سے اردو بولنے والے بلوچوں نے تقسیم کے بعد سندھ کی طرف ہجرت کی۔

ڈیرہ جات کنفیڈریسی سہراب خان دودائی (1451ء) نے قائم کی جو چاکر خان کے ہم عصر تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ فتح خان کے ڈیرہ جات ان کے صاحبزادوں کے نام سے منسوب ہیں۔ ڈیرہ غازی خان جو غازی خان ملرانی بلوچ سے منسوب ہے، اگرچہ بعض کہتے ہیں کہ وہ بھی سہراب خان دودائی کے صاحب زادے تھے۔ یہ کنفیڈریسی رندوں کے ساتھ تنازعے کی وجہ سے کمزور ہوگئی اور یہ تنازعہ منظوم داستان کی شکل میں محفوظ ہے۔ قبائل کے مابین دشمنی نے بلوچ کی طاقت کو اس طرح سے مرتکز ہونے نہیں دیا، جس طرح میر نصیر خان نے کلات کی خانیت کے لیے کی تھی۔

کلات کی خانیت حقیقی معنوں میں قریب 1666ء میں شروع ہوئی، جب میر احمد خان اول نے وہاں کی سرداری سنبھالی۔ میر گل خان نصیر کے مطابق وہ سب سے پہلے سربراہ تھے جنہوں نے ایک مقتدر کی حیثیت سے کلات پر حکمرانی کی اور افغانوں کے ساتھ مسلسل تفاوت میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد میر محراب نئے خان منتخب ہوئے اور اپنی حاکمیت قائم کرنے کے لیے وہ ایرانیوں سے لڑے۔

نصیر خان، کلات خانیت کے چھٹے خان، کے ساتھ سنہری دور (1741–1795) شروع ہوا۔ اس مدت کے دوران وہ، ان سے قبل یا ان کے بعد کسی بھی دیگر حکمران کے مقابلے میں زیادہ، پورے بلوچستان کو ایک مرکزی بیوروکریسی کے قیام کے قریب لائے۔ ان کا ایک 'وزیر'

(وزیراعظم) تھا جو تمام داخلی اور خارجی امور کی نگرانی کرتا اور ایک 'وکیل' تھا جس کی ذمہ داری ریاست کی زمینوں سے آمدنی اور رسمی طور پر منسلک حاکموں اور سرداری ریاستوں سے خراج وصول کرنا تھا۔ دو قانون ساز کونسل تھے، قبائل کی طرف سے منتخب کردہ ایوان زیریں اور بزرگوں پر مشتمل ایوان بالا جو مشاورتی حیثیت میں خدمات سرانجام دیتا تھا۔ نینا سوڈلر کے مطابق یہ رشتہ داری کی بنیاد پر قبیلے کے مختار کل سربراہ اور مرکزی بیوروکریٹک ریاست کی سربراہی کے درمیان کی کوئی چیز تھی۔

سن 1747ء میں نادر شاہ کی موت کے ساتھ نصیر خان نے ایران کی باج گزاری کی حیثیت کو رد کر دیا۔ جب احمد شاہ نے افغانستان میں ایک نئی سلطنت قائم کی تو نصیر خان کو گیارہ سال تک افغان فرمانروائی تسلیم کرنے پر مجبور کیا گیا لیکن جب ایک بار انہوں نے اپنی فوجی طاقت مضبوط کر لی تو افغانوں پر فوجی لحاظ سے چڑھائی کر دی اور 1758ء میں احمد شاہ کی افواج کے خلاف جنگ کر کے انہیں حالتِ امتناع تک پہنچا دیا اور ایک امن معاہدہ جسے 'کلات معاہدہ' کے طور پر جانا جاتا ہے، اس میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ خانِ بلوچ افغانستان کو خراج ادا نہیں کرے گا، دونوں اطراف عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل پیرا رہیں گے اور افغانستان کے قبضے میں موجود خانیت کے تمام علاقے خانیت کو واپس لوٹائے جائیں گے، پر دستخط کیے گئے۔

نصیر خان کو تمام بلوچوں کی طرف سے ایک ہیرو کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے جو کچھ انہوں نے بلوچ کو ایرانی اور افغانی باج گزاری کے طوق کو اتار پھینکنے اور بلوچستان میں خود بلوچ کی اپنی ایک منظّم حکمرانی قائم کرنے کے لیے کیا۔ ان کے دورِ اقتدار میں خاران، سیستان (ایران، افغانستان) کے کچھ حصے، ایرانی بلوچستان، ڈیرہ جات، کراچی، مکران، چاغی، جیکب آباد اور کوئٹہ خانیت کا حصہ تھے۔ انہوں نے پانی پت کی تیسری لڑائی (1761ء) میں مراٹھوں کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں کی مدد کی اور 1765ء میں سکھوں کے خلاف احمد شاہ کی مدد کی۔

سن 1795ء میں ان کی رحلت کے بعد ان کے سات سالہ بیٹے میر محمود خان جانشین ہوئے

لیکن انتظامی امور ان کے 'وزیر' اخوند فتح محمد چلایا کرتے۔ ان کے دورِ اقتدار میں ڈیرہ جات پر افغانوں کا قبضہ ہو گیا، مکران اور مغربی بلوچستان کے دیگر سرداروں نے بھی خراج دینے سے انکار کر دیا، مختصر یہ کہ 1810ء میں پوٹنگر اور دیگر نے خانیت کو افراتفری اور انتشار کی حالت میں پایا۔

سن 1817ء میں محراب خان محمود خان کے جانشین بنے لیکن انہوں نے سرداروں اور وزیروں کے خلاف ایک نہایت ہی جابرانہ پالیسی اپنائی جو صرف ان قوتوں کو متنفر کرنے میں کامیاب ہوئی جو کہ خانیت کو مضبوط بنانے میں ان کی مدد کر سکتے تھے۔ برطانوی حکومت نے بھارت میں اپنی طاقت مرتکز کرنے کے لیے افغانستان میں سازشیں شروع کر دی تھیں اور علاقے کو محکوم بنانے کے لیے وہ سانٹھ گانٹھ کے کھیل مصروف تھے۔ وہ شاہ شجاع کو ایک بار پھر افغانستان کے بادشاہ کے طور پر نصب کرنے کے لیے کابل تک فوجیں بھیجنا چاہتے تھے اور انہیں دریائے سندھ کے پاس موجود اپنی فوج کو بولان کے ذریعے ایک محفوظ راستے کی ضرورت تھی۔ برطانوی حکومت محراب خان کو اطاعت گزاری پر مجبور کرنے کے لیے دھمکیوں اور وعدوں کے ذریعے ان پر دباؤ ڈالتے اور ان کی خوشامد کرتے رہے اور آخر کار 1839ء کے اوائل میں محراب خان نے محفوظ راستے اور رسد کے لیے کیپٹن برنز کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کر دیے۔

برطانوی حکومت کسی زیادہ لچیلے شخص کو بطور خان دیکھنا چاہتی تھی تاکہ انہیں کسی پریشانی کے بغیر خطے میں اپنی حکمرانی کے خواب کی تکمیل میں آسانی ہو۔ قبائل نے ہمیشہ خان کی فرمانبرداری نہیں کی اور مری قبیلے کی طرف سے بولان پاس اور اس سے ملحقہ علاقوں میں برطانوی افواج پر حملے کیے گئے۔ اس چیز کو جواز بنا کر سر جان کین کی قیادت میں جنگی سامان سے لیس فوج نے 11 نومبر 1839ء کو کلات کا محاصرہ کیا اور 13 نومبر کو محراب خان اپنے وفادار حامیوں کے ہمراہ قتل کیے گئے۔ محراب خان کی برطانوی حکومت کے خلاف سرکشی کے اس عمل کے سبب انہیں ایک ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد سے برطانوی حکومت اپنی مرضی کے مطابق بلوچستان کے امور میں ساز باز کرتی رہی۔

ٹالپر، ایک بلوچ قبیلہ، جو ڈیرہ غازی خان کے علاقے بھرگرہ سے آیا تھا، جہاں ان میں سے کچھ اب بھی رہتے ہیں اور کبھی کبھار کہا جاتا ہے کہ وہ مری قبیلے سے ہیں اور کبھی کبھی لیغاری کی شاخ کہلاتے ہیں، تقریباً 1670 عیسوی میں سندھ میں آئے اور بعد میں 1783ء سے لے کر 1843ء تک سندھ پر حکومت کی۔ میر شہداد خان، بھرگرہ سے تعلق رکھنے والے میر سلیمان کا کو کے پوتے جو 1734ء میں انتقال کر گئے، وہ شخص تھے جنہوں نے سندھ میں ٹالپر حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ ان کے صاحبزادے میر بہرام خان کلہوڑہ حکمرانوں کے وزیر تھے اور ان کے پوتے میر فتح علی سندھ کے پہلے ٹالپر حکمران تھے۔ وہ اگرچہ بلوچ نژاد ہونے کے باوجود خانیت اور دودائی کنفیڈریسی کے ساتھ ایک مشترکہ محاذ نہیں بنا سکے۔ بلوچ اقتدار کے یہ چھوٹے چھوٹے مراکز اگر اس وقت متحد ہو چکے ہوتے تو شاید آج بلوچستان کی ایک مختلف تاریخ ہوتی۔

سن 1854ء میں برطانیہ نے وسطی ایشیا اور ایران کی طرف سے کسی بیرونی حملے کے خلاف اپنے علاقوں کے دفاع کے لیے خان، بلوچستان کے حکمران، کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ 1870ء میں برطانوی حکومت نے بلوچستان کی خانیت کے ساتھ سرحد کی تخصیص کرنے پر اتفاق کیا۔ 1871ء میں برطانوی حکومت نے ایرانی تجویز قبول کر لی اور میجر جنرل گولڈاسمڈ کو مشترکہ فارس بلوچ باؤنڈری کمیشن کا چیف کمشنر مقرر کیا، ایران کی نمائندگی مرزا ابراہیم اور خانیت بلوچستان کی نمائندگی سردار فقیر محمد بزنجو نے کی جو مکران کے گورنر تھے۔ بلوچ مندوب نے مغربی بلوچستان کا دعویٰ پیش کیا اور ایرانیوں نے کوہک سمیت مکران کے بیشتر علاقے پر دعویٰ کیا۔

کئی ماہ کے مذاکرات کے بعد، گولڈاسمڈ نے تاریخ، جغرافیہ، ثقافت یا مذہب پر غور کیے بغیر، اور ان بلوچ سرداروں، جو خود کو خان کی رعیت شمار کرتے تھے، کے بیانات کو نظر انداز کر کے بلوچستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایرانی حکومت نے 4 ستمبر، 1871ء کو کوہک، اسفندک اور کونابستہ کے علاقوں سمیت ایک چھوٹے سے حصے کو فارس کے حوالے کیے جانے کی درخواست کی۔ اس درخواست کو برطانوی بھارت کی حکومت کے حوالے کیا گیا اور اس پر جنرل گولڈاسمڈ

سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے اپنا خیال تبدیل کرتے ہوئے اس علاقے کی منتقلی پر ایران کی طرفداری کی۔

سن 1896ء اور 1905ء میں ایک اینگلو فارسی مشترکہ سرحدی کمیشن ایران اور برطانیہ کے درمیان بلوچستان کو تقسیم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ سرحدی حد بندی کے عمل کے دوران برطانوی حکام نے بلوچستان کی خانیت کے کئی علاقے ایران کے حوالے کر دیے جو ایرانی حکومت کو خوش کرنے کی امید کر رہے تھے تاکہ وہاں روسی اثر و رسوخ پر نظر رکھ سکیں۔ 1896ء کا معاہدہ 1854ء اور 1876ء کے معاہدوں کی صریحاً خلاف ورزی تھا، جس نے فارس بلوچ سرحد کو ایران اور بھارت کی سرحد قرار دے دیا۔ 1905ء کے معاہدے کے تحت خانیت نے میر جاوا کا علاقہ کھو دیا اور اس کے بدلے میں ایرانی حکومت نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ 1896ء کے معاہدے کے مطابق اس سرحد کو حتمی شمار کیا جانا چاہیے اور اس سلسلے میں کوئی مزید دعویٰ نہیں کیا جانا چاہیے۔

سیستان کی حتمی سرحدی حد بندی برطانوی کمشنر سر میکموہن کی طرف سے 1904ء میں ہوئی، یہ بلوچ افغان سرحد یا میک موہن لائن نیوچمن سے لے کر فارس بلوچ سرحد تک کے علاقے پر محیط ہے۔ اس سرحد کی حد بندی 1896ء میں بھارت افغان باؤنڈری کمیشن کی طرف سے کیپٹن (بعد میں سر) اے ہنری میک موہن کی سربراہی میں کی گئی۔ یہ سرحد بلوچ کے ملک اندر سے گزرتی ہے جس نے ایک ہی خاندان کو ایک دوسرے سے جدا کیا اور ایک ہی قبیلے کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ فارس بلوچ سرحد کی حد بندی کی طرح برطانیہ نے یہاں پر بھی خان سے مشاورت نہیں کی جو اس سرحد کی قانونی درستگی کو مشکوک بنا دیتی ہے۔

اگرچہ خانیت کی طاقت اپنی سابقہ شان و شوکت کھو چکی تھی لیکن پھر بھی قبائلی سرداروں کی طرف سے خان کو، حاکمیت کی وفاداری کے پابند ہونے کے سبب، قدر و منزلت حاصل تھی جس نے برطانوی حکومت کو بلوچ کے ساتھ اپنے تعلقات کے حوالے سے خانیت کو ایک خصوصی حیثیت دینے پر مجبور کیا۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ ایک قائم شدہ عملداری اور اتحاد کی علامت کو

اچانک ہٹانا اس خطے کو اس کی غرض و غایت کے حوالے سے استعمال کرنے کے ان کے مقاصد کے لیے سودمند ثابت نہیں ہوگا لیکن خانیت کے ساتھ ان کے تعلقات برطانیہ کے نہایت محدود مفادات پر مبنی تھے اور کوئی بھی معاہدہ یا کوئی بھی مراعات دی یا لی گئیں ان کی رہنمائی صرف اسی اصول نے کی۔

سن 1841ء، 1854ء اور 1876ء کے معاہدے اور مابعد کی گئی تبدیلیاں اور برطانیہ کے فائق مفادات، باوجود اس کے کہ خانیت کی آزاد حیثیت کو سب نے قبول کیا تھا اور یہ 1947ء تک جاری رہی، جب آخر کار برطانیہ نے نامناسب عجلت کے ساتھ اقتدار چھوڑا تو یہ لاکھوں لوگوں کے لیے مصائب کا باعث بنا اور اس سے بلوچ اور دیگر قومیتوں کے مفادات خطرے میں پڑ گئے۔ وگرنہ وہ اپنی منتخب کردہ راہ چل پڑتے جس سے وہ ایک زیادہ منصفانہ اور مساوی دنیا میں رہ رہے ہوتے۔

بشکریہ: ویو پوائنٹ آن لائن، جمعرات، 10 اکتوبر 2013

http://www.viewpointonline.net/loving-the-dream.html

سیاسی بیداری

(نوٹ: یہ ان چار مضامین کی دوسری قسط ہے جو بیک وقت شائع ہوئیں)

برصغیر میں دیگر تمام جگہوں کی طرح بلوچستان میں بھی سیاسی بیداری بتدریج آئی تھی اور یہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سوویت یونین اور نوآبادیاتی مخالف تحریکوں کے اثر ورسوخ کی وجہ سے رفتار پکڑتی گئی۔ میر عبدالعزیز کرد نے 1920ء میں 'ینگ بلوچ' نامی ایک خفیہ سیاسی تحریک کا آغاز کیا اور 1929ء میں انہوں نے 'انجمن اتحادِ بلوچستان' میں شمولیت اختیار کی جو یوسف علی خان مگسی کے جیل جانے کے بعد قائم کی گئی تھی، انہیں اپنے مضمون 'فریادِ بلوچستان' میں کیے گئے آئینی اصلاحات کے مطالبے پر پابند سلاسل کیا گیا تھا، جس میں انہوں نے برطانوی حکومت اور ریاست کلات کے وزیراعظم سر شمس شاہ، جو کہ گجرات سے تعلق رکھنے والے ایک پنجابی تھے، کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ انجمن کا مقصد بلوچستان کی آزادی تھا اور اس نے آئینی اصلاحات کا مطالبہ کیا اور برطانوی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ وزیراعظم کی مخالفت کی، جنہیں بالآخر ان کی مخالفت کے سبب برخاست کر دیا گیا۔

شہزادہ محمد اعظم جان کو دسمبر 1931ء میں انجمن کی حمایت سے خان مقرر کیا گیا اور انہوں نے وزیراعظم کو برخاست کر دیا۔ حالانکہ انجمن نے خان کی مدد کی تھی لیکن وہ اس کے مقاصد کا حامی نہیں تھا۔ انجمن کی طرف سے بلوچستان کی آزادی کے مقصد کا واضح الفاظ میں اظہار جنرل سیکرٹری عزیز کرد کی طرف سے کیا گیا، جنہیں ہندوستانی اخبارات میں بھارت کی مختلف جماعتوں کے رہنماؤں کی جانب سے سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔

احمد یار خان، جو 1933ء میں اعظم جان کی وفات کے بعد خان بنے، نے میر یوسف علی مگسی کو اپنے ذاتی نمائندے کے طور پر خانیت کی خودمختاری پر بات چیت کے لیے برطانیہ بھیجا لیکن ان کا جواب حوصلہ شکن تھا۔ 1935ء میں کوئٹہ کے بڑے زلزلے میں یوسف علی مگسی وفات پا گئے اور اس سے ان کی انقلابی قیادت بے وقت اپنے اختتام کو پہنچی۔ فروری 1937ء میں انجمن کا سبی میں اجلاس منعقد ہوا اور قلات نیشنل پارٹی باضابطہ طور پر قائم کی گئی اور اسے بلوچ معاشرے کے مختلف طبقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ برطانوی حکومت کے ساتھ ساتھ سرداروں نے بعض وجوہات اور اپنے مفادات کے لیے مختلف توجیہات اور بنیادوں پر پارٹی کی مخالفت کی لیکن مشترکہ بنیاد ان کی اپنی مراعات اور اختیارات تھے۔

مورخہ 6 جولائی 1939ء کو منعقدہ پارٹی کے سالانہ اجلاس کو کچھ سرداروں کے پیروکاروں کی طرف سے تہہ و بالا کیا گیا، جنہوں نے خان سے مطالبہ کیا کہ پارٹی پر پابندی لگائی جائے۔ 20 جولائی کو کلات کے وزیراعظم نے کلات نیشنل پارٹی کو کلات ریاست کی حدود کے اندر غیر قانونی قرار دے دیا۔ اس کے رہنماؤں، ملک عبدالرحیم خواجہ خیل، میر غوث بخش بزنجو، عبدالکریم شورش، میر گل خان نصیر، اور دیگر سرگرم کارکنوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ پارٹی نے اپنا ہیڈ کوارٹر کوئٹہ میں قائم کیا لیکن دوسری عالمی جنگ کے باعث سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی مگر پھر بھی پارٹی نے اپنی سرگرمیاں زیرِ زمین جاری رکھیں۔

نیشنل پارٹی، انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانگریس (کانگریس نواز) کے ساتھ مل گئی اور محمد حسین عنقا اور بزنجو جیسے رہنماؤں نے کلات کے بھارت کے ساتھ الحاق کی حمایت کی اور خان کے آزاد بلوچستان کے مطالبے کی مخالفت کی۔ اس تبدیلی نے پارٹی کو تقسیم کر دیا جیسا کہ عزیز کرد اور دیگر نے اس نئی پالیسی کی مخالفت کی اور اس سے نفاق پیدا ہوا۔ تاہم 1947ء میں نیشنل پارٹی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اپنی اس پالیسی پر نظرِ ثانی کی اور ایک بار پھر بلوچستان کی آزادی کا مطالبہ کیا۔

بلوچستان میں دیگر دو اہم جماعتیں کام کر رہی تھیں؛ ایک انجمن وطن پارٹی تھی جسے عبدالصمد اچکزئی نے تشکیل دیا اور اس کی قیادت کر رہے تھے اور اس نے برطانوی افغانستان میں آئینی اصلاحات کی حمایت کی اور یہ انڈین کانگریس پارٹی سے وابستہ تھی۔ اس نے پشتونوں کی نمائندگی کی اور ان کے لیے حقوق کا مطالبہ کیا۔ دوسری مسلم لیگ تھی، جسے قاضی ایم عیسیٰ نے 1938ء میں قائم کیا اور اس کی قیادت کی۔ اس پر بھی پشتونوں کا غلبہ تھا اور وہ ان کے حقوق کا مطالبہ کرتی تھی۔

جون 1947ء میں برطانوی حکومت نے بھارت کی تقسیم کے منصوبوں کا اعلان کیا۔ برطانوی افغانستان اور بلوچ قبائلی علاقوں، جن میں مری، بگٹی، کھیتران اور ڈیرہ غازی خان کے بلوچ قبائلی علاقے شامل تھے، کے مقدر کا فیصلہ ایک ریفرنڈم کے ذریعے کیا جانا تھا۔ ریفرنڈم میں ووٹ دینے کے معاملے پر وہاں اختلافِ رائے موجود تھا چونکہ برطانوی حکومت نے حقِ رائے دہی کو موروثی شاہی جرگہ تک محدود کر رکھا تھا، جناح نے ووٹنگ کے حقوق میں توسیع کی تجویز دی، نہرو نے شاہی جرگہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ہر ممکن بڑی سے بڑی تعداد کے ساتھ مشاورت کی تجویز پیش کی۔

برطانوی حکومت نے دونوں کے ساتھ اتفاق نہیں کیا۔ اگرچہ ماؤنٹ بیٹن نے منتخب جرگہ کے ذریعے ریفرنڈم کی حمایت کی مگر اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ 29 جون کو پشتون جرگہ نے برطانوی افغانستان کا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کی حمایت کی۔ بلوچ اس ریفرنڈم کو جعلی قرار دیتے ہیں کیوں کہ جرگے کے لیے ابتدائی اجلاس 21 جولائی 1947ء کو منعقد ہوا اور اس سے شور شرابہ تھم گیا اور 30 جون کو جرگہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن پھر پرفریب انداز میں تمام اراکین کو بتائے بغیر 29 جون کو اجلاس منعقد کیا گیا۔ اس ریفرنڈم کے ساتھ اور اسی کی بنیاد پر برٹش بلوچستان بشمول لیز پر دیے گئے اور قبائلی علاقوں سمیت، جو کہ آئینی طور پر خانیت کا حصہ تھے، 15 اگست 1947ء کو غیر قانونی طور پر پاکستان میں شامل کر دیے گئے۔

مری بگٹی علاقوں کے بلوچ سرداروں، سردار دودا خان مری، جو کہ سردار خیر بخش مری اور

سردار محمد اکبر خان کے بااختیار نائب تھے، نے برطانوی حکومت سے خانیت میں شامل ہونے کے لیے اپنے فیصلے کا تحریری طور پر اظہار کیا، باوجود اس کے کہ وہ ابھی تک خانیت کے وفاق میں شامل نہیں تھے۔ اسی عمل کے لیے ڈیرہ جات کے کئی بلوچ سرداروں کی درخواستوں کو بھی برطانیہ کی طرف سے نظرانداز کر دیا گیا۔

یہ امر دلچسپی کا حامل ہے کہ تقسیم کے بعد ڈیرہ جات کے سرداروں کو یہ انتخاب کرنے کا استحقاق دیا گیا تھا کہ یا تو وہ اپنی مراعات سے دستبردار ہو کر بلوچستان میں شامل ہو جائیں یا پنجاب میں شامل ہو کر انہیں برقرار رکھیں۔ اس برطانوی زیرانتظام بلوچستان کے علاقے ڈیرہ غازی خان کو 1950ء میں پنجاب نے خیانت کرتے ہوئے ہڑپ لیا۔ تمن داروں نے اس تخویف کے تحت معاہدے پر دستخط کیے کہ اگر وہ پنجاب میں شامل نہیں ہوئے تو انہیں اپنی بڑی زمینیں اور جائیدادیں ترک کرنا پڑیں گی۔ اس ناانصافی کی ایک یادگار سطح سمندر سے 6470 فٹ کی بلندی پر فورٹ منرو پر کھڑی ہے۔ برطانوی حکومت نے برطانوی زیرانتظام بلوچستان کے لوگوں کو وہ حقوق نہیں دیے جو انہوں نے برطانوی زیرانتظام افغانستان کو دیے تھے۔

بھارت میں برطانوی حکام نے بلوچستان کو ہمیشہ بطور ایک آزاد اور خودمختار ہستی سمجھا اور اسے کبھی ہندوستانی برصغیر کا حصہ نہیں سمجھا۔ برطانوی حکومت اور خان کلات کے درمیان 1854ء اور 1876ء میں کیے گئے معاہدوں میں بلوچستان کو بھارت کے باہر ایک خودمختار ملک کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ 3 جون 1947ء کے تقسیم کے منصوبے میں پاکستان اور برطانیہ دونوں نے ریاست کلات کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کیا تھا۔

مورخہ 4 اگست 1947ء کو پاکستان، برطانوی حکومت اور بلوچستان کے درمیان ایک سہ فریقی معاہدے پر دستخط کیے گئے، جو اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ کہلاتا ہے، جس میں بلوچستان کی خود مختار حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس معاہدے کی پہلی شق میں کہا گیا ہے کہ: پاکستان کی حکومت کلات کی بطور ایک آزاد اور خودمختار ریاست کی حیثیت کو تسلیم کرتی ہے، جس کے برطانوی حکومت کے

ساتھ دوطرفہ تعلقات ہیں اور جس کا درجہ اور مقام دیگر بھارتی ریاستوں سے مختلف ہے۔ مئی 1946ء میں کابینہ مشن میں کلات کی یادداشت (کلات میمورنڈم)، جسے جناح نے پیش کیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ کلات ایک غیر ہندوستانی ریاست ہے اور اس کی آزادی کی حمایت کی گئی تھی۔ جناح جون 1947ء تک اسی بات پر قائم رہے۔ برطانوی نوآبادیاتی حکومت کے دوران صرف بھارت، نیپال اور کلات وہ ریاستیں تھیں جنہیں سفیر کی تقرری کا اختیار حاصل تھا۔

خان نے پاکستان کی آزادی سے دو روز قبل 12 اگست 1947ء کو بلوچستان کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ خان نے بلوچستان کی ایک خوشحال خودمختار ملک کے طور پر تعمیر کرنے، جہاں بلوچ اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے اور اپنی روایات کے مطابق رہتے ہوئے، اپنے پڑوسی ممالک پاکستان، ایران اور افغانستان کے ساتھ ساتھ بھارت اور بیرونی دنیا کے ساتھ دوستی کے معاہدوں کے ذریعے تعلقات قائم کرنے کے اپنے ارادے کا اعادہ کیا۔

آزادی کے فوراً بعد دیوان کے انتخابات منعقد کیے گئے، اس میں بلوچستان کے دو حصوں پر مبنی مقنّنہ اور ملک میں امن و آشتی کے دور کو یقینی بنایا گیا تھا۔ دیوان دارالامرا، قبائلی سرداروں کا ایوان یا ایوان بالا اور دارالعوام (یا ایوان زیریں) پر مشتمل تھا۔ دارالامرا جھالاوان اور سراوان صوبوں کے موروثی قبائلی سرداروں پر مشتمل تھا، جن کی تعداد 35 تھی۔ دارالعوام کے 52 ارکان تھے، 47 منتخب ہوتے اور 5 خان کی طرف سے نامزد کیے جاتے تھے۔

اسمبلی نے ستمبر اور دسمبر 1947ء میں اجلاس منعقد کیے اور اکثریت نے اتحاد کی حمایت کی اور پاکستان کے ساتھ الحاق کی مخالفت۔ 14 دسمبر 1947ء کو غوث بخش بزنجو نے ایک تاریخی تقریر کی اور اسے آزادی کے لیے ایک درست دلیل تصور کیا جاتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ ''ہم ایران اور افغانستان کی طرح ایک الگ تہذیب اور ایک الگ ثقافت رکھتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ مسلمان کے ہونے کے باعث ہمیں اپنی آزادی گنوا دینی چاہیے اور دوسروں کے ساتھ ضم ہو جانا چاہیے۔ اگر محض یہی بات، کہ ہم مسلمان

ہیں، ہم سے پاکستان کے ساتھ شامل ہونے کا تقاضا کرے تو پھر افغانستان اور ایران، دونوں مسلم ممالک، کو بھی پاکستان میں شامل ہو جانا چاہیے۔

ہم برطانوی حکومت سے قبل کبھی بھی بھارت کا حصہ نہیں رہے۔ پاکستان کی مکروہ اور گھناؤنی خواہش، کہ ہمارے قومی وطن بلوچستان کو اس کے ساتھ ضم ہو جانا چاہیے، پر غور کرنا تک ناممکن ہے۔ ہم خودمختاری اور برابری کی بنیاد پر اس ملک سے دوستی کرنے کو تیار ہیں لیکن کسی طرح سے بھی پاکستان کے ساتھ ضم ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم پاکستان کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے بغیر پاکستان کا کیا ہوگا؟''

''میں دفاع اور بیرونی مواصلات کے معاملات میں نوتخلیق شدہ پاکستان کے لیے رکاوٹیں پیدا کرنے کی تجویز نہیں دے رہا ہوں۔ لیکن ہم عزت مندانہ تعلقات چاہتے ہیں نہ کہ ذلت آمیز۔ اگر پاکستان ہم سے ایک خودمختار قوم کے طور پر برتاؤ برتنا چاہتا ہے تو ہم دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھانے کے لیے تیار ہیں۔ اگر پاکستان ایسا کرنے پر اتفاق نہیں کرتا اور جمہوری اصولوں کو روندتا ہے تو اس طرح کا رویہ ہمارے لیے مکمل طور پر ناقابلِ قبول ہوگا، اور اگر ہمیں یہ مقدر قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تو پھر ہر بلوچ فرزند اپنی قومی آزادی کے دفاع میں اپنی زندگی قربان کر دے گا۔''

اسی اثنا میں پاکستان نے نوآزاد ریاست کلات پر پاکستان میں شامل ہونے کا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور کلات اور پاکستان کے درمیان تعلقات میں ایک مضطرب خاموشی چھا گئی۔ پاکستان اور کلات کے درمیان مذاکرات کھنچتے چلے گئے۔ پاکستان نے خان اور بلوچ ریاستی مشینری کو مختلف حیلوں سے ہراساں کرنے کا سلسلہ جاری رکھا، وہ خان کو پاکستان میں شامل ہونے پر مجبور کرنے کے لیے سازشوں اور مکارانہ ہتھکنڈوں میں مصروف تھا۔

جب پاکستان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ خان الحاق قبول نہیں کریں گے تو اس نے لسبیلہ اور خاران، جو کہ کلات سے وفاداری کی پابند ریاستیں تھیں، اور مکران جو کہ ریاست کلات کے ایک

ضلع سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا، کے ساتھ الحاق کے علیحدہ دستاویز کے ذریعے 18 مارچ کو شامل ہونے کا اعلان کیا۔ مکران، خاران اور لسبیلہ کے الحاق کے ساتھ کلات اپنے آدھے سے زیادہ علاقے اور سمندر تک اپنی رسائی سے محروم ہو گیا۔

اگلے روز خان کلات نے ایک بیان جاری کیا اور اس بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا کہ پاکستان دنیا میں مسلم حقوق کے چمپیئن کے طور پر اپنے چھوٹے مسلمان ہمسایوں کے حقوق کی خلاف ورزی کر سکتا ہے اور نشاندہی کی کہ مکران کی، بطور قلات کے ایک ضلع کے، کوئی جداگانہ حیثیت نہیں ہے اور یہ کہ لسبیلہ اور خاران کی خارجہ پالیسی اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ (امتناعی معاہدے) کے مطابق کلات کے ماتحت رکھی گئی تھیں۔

مورخہ 26 مارچ 1948ء کو پاکستانی فوج کو بلوچ ساحلی علاقے پسنی، جیونی اور تربت جانے کا حکم دیا گیا۔ یہ پاکستانی فوج کے خصوصی مہمی دستے کی طرف سے یکم اپریل 1948ء کو دارالحکومت کلات پر چڑھائی سے قبل جارحیت کا پہلا واقعہ تھا۔ فوج کے ساحلی علاقے میں منتقلی کے بعد 27 مارچ 1948ء کو خان ان کے آگے جھک گئے اور کراچی میں اس کا اعلان کیا گیا کہ خان کلات نے اپنی ریاست کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر اتفاق کر لیا ہے۔ کلات کے آئین کے تحت خان کے پاس ایسا بنیادی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ بلوچستان اسمبلی نے پہلے ہی سے کسی بھی بہانے بلوچستان کی آزادی کو خیرباد کہنے کی کسی بھی تجویز کو ٹھکرا دیا تھا۔ بھارت سے برطانوی انخلا کے بعد خودمختار بلوچ ریاست صرف 227 دن قائم رہی۔

سن 1948ء میں خانیت کا پاکستان میں ضم ہونے کا نتیجہ بلوچستان بھر میں بدامنی اور پاکستان مخالف ریلیوں کی صورت میں نکلا۔ نیشنل پارٹی، جو کہ ایک ''گریٹر بلوچستان'' کے نصب العین کی وکالت کرتی تھی، نے الحاق کو مسترد کر دیا اور بیشتر شورشی مظاہروں کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ اس کے قائدین، میر غوث بخش بزنجو، میر عبدالعزیز کرد اور دیگر کو گرفتار کر لیا گیا۔ خان کے چھوٹے بھائی کی طرف سے ایک مختصر دورانیے کی بغاوت کو پاکستان فوج نے بے رحمی سے کچل دیا اور

بغاوت کے رہنما شہزادہ عبدالکریم کو قید کر دیا۔ بلوچ اور ریاست پاکستان کی افواج کے درمیان یہ پہلی مڈبھیڑ ایک نئے نوآبادیاتی طاقت کے ہاتھوں قوم پرستانہ عدم تحفظ اور جبر کے خوف کی تشکیل میں ایک اہم عنصر تھی۔

ریاست کلات کا پاکستان کے ساتھ جبری الحاق، جس سے خودمختار اور نیم خودمختار بلوچ ریاست کے تین سو سالہ دور کا خاتمہ ہوا، بلوچوں کی تاریخ کے عہد ساز واقعات میں سے ایک تھا۔ نوآبادیاتی نظام، خواہ وہ ایران کی ہو، افغانستان، برطانیہ یا پاکستان کی، نے قوم پرستی کے شعور کی سانچہ سازی میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے جو کہ اپنی ابتدائی شکل میں ان کی پوری تاریخ میں موجود رہی ہے لیکن خوابیدہ رہی ہے، اسی لیے وہ اپنی جدوجہد کو اس انداز میں آگے بڑھانے کے قابل نہیں رہے تھے جیسا کہ وہ اس وقت کر رہے ہیں۔ یہ شعور جو انہوں نے ایک انتہائی تلخ قیمت پر حاصل کیا ہے، اب اپنی تقدیر کا مالک خود بننے کے لیے ان کی جدوجہد میں ایک فیصلہ کن عنصر بنتا جا رہا ہے۔

بشکریہ: ویو پوائنٹ آن لائن، جمعرات، 10 اکتوبر 2013

Original text:

Part 1 - Loving the dream:

https://app.box.com/s/uy8h7f9tpubju8orsxyla01j9k05wgdq

Prat 2 - Political awakening

https://app.box.com/s/qk433xqyd4mf4veo9ar486lhec2lvndj

گراؤنڈ زیرو بلوچستان

(نوٹ: یہ ان چار مضامین کی تیسری قسط ہے جو بیک وقت شائع ہوئیں)

معاشی محرومی اور جابرانہ سیاسی حالات کی سطح جو بلوچستان کو آج حاصل ہے، ان کی وجہ بار بار کیے جانی والے فوجی آپریشن اور 1947ء کے بعد سے معاشی استحصال جو عام طور پر عوام اور خاص طور پر لاپتہ افراد اور داخلی طور پر بے گھر افراد (آئی ڈی پیز) کے لیے بے پناہ مصائب پر منتج ہوا ہے۔ وہاں کی 'سیاسی شورش' وفاق کی بے حسی اور طاقت کے بے لگام استعمال کی ایک طویل تاریخ کا براہِ راست نتیجہ ہے۔

معاشی محرومی اور غربت کی سنگین نوعیت کو پیش کرنے کے لیے میں ان ماہرین کا حوالہ دوں گا جو وہاں کے حالات سے بہ خوبی واقف ہیں۔ ڈاکٹر قیصر بنگالی کا کہنا ہے کہ ''بلوچستان میں ترقیاتی منظر کا ایک جائزہ لیا جائے تو یہ بہت تکلیف دہ ہے اور صوبے میں محرومی دیگر کی نسبت انتہائی حد تک خراب ہے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ بنیادی ڈھانچے سے محروم 20 اضلاع میں سے اٹھارہ بلوچستان میں ہیں۔ فیصد کے حساب سے اضلاع کی محرومی کی اعلیٰ ترین سطح کی درجہ بندی مندرجہ ذیل ہے: پنجاب میں 29 فیصد، سندھ میں 50 فیصد، خیبر پختونخواہ میں 62 فیصد، اور بلوچستان میں 92 فیصد۔ اگر کوئٹہ اور زیارت کو خارج کر دیا جائے تو پورا بلوچستان شدید محرومی کے زمرے میں آتا ہے۔ اور کوئٹہ کی سطح گر جائے گی اگر اس تجزیے میں سے کنٹونمنٹ (چھاؤنی) کے علاقے کو خارج کر دیا جائے۔ وہ آبادی جو شدید محرومی کی اعلیٰ ترین سطح میں رہ رہی ہے، فیصد کے حساب سے کچھ یوں ہے: پنجاب میں 25 فیصد، شہری سندھ میں 23 فیصد، دیہی سندھ میں 49 فیصد، خیبر پختونخواہ میں 51 فیصد، اور بلوچستان میں 88 فیصد۔

اگر اسے غربت کے لحاظ سے ناپا جائے تو غربت کی لکیر سے نیچے رہنے والی آبادی فیصد کے تناسب سے اس طرح ہے: پنجاب میں 26 فیصد، دیہی سندھ میں 38 فیصد، شہری سندھ میں 27 فیصد، صوبہ سرحد میں 29 فیصد، اور بلوچستان میں یہ 48 فیصد کی سطح پر کھڑی ہے۔''

ایک اور قابلِ احترام تجزیہ کار سید فضل حیدر کا کہنا ہے کہ، ''غربت سادہ آمدنی (تفویض صرف) اور محرومی کے بجائے ایک کثیر الجہتی تصور ہے۔ غربت کا کوئی ایک پیمانہ، جیسا کہ فی کس 'غربت کی لکیر' کے مخصوص پیمانے پر مبنی تناسب غربت کی تمام جہتوں کا احاطہ نہیں کرتا اور نہ ہی وسیع تر انسانی دکھوں کی اصل وجوہات کی مکمل طور پر عکاسی کرتا ہے۔ 'غربت کی موزونیت' انڈیکس جو کہ محرومی کے عناصر کی تین اہم ترین جہتوں کا مجموعہ ہے جس میں صحت، تعلیم اور آمدنی آتے ہیں، اس سلسلے میں بہت مفید ہے۔ بلوچستان کی صورت میں، کوئی بھی پیمانہ یہی دکھائے گا کہ یہ سب سے غریب ترین صوبہ ہے۔

پاکستان کے باقی حصوں میں 86 فیصد کے مقابلے میں اس کے لوگوں کی صرف 20 فیصد آبادی کو پینے کے صاف پانی تک رسائی حاصل ہے۔ ملک کے باقی حصوں میں 75 فیصد کے مقابلے میں یہاں کے دیہاتوں میں سے بجلی صرف 25 فیصد کو میسر ہے۔ بچوں کی شرح اموات 1000 میں سے 100 کی قومی شرح کے مقابلے میں یہاں 108 ہے۔ بنیادی سہولیات اور تعلیم تک رسائی کی صورتحال بھی دوسرے صوبوں کے نسبت یہاں نہایت کم ہے۔''

وہ اس غفلت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں، ''مرکز میں فیصلہ سازی کے عمل میں بلوچستان تقریباً بے نوا ہی رہتا ہے اور اس کی کوئی نہیں سنتا۔ اس کی آبادی کا 50 فیصد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ آمدنی کی بنیاد پر انسانی ترقی میں عدم مساوات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مالی سال 2000-2001 کے دوران، دیگر کے مقابلے میں صوبے کے لیے خوشحال پاکستان پروگرام کے کل بجٹ کا صرف 9.2 فیصد مختص کیا گیا تھا، جب کہ صوبہ سرحد کے لیے 16.2 فیصد، سندھ کے لیے 19.7 فیصد، اور پنجاب 48 فیصد۔ پروگرام کے پہلے سال کے دوران مختص کردہ بجٹ کی رقم کا استعمال صوبے کے لیے 2.8 فیصد پر سب سے کم تھا، جب کہ اس کے مقابلے میں صوبہ سرحد میں

7.7 فیصد، سندھ میں 8.2 فیصد، اور پنجاب میں 19 فیصد رہی۔

مالی سال 2004ء میں صوبائی ترقیاتی پروگراموں کے لیے وفاقی امداد صوبہ سرحد کے لیے 56 فیصد، پنجاب کے لیے 28 فیصد، سندھ کے لیے 19 فیصد اور بلوچستان کے لیے صرف آٹھ فیصد تھی۔ پنجاب میں فارن پراجیکٹ اسسٹنس (ایف پی اے) یا غیر ملکی امدادی منصوبے میں مختص حصہ پنجاب کے لیے 53 فیصد، صوبہ سرحد 29 فیصد، سندھ 12 فیصد اور بلوچستان کے لیے ایک بار پھر صرف چھ فیصد تھا۔''

اگر کوئی ماؤں کی شرح اموات کا سروے کرے تو ایک ہولناک تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جو کہ بلوچستان میں فی ایک لاکھ بچوں کی پیدائش میں 650 ہے، جبکہ کراچی میں یہ 281 ہے۔ یہ قومی اوسط کا دگنا ہے۔ بلوچستان میں بچوں کی شرح اموات فی 1000 زندہ پیدائشوں میں 158 ہے، حتیٰ کہ ڈیموکریٹک ریپبلک آف کانگو کی اوسط 126 ہے جو کہ اس سے بھی کم ہے، جبکہ پاکستان کی قومی اوسط 70 اس کے نصف سے بھی کم ہے۔ تعلیم کے میدان میں بھی اعداد و شمار یکساں طور پر مایوس کن ہیں، خواتین کی تین چوتھائی اور دس سال کی عمر سے زیادہ کی آبادی کا دو تہائی ناخواندہ ہے۔ متاثرہ مری بگٹی علاقوں میں اور داخلی طور پر بے گھر افراد کے درمیان حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہیں۔

یہ اعداد و شمار اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ بلوچستان کو نہ صرف کامل غفلت کے سبب بلکہ اسے محرومی کی حالت میں رکھنے کی دیدہ دانستہ کوششوں کی وجہ سے بھی تکلیفیں جھیلنا پڑی ہیں جہاں وہ سرداروں کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کیونکہ حتیٰ کہ حکومت کی عملداری کے تحت علاقوں میں بھی کوئی خوشحالی نہیں آئی ہے۔

بگٹی کے علاقے کی مثال لے لیں، اگرچہ گیس 1951ء میں سوئی میں دریافت ہوئی اور یہ ملک کی کل گیس کی پیداوار کا تقریباً 45 فیصد پورا کرتی ہے اور اس کی مالیت 85 ارب روپے سالانہ بنتی ہے اور ڈیرہ بگٹی یہ دولت پیدا کرنے کے بدلے میں جو حاصل کرتا ہے وہ یو این ڈی پی کی 2003ء کی انسانی ترقی کی رپورٹ سے واضح ہے، جس نے ڈیرہ بگٹی کی رینکنگ کو ہیومن

ڈویلپمنٹ انڈیکس (ایچ ڈی آئی) پر ملک کے 91 اضلاع میں سب سے آخر میں رکھا ہے۔ اس چونکا دینے والی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ایچ ڈی آئی پر سب سے اوپر کے 31 اضلاع میں سے صرف تین بلوچستان سے تعلق رکھتے تھے، جب کہ ایچ ڈی آئی پر سب سے کم ترقی یافتہ 30 اضلاع میں سے 12 کا تعلق اس صوبے سے ہے۔

بلوچستان 347641 مربع کلومیٹر (134000 مربع میل) رقبے اور گنجانیء آبادی محض 18.9 مربع میٹر فی مربع کلومیٹر کے ساتھ مغرب میں ایران، شمال مغرب میں افغانستان، بحیرۂ عرب کے ساتھ تقریباً 750 میل طویل ساحل جو کہ تقریباً اسٹریٹجک حوالے سے اہمیت کی حامل آبنائے ہرمز کے شمالی ساحلوں تک پھیلا ہوا ہے جو اسٹریٹجک حوالے سے علاقائی اور بین الاقوامی طاقتوں کے بروکرز اور بڑی طاقتوں کے لیے اہمیت کا حامل ہونے کے باعث اور اپنی وسیع زمین اور غیر دریافت شدہ وسائل کی وجہ سے بھی زیرنگینی اور استعماریت کے لیے ایک اہم نشانہ ہے۔

آئیں ان دستیاب وسائل کا مختصر طور پر جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگ جن دل سوز حالات میں زندگی گزار رہے ہیں، آیا وہ جائز اور درست ہے اور اسی اثنا میں قوم پرستوں کے اس دعوے اور اصرار کی بھی جانچ کرتے ہیں کہ بلوچستان کے پاس ایک آزاد ہستی کے طور پر زندہ رہنے کے لیے کافی دولت موجود ہے؛ انہیں لگتا ہے کہ وہ یہ کر سکتے ہیں۔ بلوچ قوم پرستوں کی طرف سے وسائل کی تلاش اور استحصال کی مسلسل مخالفت اور مزاحمت کی گئی ہے۔

اندازے کے مطابق 12.3 ملین ٹن تانبے اور 20.9 ملین اونس سونے کی قیاس شدہ اور ظاہراً وسائل کے ساتھ ریکوڈک چاغی میں تانبے/سونے کا ایک بہت بڑا پروجیکٹ ہے۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ وہاں موجود ذخائر ایران میں سرچشمہ اور چلی میں اسکوندیدو سے بھی بڑے ہیں۔ وہاں سے دو لاکھ ٹن تانبے اور چار لاکھ اونس سونے کی سالانہ پیداوار ہونے کی امید ہے۔ اس کا لیز بدنام زمانہ بیرک گولڈ کارپوریشن کے پاس ہے۔ سینڈک تانبے اور سونے کی کانیں چینیوں کی طرف سے چلائے جا رہے ہیں۔ پاکستان کو اس سے 2004ء تا 2008ء کے دوران سونے کے 7.746 ٹن کی پیداوار ملی ہے۔ نہ تو چاغی اور نہ ہی بلوچستان کو اس دولت سے کوئی فائدہ پہنچا ہے۔

کرومائٹ 1901ء میں مسلم باغ میں دریافت کیا گیا تھا، جہاں اس وقت اس کی پیداوار 300 سے 500 ٹن یومیہ ہے، جس کی مقامی مارکیٹ میں قیمت 30,000 روپے سے لے کر 45,000 روپے کے درمیان ہے۔ کرومائٹ کے ذخائر مغربی بلوچستان میں راسکوہ رینج اور ضلع خضدار کے علاقے وڈھ میں بھی دریافت کیے گئے ہیں۔

بلوچستان میں تصدیق شدہ خام لوہے کے بڑے ذخائر کی مقدار 278 ملین ٹن سے بھی زیادہ ہے اور ان میں سب سے بڑا ذخیرہ مستونگ کے قریب دلبند میں واقع ہے۔ یہ کچ دھات اب تک پاکستان میں دریافت شدہ باقی کچ دھات کے ذخائر کے مقابلے میں سب سے بہتر سمجھی جاتی ہے۔ نومبر 2005ء میں بولان مائننگ انٹرپرائز کی تنصیبات پر حملہ کیا گیا اور لاکھوں کی مشینری کو تباہ کر دیا گیا۔

سب سے اہم خزانوں میں سے ایک، قدرتی گیس کے ذخائر جس نے ملک کی تقدیر بدل دی، اس سے بلوچستان کے علاوہ سب کو فائدہ ہوا ہے۔ سید فضل حیدر کا کہنا ہے کہ ''سوئی گیس فیلڈ ملک کی کل گیس کی پیداوار کا تقریباً 45 فیصد پورا کرتا ہے۔'' پی پی ایل وہاں اپنے 80 سے زائد کنوؤں سے 720 سے لے کر 750 ملین کیوبک فٹ گیس روزانہ پیدا کر رہا ہے۔ صوبہ 85 ارب روپے مالیت کی قدرتی گیس سالانہ پیدا کرتا ہے لیکن وفاقی حکومت کی طرف سے رائلٹی کے طور پر اسے صرف 7 ارب روپے دیے جاتے ہیں۔ گیس فیلڈ سے نکالی جانے والی گیس سے 12.5 فی صد مقرر کردہ رائلٹی ''منبع کی قیمت'' پر مبنی ہے جو کہ دیگر صوبوں میں دیگر گیس فیلڈز کی نسبت مارکیٹ کی قیمت سے کم ہے۔

چھ دہائیاں گزر چکی ہیں، مگر حتیٰ کہ آج بھی بلوچستان میں گیس صارفین 3.4 فیصد ہیں جب کہ اس کے مقابلے میں اکیلے پنجاب کے صارفین 51 فی صد ہیں جو کہ محض 4.75 فی صد گیس پیدا کرتا ہے۔ اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ بلوچ اسے جلانے کے حق کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ کس طرح استعمال کیا جانا چاہیے، اس کا فیصلہ کرنے کا حق چاہتے ہیں۔

جے سی وان ویکنر، امریکی آئل کمپنی ایموکو کے پاکستان میں آپریشنز کے ایک سابق

ڈائریکٹر، نے سیلگ ہیریسن کو بتایا کہ ماضی میں ایموکو کی طرف سے تدڑی جاندران بمبور میں کیے گئے فضائی سروے میں خیال کیا گیا ہے کہ گیس کے ذخائر کے علاوہ 'ایک شاندار، بہت بڑے ڈھانچے' میں کئی ملین بیرل تیل کے ذخائر دیکھے گئے ہیں۔ او جی ڈی سی کی ایک رپورٹ میں بمبور، پیرکوہ اور ڈھوڈک سے منسلک ایک وسیع علاقے کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ 'یہ ایک طلائی تثلیث کی تشکیل کرتے ہیں اور مستقبل میں پٹرولیم کے متوقع ذخائر کی تلاش کی کوششوں میں اس علاقے پر توجہ مرکوز کی جانی چاہیے۔' اس میں کوئی تعجب نہیں کہ مری علاقے محکومی کو دوام دینے اور شورش کو دبانے کے لیے اسٹابلشمنٹ کی ترجیحات میں سرفہرست ہیں۔

سید فضل حیدر کا کہنا ہے کہ ''صوبہ ہرنائی، ڈگاری، مچھ، زیارت، چمالنگ اور آبِ گم میں کوئلے کے وسیع ذخائر کا حامل ہے، اندازے کے مطابق 217 ملین ٹن۔ 60 کلومیٹر طویل چمالنگ کے کوئلے کی کانوں میں کل چھ ملین ٹن کے ذخائر ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ''اس سے پیدا شدہ نوکریوں کی تعداد 10,000 سے لے کر 50,000 تک ہوسکتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق چمالنگ کی کانوں سے کوئلے کی فراہمی سے سالانہ 30 ارب روپے کا منافع ہوگا۔'' حال ہی میں وہاں کان کنی میں ملوث ٹرانسپورٹ اور لوگوں پر حملے ہو چکے ہیں جس سے یہ یقینی نہیں ہے کہ ان ذخائر سے ان کی آمدنی کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوگا۔

اس کا 750 میل طویل ساحل واقعتاً اسے سمندری خوراک کے وسائل کی ایک محفوظ افزائش گاہ بناتا ہے اور ساحل کے ساتھ بسنے والے لوگ ایک طویل عرصے سے ذریعہ معاش کے ذرائع کے طور پر اسی پر گزر بسر کرتے آئے ہیں۔ پسنی، اور ماڑہ، اور گوادر وغیرہ میں ساحل کے ساتھ تعمیر کیے گئے متعدد بحری اڈے مقامی لوگوں کی ماہی گیری کی ان پانیوں تک آسان رسائی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ سیکورٹی خدشات کے سبب عوام کا ان علاقوں میں جانا ممنوع ہے اور انہیں یہاں سے گزرنے بھی نہیں دیا جاتا۔

بلوچ قوم پرستوں کے لیے زمین ایک بہت بڑا متنازع مسئلہ ہے جیسا کہ انہیں ڈر ہے کہ باہر کے لوگوں کو زمین کی فروخت نہ صرف زمین پر ان کے تاریخی حقوق کی خلاف ورزی ہے بلکہ یہ

عمل انہیں ایک اقلیت میں تبدیل کر دے گا۔ زمینوں پر قبضہ اس حد تک غیر قانونی ہے کہ سپریم کورٹ کوئٹہ کے دو رکنی بنچ کے جسٹس جاوید اقبال اور جسٹس راجہ فیاض احمد نے اکتوبر 2006ء میں گوادر میں رہائشی اور صنعتی پلاٹوں کی الاٹمنٹ کی منسوخی کا حکم دیا اور کہا کہ 'ہر الاٹمنٹ، فروخت، اور زمین کی منتقلی سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں انتہائی مبہم اور مشکوک انداز میں کیا گیا ہے۔ ہنگول پارک اور سونمیانی بھی ہڑپ لیے گئے'۔

بلوچ کے مسائل کی جانب غفلت اور بے حسی جمہوری حکومت کے ساتھ تبدیل نہیں ہوئی ہے۔ اس نے بھی منصوبوں کے حوالے سے بنائی گئی پالیسیاں جاری رکھی ہوئی ہیں کہ جنہوں نے عام لوگوں کی زندگی کو چھوا تک نہیں ہے۔ مارچ میں اعلان کیے گئے صدارتی پیکیج کے پیسے کا بڑا حصہ ڈیموں کے تصرف میں چلا جائے گا۔ ان ڈیموں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، کیونکہ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ابتدائی طور پر ایک ملین ایکڑ زمین خلیجی ریاستوں کو فروخت یا لیز پر دی جائے گی۔ خبر کے مطابق متحدہ عرب امارات نے بلوچستان میں ڈیڑھ لاکھ ہیکٹر یا 370,658.0722 ایکڑ سے زائد زمین میرانی ڈیم کے قریب حاصل کر لی ہے اور بعض نجی کمپنیوں نے اس کے توسط سے پاکستان میں 800,000 ایکڑ زمین خریدی ہے۔

اوپر بیان کیے گئے حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلوچستان نہ صرف پاکستان کا سب سے بڑا اور مادی طور پر امیر ترین صوبہ ہے بلکہ دراصل سب سے کم فی کس آمدنی کے ساتھ غریب ترین صوبہ بھی ہے۔ اس کی آبادی صرف 6 فیصد ہے، جس کا مطلب درحقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دوسرے صوبے کی فی کس آمدنی اگر بلوچستان سے کم ہوتی تو تب بھی یہ کافی حد تک امیر صوبہ ہوتا۔ بلوچستان اس سے بہت زیادہ غریب ہے جتنا کہ اعداد و شمار بتاتے ہیں۔ انہی حالات نے مجھے بلوچستان کو 'گراؤنڈ زیرو' کہنے پر اکسایا ہے۔

استحصال محض اقتصادی اور سیاسی نہیں ہے بلکہ اسٹابلشمنٹ کی طرف سے وہاں تعلیم کے ذریعے سماجی و ثقافتی اقدار میں تبدیلی لانے کا ایک اور منحوس پہلو بھی موجود ہے جس کے بارے میں فوج زیادہ فکرمند لگتی ہے۔ فوج نے بلوچ سماجی و ثقافتی اقدار، وہ اقدار جو آزادی میں غربت کو

کھاتی پیتی غلامی سے بہتر سمجھتے ہیں، کی شکل بگاڑنے کا بیڑہ بنیادی طور پر اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ ملٹری کالج سوئی (ایم سی ایس) میں اپنی تقریر میں جنرل کیانی نے کہا کہ 20,000 سے زائد بلوچ طلبا کو پاکستان آرمی اور ایف سی کے زیرانتظام چلنے والے تعلیمی اداروں میں داخلہ دیا گیا ہے، بشمول کیڈٹ اسکولوں، میڈیکل کالجوں، کان کنی کی تربیت گاہوں اور دیگر اداروں کے۔ یہ عموماً ویسا ہی ہے جیسا کہ آسٹریلوی گورے وہاں کے ایبوریجنیز کو مہذب بنانے کی کوشش کر رہے ہوں؛ پاکستانی ریاست تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قتل کرنے میں مصروف ہے تو لہٰذا یہ ان کے لیے تعلیم نہیں چاہتی بلکہ چاہتی ہے کہ یہ لوگ اس کی خدمت گزاری کریں۔

تعلیم کے میدان میں بھی بلوچ کے خلاف امتیازی سلوک برتا جاتا ہے اور اس کے لیے وہاں پر ایک منظّم کوشش جاری ہے، جسے فاروق سلہریہ تعلیمی رنگ بھید کا نام دیتے ہیں اور جس پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ بلوچستان میں تعلیم کو فروغ دینے کے تمام دعوؤں کو فاروق سلہریہ نے زور نامہ 'دی نیوز' میں شائع ہوئے اپنے بہترین تحقیقاتی ادارتی مضمون ''تعلیمی رنگ بھید'' میں بھرپور انداز میں بے نقاب کیا ہے، جو یہ ثابت کرتا ہے کہ بلوچستان کے خلاف امتیازی سلوک پر کس طریقے سے عمل کیا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''پنجاب اور پنجاب کے زیرغلبہ مرکزی دھارے کے ذرائع ابلاغ میں بلوچ شکایات کو اکثر معروف حیلوں بہانوں سے مسترد کر دیا جاتا ہے۔ ایک گھسا پٹا عذر یہ ہے کہ بلوچ سردار صوبے میں ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ تاہم، ہر بار جب کوئی اس منظّم امتیازی سلوک، جس کا بلوچستان کو نشانہ بنایا جاتا ہے، کو دیکھتا ہے تو اسے یہی دیکھنے کو ملتا ہے کہ یہ ترقی مخالف بلوچ سردار نہیں ہیں بلکہ یہ 'وفاق' ہے جو پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ رہا ہے۔''

وہ کہتے ہیں کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) کی طرف سے بلوچستان پر عائد تعلیمی رنگ بھید بالکل واضح ہے، ابتدا سے لے کر اب تک، مالی سال 3-2002 تا 13-2012 تک اس نے 157,102 ملین روپے مالیت کے کل 737 منصوبے مختص کیے ہیں۔ ان میں سے محض 9433 ملین مالیت کے 48 منصوبے بلوچستان کی سات جامعات کو تفویض کیے گئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ

بلوچستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی (بی یو ای ٹی) خضدار کو 10 سال میں 284 ملین روپے کے (آٹھ منصوبے) حاصل ہوئے لیکن لاہور کی یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کو 8,361 ملین روپے (23 منصوبے) دیے گئے۔ اسی طرح سے لسبیلہ یونیورسٹی آف ایگریکلچر، واٹر اینڈ میرین سائنسز (ایل یو اے ڈبلیو ایم ایس) کو 1,943 ملین روپے (پانچ منصوبے) دیے گئے جب کہ یونیورسٹی آف ایرڈ ایگریکلچر راولپنڈی اور یونیورسٹی آف ایگریکلچر فیصل آباد کو بالترتیب 1,815 ملین روپے (21 منصوبے) اور 2,647 ملین روپے (25 منصوبے) عطا کیے گئے۔ اسی طرح سے بلوچستان کی اکلوتی ویمن یونیورسٹی کو 965 ملین روپے موصول ہوئے جبکہ ایف جے ویمنز یونیورسٹی راولپنڈی، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی لاہور اور ویمن یونیورسٹی ملتان کو دل کھول کر 879 ملین روپے (10 منصوبے)، 847 ملین روپے (13 منصوبے) اور 1,144 ملین روپے (ایک منصوبہ) بالترتیب مختص کیے گئے۔

سلہریہ مزید کہتے ہیں کہ تعلیمی میدان میں بلوچستان جس امتیازی سلوک سے دوچار ہے، وہ اس بات سے مزید واضح ہو جاتا ہے جب اسلام آباد کے لیے مختص کی گئی رقم اور منصوبوں کا موازنہ کیا جائے کیوں کہ یہ موازنہ آبادی کے تناسب میں فرق کی دلیل کی بھی نفی کر دیتا ہے۔ وہاں ایچ ای سی کی دریادلی سے دو سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والوں میں نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (این یو ایس ٹی) اور کامسیٹ انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی (سی آئی آئی ٹی) کو بالترتیب 15,205 ملین روپے (22 منصوبے) اور 7,337 ملین روپے (28 منصوبے) عطا کیے گئے جو اتفاق سے بلوچستان کو الاٹ کی گئی کل رقم سے 13,145 ملین روپے زیادہ ہے۔ بلوچستان کو مختص کی گئی کل رقم این یو ایس ٹی اور سی آئی آئی ٹی کو مختص کی گئی کل رقم کے نصف سے بھی کم ہے۔

سلہریہ کہتے ہیں کہ اس امتیازی سلوک کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ایچ ای سی کی بیوروکریسی اسے پنجاب کے حق میں کرنے کے لیے جان بوجھ کر اور بدنیتی سے طریقہ کار میں توڑ مروڑ کرتا ہے، 60 فیصد پنجابی اپنے 50 فیصد مختص کوٹہ پر بیرون ملک گئے جب کہ بلوچ کی نمائندگی اس کے

چھ فیصد کوٹہ سے بھی نیچے رہی ہے۔

تو پھر اس میں کسی تعجب کی بات نہیں کہ وہاں ایک شدید اور مسلسل نفرت اور تلخی موجود ہے جس کی تلافی عارضی تدابیر اور نیم بریاں تخفیفی اقدامات سے ممکن نہیں ہے، جن کا وفاقی حکومت آزادی کے لیے روز بروز بڑھتی ہوئی مانگ اور 'سیاسی شورش' کی غالب صورتحال کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اعلان کرتی رہتی ہے۔ مسئلہ صرف معاشی نہیں ہے بلکہ درحقیقت بنیادی طور پر یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے جسے نہ طاقت کے ذریعے اور نہ ہی میگا پراجیکٹس کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے۔ اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ قوم پرست محض وسائل پر حقوق کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی معاملات کے بارے میں اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کے حق کا مطالبہ کر رہے ہیں جو کہ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ صرف آزادی کے ساتھ ممکن ہوگی۔

بشکریہ: ویو پوائنٹ آن لائن، جمعرات، 10 اکتوبر 2013

Part 3 - Ground zero: Balochistan

https://app.box.com/s/8kh36gg5uc2xz1oqvicoqikbm6prujms

مزاحمت اور بقا

(نوٹ: یہ ان چار مضامین کی چوتھی اور آخری قسط ہے جو بیک وقت شائع ہوئیں)

ناانصافیوں نے بلوچ کو نہ صرف اپنے حقوق کے لیے بلکہ اپنی بقاء کے لیے بھی لڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسٹابلشمنٹ نے 60ء اور 70ء کی دہائیوں میں لاطینی امریکہ کی 'غلیظ جنگوں' کی طرز پر بلوچ کے خلاف ایک غلیظ جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ جابر اسٹابلشمنٹ اور اس کی غلیظ جنگ نے بلوچ کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے کہ وہ اپنی آزادی کے لیے لڑیں اور یہ عمل 27 مارچ 1948ء کے بعد سے شورش یا آزادی کی جدوجہد پر منتج ہوا ہے۔ موجودہ مرحلہ گذشتہ کے مقابلے میں سب سے زیادہ شدید اور سب سے زیادہ اہم ہے۔ صورتحال ایک ایسی نہج پر پہنچ چکی ہے کہ جہاں بلوچ کی جدوجہد کو کم زور کرنے کی خواہش میں اسٹابلشمنٹ ایسے اقدامات اٹھانے سے بھی نہیں کترا رہی جو نسل کشی سے قریب تر ہیں؛ آواران میں حالیہ زلزلے کے دوران اسٹابلشمنٹ کی مخالفت کرنے اور بلوچ کی آزادی کے لیے ڈاکٹر اللہ نذر کی بہادرانہ جدوجہد کے لیے ان کی حمایت کرنے پر آواران کے لوگوں کو بغض وعناد کے ساتھ سزا دینے کیلئے انہوں نے بین الاقوامی امداد لینے سے انکار کر دیا۔ منظّم غلیظ جنگ میں مرنے والوں کی تعداد گزشتہ تین سالوں میں 700 سے تجاوز کر گئی ہے اور ہزاروں لاپتہ ہیں۔ سپریم کورٹ لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے محض زبانی جمع خرچ سے کام لیتا ہے؛ کسی ایک شخص پر بھی فرد جرم عائد نہیں کیا گیا ہے۔ اگرچہ سپریم کورٹ نے اکثر فرنٹیئر کور (ایف سی) اور انٹیلی جنس اداروں کے براہ راست ملوث ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ یہ سب بلوچ کی طرف سے کی جانے والی مزاحمت پر منتج ہوا ہے، جسے عام طور پر شورش قرار دیا جاتا ہے۔

شورش کی تشریح کچھ یوں ہے، 'ایک منظّم تحریک جس کا مقصد بغاوت اور مسلح تصادم کے

استعمال سے کسی قائم شدہ حکومت کو اقتدار سے بزور طاقت ہٹانا ہے۔' شورش اور گوریلا جنگ اکثر دہشت گردی کے مترادف سمجھے جاتے ہیں لیکن اہم فرق یہ ہے کہ شورش ایک تحریک ہوتی ہے؛ ایک مخصوص مقصد کے ساتھ ایک سیاسی کوشش اور یہی چیز اسے دہشت گردی سے الگ کر دیتی ہے؛ تاہم گوریلا جنگ اور دہشت گردی بعض اوقات میں سیاسی تحریک کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے دستیاب ہوتی ہیں۔ شورش کا حتمی مقصد موجودہ حکومت کو چیلنج کر کے اس کے علاقے کا مکمل یا کسی ایک حصے کے کنٹرول کے لیے، یا سیاسی طاقت میں شراکت کے لیے سیاسی مراعات دینے پر مجبور کرنا ہوتا ہے۔ شورش کو ملوث آبادی کے کچھ حصے کی فعال یا خاموش حمایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیرونی حمایت، دیگر ممالک یا سیاسی اداروں کی طرف سے تسلیم کیا جانا یا منظوری ملنا باغیوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔

شورش پسندی کو وسیع تر بنیادوں پر مسلح اور سیاسی شورش میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور یہ عموماً متصور یا حقیقی ناانصافیوں، ظلم اور لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی ایک طویل تاریخ کا آخری نتیجہ ہوتی ہے۔ اصولی طور پر سیاسی شورش مسلح شورش کے مقابلے میں اپنی گہرائی اور وسعت کے باعث زیادہ نفوذ پذیر ہوتی اور چنانچہ ریاست کو زیادہ کمزور کرنے کا باعث بنتی ہے، بہ نسبت مسلح شورش کے جس کی گہرائی اور وسعت رسد، قطعہ زمین وغیرہ کے مسائل کے باعث محدود ہوتی ہے۔ شمالی آئرلینڈ کی جدوجہد سے ثابت ہوتا ہے سیاسی اور مسلح شورش ایک مہلک مرکب کے طور پر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے اور ایک دوسرے کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

نواب اکبر بگٹی، نواب زادہ بالاچ مری، بلوچ نیشنل موومنٹ (بی این ایم) کے چیئرمین غلام محمد بلوچ، لالہ منیر بلوچ اور بلوچ ریپبلکن پارٹی (بی آر پی) کے شیر محمد بلوچ اور دیگر کئی سیاسی کارکنوں، صحافیوں اور وکلا کے سفاکانہ قتل کے بعد بڑے پیمانے پر انقلابی حالت جوان ہلاکتوں کے بعد پیدا ہوئی، تو تب کے بلوچستان کے آئی جی آصف نواز وڑائچ کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ بلوچستان میں سیاسی شورش ہے۔ دراصل اس سیاسی شورش کی ابتداء 27 مارچ 1948ء کو بلوچستان کے غیر قانونی جبری الحاق کے بعد ہوئی اور تب سے مختلف شدت کے ساتھ جاری ہے۔

اس وقت یہ اپنے مشکل ترین مرحلے میں ہے، کیوں کہ شورش جتنی زیادہ تیز ہوئی ہے ریاست کی طرف سے مظالم میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور آج ہم یہی دیکھ رہے ہیں۔ اس وسیع اور طویل انقلابی حالت، سیاسی شورش کو 'غیر ملکی شہہ' کے طور پر ایک طرف نہیں رکھا جا سکتا۔

یہ موجودہ حالات پر لوگوں کی طرف سے محسوس کی جانے والی ناراضگی اور مایوسی کی شدت اور وسعت کا عکس ہے اور ایک فوری انقلابی تبدیلی کے لیے ان کی خواہش کا واضح اظہار بھی ہے۔ یہ بلوچ کے لیے بقا کی جنگ ہے۔ وہ صاف صاف یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ایسی ریاست کے تحت جبر کبھی ختم نہیں ہوگا جس کے سر پر منافع عوام کی قیمت پر پاگل پن کی حد تک سوار ہو۔ بنگلہ دیش کا ماتم بطور ایک غیر منقولہ جائیداد کے زیاں کے کیا جاتا ہے اور ان مصائب کے لیے کبھی نہیں کیا جاتا جو کہ ریاست، فوج اور ان کے حلیفوں کے سبب وہاں پوری بنگالی قوم کو جھیلنا پڑی تھیں۔

ایک وقت تھا کہ جب بلوچستان کی آزادی کے حق کے بارے میں بلوچ قوم پرست تاریخی اور سماجی بنیادوں پر بحث کیا کرتے تھے لیکن اب معاملہ یہ نہیں رہا جیسا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ مکمل خود مختاری کے بارے میں تاریخی اور سیاسی دلائل دینا ایک مشق لاحاصل ہے۔ انہیں یقین ہے کہ دلائل اور ماضی کی تاریخ ان طاقتوں کے نزدیک رتی بھر بھی حیثیت نہیں رکھتیں جو یہاں کے معاملات چلا رہے ہیں۔ اب وہ پوری سنجیدگی سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ساٹھ سالوں میں دلائل سے انہیں کوئی رعایت نہیں ملی ہے اور حتیٰ کہ اگر مزید ساٹھ سال ان طاقتوں کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش میں صرف کر دیے جائیں تو تب بھی اس سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ مزید برآں انہیں اس بات پر بھی یقین ہے کہ وقت کا بہاؤ ان کا مہلک ترین دشمن ہے، اگر انہوں نے اس وقت اپنے حقوق محفوظ نہیں کیے تو وہ اپنی ہی سرزمین پر ایک اقلیت بن سکتے ہیں اور سب کچھ کھو سکتے ہیں۔

جب کبھی بھی بلوچستان کسی سمندری طوفان، سیلاب، خشک سالی اور زلزلے جیسی قدرتی آفات کی زد میں آیا تو اسٹابلشمنٹ کی طرف سے ظاہر کیے جانے والے رویے نے بلوچ عوام کے اس یقین کا اعادہ کیا ہے۔ ان کی نجات صرف اور صرف آزادی ہی میں مضمر ہے۔ حالیہ دنوں بین

الاقوامی امداد سے سیکیورٹی کی صورتحال کے کھوکھلے بہانے پر انکار کر دیا گیا اور یہ بھی کہ جب کہ اس کی اپنی کوششیں مکمل طور پر ناکافی ہیں۔ آواران میں حالیہ زلزلہ اس ناروائی کی آخری حد ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ فوج اور فرنٹیئر کور اپنے دفاتر سے گزارے بغیر کسی بھی امداد کی اجازت نہیں دے رہے ہیں کیونکہ آواران افسانوی رہنما ڈاکٹر اللہ نذر کے اثر ورسوخ اور کارروائیوں کا علاقہ ہے اور بلوچ مزاحمت کے لیے ان کی غیر مشروط حمایت پر وہاں وہ بلوچ کو سزا دینا چاہتے ہیں۔ وہاں کے عوام ان لوگوں کی طرف سے امدادی سامان قبول کرنے سے انکار کرتے آئے ہیں جو ان کے خلاف مظالم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ میرے محترم دوست شہید شے مرید بلوچ (رضا جہانگیر)، بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بی ایس او) آزاد کے سیکرٹری جنرل، جو 14 اگست کو ایف سی کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے، ان کا تعلق آواران میں تیرتیج کے گاؤں سے تھا اور بی بی سی نے رپورٹ کیا کہ وہاں کے لوگ ایف سی کی امداد قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

مرکزی دھارے میں شامل سیاست دانوں اور حکومت حامی سرداروں کے لیے جگہ اس حد تک تنگ ہو چکی ہے کہ صوبے میں غالب بھرپور سیاسی شورش کے ماحول میں زندہ رہنے کے لیے انہیں قوم پرستوں کا بیانیہ اپنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ رویوں اور عزم میں سختی اور پختگی اس امر پر مسلسل اور متکبرانہ بے اعتنائی سے پیدا ہوئی ہے جسے وہ اپنے سیاسی مستقبل اور اپنے وسائل پر اپنی جائز مانگ سمجھتے ہیں۔ بلوچ کو اب یقین ہو چکا ہے کہ یہ غلیظ جنگ جو کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید شیطانی اور شدید ہوتی جا رہی ہے اور چین کو اس کی توانائی کوریڈور کے لیے اقتصادی وسائل کے حوالے کرنے کی منصوبہ بندی نے ان کے لیے راستوں کے انتخاب کو ایک ہی نقطے تک محدود کر دیا ہے جو کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ آزادی ہے۔

بشکریہ: ویو پوائنٹ آن لائن، جمعرات، 10 اکتوبر 2013

Part 4 - Survival & Resistance

https://app.box.com/s/q53mtkqrlw1o3vfr5rqmxrts63shqoxr

ریاست بمقابلہ عوام:
پاکستان کی تاریخ پر نوٹس

تحریر: میر محمد علی ٹالپر
ترجمہ: لطیف بلیدی

'تاریخ میں عوام کو معجزات کرنے کیلئے جانا جاتا ہے؛ کچھ بھی ان کی پہنچ سے باہر نہیں۔'

کسی ہستی، گروہ، قوم یا ریاست کو عوام کے فطری حقوق پر ترجیح حاصل نہیں ہو سکتی جس کی تخلیق یا وجود کی بنیاد خواہ کچھ بھی ہو جس کے تحت اس نے لوگوں کو ان قیاس کردہ اعلیٰ اور عظیم مقاصد کیلئے اپنے آپ میں ضم کیا ہوا ہو۔ زبانوں، ثقافت، اخلاقیات اور اقدار کا نفاذ جو کہ نافذ کنندہ کی نظروں میں خواہ کتنی ہی بلند و بالا ہوں مگر پھر بھی ان کے نفاذ کو کسی بھی طرح کا جواز فراہم نہیں کر سکتیں چاہے ان وجوہات کی بنیاد مذہبی، سماجی، اقتصادی یا سیاسی ہوں۔ ایسے غیر منصفانہ نفاذ ہزارہا مسائل کا موجب بنتی ہیں جن کا ہر موڑ پر ہمیشہ انہیں سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی متضاد اور ناموافق فطرت کی قربت کے باعث وقت کے گزرنے کے ساتھ ان کی شدت اور ارتعاش میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

جو افسانے ان گروہوں کے بظاہر عظیم اور بے لوث مقاصد کے گرد بُنے جاتے ہیں، جو دیگر اقوام کو غلام بنانے پر تلے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے ظاہری اور پوشیدہ ایجنڈوں کے درمیان تمیز کرنے کے لئے ایک گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔ جس پُرفریب اور زیرک انداز میں یہ

افسانے بنے اور بروئے کار لائے جاتے ہیں، سب کو نہ سہی مگر اکثریت کو دھوکہ دے دیتے ہیں اور یہ باور کرواتے ہیں کہ بظاہر غلط اور جعلی دلیل لائقِ ستائش اور معتبر ہیں۔ یہ ایک بڑے پیمانے پر کی گئی دھوکہ دہی پر مبنی ہوتی ہے اور بہت کثرت سے کی جاتی ہے وگرنہ یہ منصوبے کامیاب نہیں ہوسکتے۔ جہاں کہیں بھی وہ لوگ عوام کو اپنی نمود و نمائش والی بیان بازی سے قائل کرنے میں ناکام ہوجاتے ہیں تو وہ اپنی اصلیت پر اتر آتے ہیں اور 'ریاست کی عملداری کو یقینی بنانے' جیسے گھسے پٹے الفاظ کا سہارا لے کر شیطانی انداز میں طاقت کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے مذموم عزائم سے اختلاف کو قطعی برداشت نہیں کرتے اور بالآخر اپنے کمزور حصہ داروں کی خواہشات کے برخلاف عمل پیرا ہوتے ہیں۔

مقتدر حصہ دار کی تاریخ اور پس نفسیات، جو خود کو عالی نسب سمجھتا ہے، ایک وفاقی یونین میں اسی طرح کام کرتا ہے اور اس حوالے سے ایک بہت اہم کردار ادا کرتا ہے کہ وفاق کی دیگر اکائیوں کے ساتھ کتنا اچھا اور کتنا برا سلوک کیا جانا چاہئے۔ اگر وہ حصہ دار مسلح افواج کو بھی بھاری اکثریت فراہم کرتا ہو تو دوسروں کی جانب اس کا رویہ بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے کیونکہ دبنگ پن ان کیلئے زندگی کا ایک قدرتی طریقہ کار بن جاتا ہے۔ آمریت اور دوسروں کے حقوق نظر انداز کرنا ایک بیماری ہے جس میں پوری انسانی تاریخ میں تمام طاقتور افراد، گروہ اور قومیں مبتلا رہی ہیں اور یہ امر اُن جعلی عالی نسب لوگوں کو غیر فطری نہیں لگتیں جو اسے اپنی فطرتِ ثانی کے طور قبول کر لیتے ہیں اس بات سے قطع نظر کہ مظلوم اور مرعوب عوام ان ناانصافیوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں جو قومی مفاد کے نام پر زبردستی ان کے حلق میں ٹھونسے جاتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی کڑوی ہوں مگر ان لوگوں کو نگلنی پڑتی ہیں جنہیں نچلے درجے کے عوام الناس کی حیثیت حاصل ہو۔

اگر غالب اکائی، جس کی تاریخ میں اس سے قبل اس خطے کو نوآبادیت بنانے والوں کی خدمت گزاری شامل ہو تو پھر کمزور وفاقی اکائیوں کا مقدر پاٹ میں پسنا ہی ہوتا ہے۔ تاریخ کی لوح پر اپنے کردار کے توازن کو قائم رکھنے کی خواہش میں اگر ضروری ہو تو وہ طاقت کے ذریعے اور

بھی بہت سارے کام کرتا ہے جو اس نے سابقہ نوآبادکار سے بخشیش حاصل کرنے کیلئے بہ خوشی کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسے دوسروں کو اپنی ضروریات اور پالیسیوں کے تابع بنانا پڑتا ہے اس بات سے قطع نظر کہ خواہ اسے بھی زیادہ بڑی طاقت کے پیروں تلے ذلت اٹھانی پڑے۔ یہ اُن اہم مسائل پر دیگر اکائیوں کی طرف سے کیے جانے والے جائز اعتراضات اور مخالفت کے حوالے سے بھی انتہائی حساس بن جاتا ہے جس سے وہ اکائیاں براہ راست متاثر ہو رہی ہوتی ہیں۔ یہ ہمیشہ آسانی سے قابل رسائی اور تابعدار فوجی طاقت کے استعمال کو ترجیح دیتی ہے جو بالآخر اور بلا کسر یا تو علیحدگی کی جانب دھکیلتی ہے یا پھر دائمی طور پر کھولتے ہوئے عدم اطمینان پر منتج ہوتی ہے۔

حکمران اشرافیہ جو غیر قانونی طور پر اقتدار پر قبضہ جماتی ہے اس کی منفعت، مراعات اور رعایت کی اتنی عادی ہو جاتی ہے کہ عوام کی جائز اتھارٹی کو اقتدار کبھی نہیں دے گی کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ناقابل تسخیریت اور ناگزیریت پر مکمل طور پر قائل ہو جاتی ہے، صرف اس ملک کے تناظر میں نہیں بلکہ پوری دنیا کے۔ وہ صدق دل سے یہ ماننا شروع کر دیتے ہیں کہ درحقیقت دنیا کی بقا وہاں پر ان کے اقتدار کو برقرار رکھنے پر منحصر ہے۔ ایسے لوگوں کو اس بات پر قائل کرنا مشکل ہے کہ ریاست کے وجود اور اسکے ساتھ ساتھ عوامی فلاح کی خاطر وہ اپنی خود اہمیتی اور خود برتری کی غلط فہمی کے لبادے کو اتار پھینکیں۔ وہ بڑی بے رحمی سے حماقتیں کرتے ہیں اور ہمیشہ ایسی حماقتیں کرتے ہیں جن سے انہیں، ان کے ٹولے اور ان کے چاپلوس چیلوں کو فائدہ مل سکے۔

وہ لوگ جو دیگر اقوام کے لوگوں پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی ٹھانتے ہیں یقینی طور پر ان کے اقتصادی، سیاسی، مذہبی اور سماجی مفادات اس عمل کو کرنے میں ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جن کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف دوسرے لوگوں کی قیمت پر خوشحال ہو سکتے ہیں۔ اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اگرچہ اعلان کردہ مفادات یہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے لیکن پس منظر میں جو چیز پوشیدہ ہوتی ہے وہ نسل پرستی کا ایک غالب عنصر ہے، ایک ایسا عنصر جس کی وہ ہمیشہ سختی سے تردید

کریں گے۔ اگر نسل پرستی کا عنصر وہاں نہ ہوتا تو ہم اس ظلم کا مظاہرہ نہ دیکھتے جو دوسروں کو وہ سب کچھ منوانے کیلئے کیا جاتا ہے جسے غالب گروہ درست اور اپنے خیال میں محکوم لوگوں کے مفاد میں سمجھتا ہے؛ بنگلہ دیش، بلوچستان اور سندھ یہاں کی مقدم مثالیں ہیں۔

اگر نسل پرستی کا عنصر نہ ہوتا تو یہ وفاقی اکائیوں کے ساتھ یکساں سلوک دکھاتا لیکن چونکہ نسل پرستی کے باعث امتیازی سلوک بڑی ڈھٹائی اور وحشیانہ طریقے سے برتا جا رہا ہے جس کی توضیح وفاق کے مفاد میں اٹھائے گئے اقدامات کے طور پر جواز فراہم کرنے کے ساتھ کی جاتی ہے یا پھر یہ جواز کہ وہ یہ کام دوسروں کے مفاد میں کر رہے ہیں اور جو کوئی بھی اس سے اختلاف کرے اسے ریاست مخالف عناصر کے ورغلایا ہوا یا ترقی مخالف قرار دیا جاتا ہے۔ یہ دلیل باطل اور ناقص ہے کیونکہ پوری تاریخ میں جن کے پاس بھی اقتدار رہا ہے وہ اپنے اعمال کا دفاع انہی بنیادوں پر کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

وہ لوگ جو دوسروں کو ان کے علاقوں کے جسمانی کنٹرول سنبھال لینے کے بعد سماجی اور اقتصادی طور پر محکوم کرنا چاہتے ہیں، وہ اس کی شروعات ان متاثرین پر ناانصافیوں اور ہتک آمیز سلوک کیساتھ کرتے ہیں۔ یہ ہتک آمیز سلوک، خواہ مخفی ہو یا ظاہر، اس کا ایک مخصوص انداز اور مخصوص توجیہہ ہوتی ہے؛ اس کا مقصد اور نیت متاثرین کو ان کی شناخت کے احساس سے محروم کرنا اور ان کو بلا چوں چرا مکمل طور پر اپنے سانچے میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی مرد یا عورت اپنی شناخت کا احساس کھو دے تو اسے بدترین کام کرنے کیلئے بھی راضی کیا جا سکتا ہے اور کوئی بھی کام اپنے لوگوں، اپنی ثقافت اور تاریخ کے خلاف کام کرنے سے بدتر نہیں ہے۔

یہ ہتک آمیز سلوک اتنی کثرت اور اتنی ہوشیاری سے نافذ اور مسلط کی جاتی ہے کہ زیر نوآبادیت لوگ آخر کار اس کے عادی بن جاتے ہیں اور اسے ایک قدرتی امر کے طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ اس اہم حقیقت کی وضاحت کرنے کیلئے مینڈکوں پر ایک تجربہ کیا گیا۔ پانی تقریباً 50 ڈگری سیلسیس پر ابالا گیا اور مینڈکوں کو پانی میں گرا دیا گیا؛ قدرتی طور پر تمام مینڈکیں مر گئیں۔

مینڈکوں کے دوسرے گروہ کو نیم گرم پانی میں ڈالا گیا اور پھر اسے آگ پر رکھ کر آہستہ آہستہ گرم کیا گیا؛ یہاں تک کہ درجہ حرارت 50 ڈگری سیلسیس تک پہنچ گیا مگر یہ مینڈک پانی میں تیر رہے تھے۔ جب لوگوں کو ہتک آمیز سلوک کا شکار بنایا جائے اور ان کے رہنما آواز نہ اٹھائیں یا مزاحمت نہ کریں تو لوگ بھی انہی مینڈکوں کی طرح توہین کی حدت کے عادی بن جاتے ہیں۔

ہتک آمیز سلوک کی مشق کبھی کبھار انفرادی ہوتی ہے اور بعض اوقات اجتماعی۔ کبھی کبھار یہ مرتکبین اپنے کام کو آسان بنانے اور لوگوں کو ان کے قومی وقار کے احساس سے محروم کرنے کی کوشش میں پوری قوم کیخلاف ایک علامتی توہین کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ بعض اوقات اس توہین کیلئے بڑے اثر و رسوخ اور اختیار رکھنے والے افراد کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ اس ذلت کے اثرات، اگر مکمل طور پر نہ سہی مگر بیشتر، ان افراد کے پیروکاروں پر پڑیں جنہیں انہوں نے کسی بڑی کوشش کے بغیر ان کے ناجائز اور ظالمانہ مطالبات کو چپ چاپ تسلیم کر لینے پر آمادہ کیا ہوا ہوتا ہے۔ ہتک آمیز سلوک لوگوں میں اپنی ثقافت اور تاریخ کو مسترد کرنے کے عمل کو تیز کر دیتی ہے جو کہ شناخت کے کھونے پر منتج ہوتی ہے۔

شناخت کھو دینے کی صورت میں ان کی اپنی ثقافت اور تاریخ کے لئے محبت اسی کو مسترد کرنے میں بدل جاتی ہے۔ اس استرداد کو لانا ظالم کیلئے کبھی بھی کوئی فضول اقدام نہیں ہے کیونکہ یہ تشخص کا کھونا ہی ہوتا ہے جس کا وہ اپنے شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لئے زیادہ سے زیادہ استحصال کرتا ہے۔ جب استرداد کا یہ رویہ اس میں سرایت کر جائے تو وہ اپنے قومی وسائل، ثقافت، تاریخ اور قومی اہداف سے غافل ہو جاتا ہے اور یہ اس کی نفسیات پر مکمل غلبہ پا لیتا ہے اور یہ امر قابض کیلئے نہ صرف اُس محکوم ملک کی دولت اور وسائل کے استحصال کو آسان بنا دیتی ہے بلکہ اس مرتد شخص کی شکل اسے ایک فعال معاون جرم اور شبیہہ دینے والا سازشی مل جاتا ہے۔

ڈاکٹر مالکوں، لسبیلہ کے جاموں، اسلم رئیسانیوں جیسے لوگ ان حلیفوں کی تجسیم ہیں اور یہ لوگ اس قابل نفرت اطاعت گزاری کو فروغ دیتے ہیں جو انہیں مالا مال کرنے میں مددگار ہوتی

ہے۔ایک حکایت اس قابل نفرت اطاعت گزاری کی پھٹکار کی وضاحت کرے گی، جس کے حق میں وہ لوگ ہوتے ہیں، اور ہمیں ان ناانصافیوں اور ہتک آمیز سلوک کو قبول کرنے کی اس کھلی رسوائی کی بھی یاد دلائے گی۔کسی سلطنت میں لوگوں کو زورگار کے لئے روزانہ ایک دریا پار کرنا پڑتا تھا۔آمدنی میں اضافے کی امید میں بادشاہ وہاں ایک پل تعمیر کرواتا ہے۔حیرت کی بات ہے، آمدنی کم ہوجاتی ہے۔وزیر کے مشورے پر وہ ایک محصول عائد کرتا ہے۔اس نے سوچا کہ احتجاج بھڑک اٹھیں گے لیکن لوگ اطاعت شعاری سے پیسہ ادا کرتے رہے اور جب کبھی آمدنی کم ہوجاتی تو محصول بھی بڑھا دیا جاتا۔

احتجاج کو اکسانے کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے اس نے دونوں سروں پر ایک ایک شخص تعینات کیے جو ہر ایک راہگیر کو جوتے سے مارتا۔کچھ دنوں کے بعد پوری عوام محل پر اکٹھا ہوگئی۔ اس امید میں کہ وہ احتجاج کریں گے، یہ سن کر بادشاہ چونک گیا کہ ان کا کہنا یہ تھا کہ انہیں مارنے کیلئے صرف دو افراد تعینات ہیں جس کے باعث انہیں بہت تاخیر ہوتی ہے اور مطالبہ کیا کہ مزید لوگ تعینات کیے جائیں تاکہ اس عمل کو تیز کیا جاسکے۔اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا وہ لوگ جو 'ہتک آمیز کے پل' کو بہ خوشی پار کرتے ہیں ان پر من مانے طریقے سے حکومت کی جاسکتی ہے۔یہ بالکل اسی طرح کی اطاعت گزاری ہے جسے یہ خودغرض سیاستدان چاہتے ہیں۔

برطانوی اس ہتک آمیز سلوک میں ماہر تھے؛ انہوں نے اس کی تمام شکلیں تمام لوگوں پر استعمال کیں۔نوآبادیت کے عمل میں ان کے اسلحہ خانے میں سب سے اہم ہتھیار یہی تھا۔انہوں نے اپنے اقتدار کے آگے ذلت آمیز اور قابل نفرت دستبرداری کو مقدس و متبرک بنایا اور ان تمام لوگوں کو شیطان صفت قرار دیا جو قائم شدہ معاشروں پر ان کی سیاسی، ثقافتی، سماجی اور معاشی حملے کیخلاف کسی بھی طرح کی مزاحمت ظاہر کرتے۔

یہاں کے سانولے صاحبوں نے قوموں پر ہتک آمیز سلوک کی اس میراث کو اچھی طرح سیکھا اور پھر اس کی مشق جاری رکھی۔انہیں اپنے اقدار، اپنے طور طریقے، اپنی زبان، اپنے

نظریات، اور اپنی اخلاقیات تھوپنے کیلئے اس کا استعمال بے تحاشہ اور بھرپور قوت سے کرنا پڑا ہے۔مختصر یہ کہ ایک بالکل نیا نظامِ عقیدہ اور دنیا کو دیکھنے کا ایک نیا نقطہ نظر جو کہ ان کے خیال میں نہ صرف برتر ہے بلکہ اللہ کی طرف سے اسے اُن اڑیل لوگوں پر ان کے اپنے فائدے کے لیے زبردستی نافذ کرنے کا حکم ہے۔وہ لوگ کہ جن کا برطانوی حکومت کو بھارت کی تقسیم کیلئے آمادہ کرنے میں اہم کردار تھا، ان کا ماننا یہ تھا کہ اس ملک کی تخلیق میں اللہ کی مرضی شامل تھی۔ان کے جانشینوں نے اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر اسے ایک ناقابل تغیر سچائی کے طور پر مانا۔

غالب قوت اور استحصال کنندہ ان لوگوں سے خوف کھاتے ہیں جو ان کے دباؤ اور لالچ سے مرعوب نہیں ہوتے اور اپنے تشخص کے احساس کو زندہ رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ان کا خوف بڑھتا رہتا ہے کیونکہ سرکشی بھی تابعداری کی طرح وبائی ہوتی ہے اور اگر وہاں کوئی ایسا نکل آئے جو دباؤ اور ڈرانے دھمکانے یا لالچ میں نہ آئے تو دوسرے بھی اس کی تقلید کریں گے۔یہی وجہ ہے کہ وہ یا تو اسے ختم کردیتے ہیں یا اس کے اثر و رسوخ کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ لوگ جو اپنی شناخت کا احساس نہیں کھوتے، ان کے مفادات کے لئے مسلسل خطرہ بنے رہتے ہیں۔قوموں میں ہمیشہ ایسے دیانتدار اور غیرت مند لوگ رہے ہیں جنہوں نے زبردست مشکلات کے باوجود بھی سرکشی کی ہے اور اپنی قوموں کو فخر کا احساس بخشا ہے اور وہ لوگ امید کا مینارہء نور رہے ہیں؛ بلوچستان میں نواب خیر بخش مری، میر شیر محمد مری، اپنے آخری دنوں میں نواب اکبر بگٹی مینارہء نور تھے۔موجودہ نسل میں ڈاکٹر اللہ نذر، بالاچ مری اور دیگر سرمچاروں نے بھی اس کردار کا فرض نبھایا ہے۔ماما قدیر بلوچ کی لانگ مارچ اور بلوچ سرزمین کی بہادر بیٹیوں اور جوانوں، جو اُن کے ہمراہ رہے، نے بھی اس کردار کا فرض ادا کیا ہے۔دوسری طرف یہاں غدار اور برگشتہ بھگوڑے بھی رہے ہیں جنہوں نے اپنی قوموں کی تقدیریں کوڑیوں کے عوض بیچی ہیں۔

یہ سانولے صاحبان جانتے تھے کہ انہیں آگے چل کر ایک بہت بڑا کام کرنا تھا کیونکہ جن

قوموں کوانہوں نے سرنگوں کرنے کی ٹھانی تھی اُن کی اپنی تاریخیں اتنی ہی قدیم تھیں جتنی کہ پہاڑ ہیں، ان کی اپنی زبانیں تھیں، اپنی اخلاقی اور سماجی اقدار، اصول اور رسم و رواج تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں بے دخل کرنے کیلئے قائل کرنے سے زیادہ طاقت کا استعمال کرنا ہوگا اور مسلح افواج کی شکل میں انہیں ایک آمادہ ساتھی مل گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ساتھی نے ہر طرح کی مخالفت کو کچل کر اطاعت گزاری میں تبدیل کرنے کے کام کا واحد سربراہ بننے کا فیصلہ کیا۔

کسی مخالف کی مزاحمت پر قابو پانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس شخص کو خاموش کیا جائے تاکہ وہ اپنی طرح کے لوگوں کیساتھ نہ کوئی رابطہ کر سکے اور نہ ہی وہ دوسروں کو ان ناانصافیوں سے منسلک کر سکے۔ مخالف کو یا تو جسمانی طور پر بولنے سے روک کر خاموش کیا جا سکتا ہے یا اس سے اس کی زبان چھین لی جائے؛ اور یہ حربہ بھی یکساں طور پر مؤثر ہے۔

برطانوی حاکموں نے اپنی زبان مسلط کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ایسا کرنے سے قاصر رہے تو لہٰذا انہوں نے اس کی ترویج ایک مختلف انداز میں کی۔ انہوں نے انگریزی کو ایک منافع بخش زبان بنا دیا، ایک ایسی زبان جس سے اس کے اپنانے یا استعمال کرنے والے کیلئے فوائد کی فراوانی ہوئی۔ ان کا طریقہ مکارانہ تھا اور انہوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ وہ بہت زیادہ لوگوں کو نالاں نہیں کریں گے۔ ان کے نزدیک اس کی مقبولیت کیلئے مراعات دینا زیادہ ضروری تھا اسی لئے اس میں کوئی تعجب نہیں کہ انگریزی نہ صرف دنیا کی بلکہ اب بھی اس خطے کی غالب زبان ہے۔

سانولے صاحبان، جو اپنے مشن اور اس کے تقدس کی حوالے سے ایک مختلف نقطہ نظر رکھتے تھے، نے ان چیزوں کے بارے کوئی اختلاف رائے برداشت نہیں کی جنہیں وہ عوام الناس کے مفاد میں سمجھتے تھے۔ انہوں نے فرمان جاری کیا کہ پوری رعیت کی زبان اردو ہوگی ان کی اپنی زبانوں کی کسی حیثیت کے بغیر۔ بنگال کے لوگوں نے اس ناانصافی کے خلاف مزاحمت کی چونکہ انہوں نے اس اقدام کو ان کی زبان بندی اور انہیں کچلنے کی کوشش کے طور پر دیکھا۔ مختلف صوبوں میں اس اقدام کی مخالفت مختلف شدت کی تھی لیکن تمام اختلاف رائے یا تو جسمانی طور کچل دی گئی یا

پھر اسے مذہبی اور سیاسی دباؤ کے ذریعے مرعوب کر کے منوایا گیا۔ وہ اختلاف رائے کو دبانے میں کامیاب تو ہوئے لیکن انتشار اور انسفاخ کے بیج بو دیئے گئے تھے۔

اگرچہ 67 سال گزر چکے ہیں یہ ناانصافی بلا روک ٹوک جاری ہے اور حتیٰ کہ اگر کوئی ان زبانوں کے لئے مساوی حقوق کا مطالبہ بھی کر دے، جنہیں وہ ہزارہا سالوں سے استعمال کرتے آ رہے ہیں، تو اس کی مذمت ریاست مخالف کے طور پر کی جاتی ہے۔ سندھی اس کا سب پہلا اور بڑا شکار رہا ہے کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں آبادیاتی خصوصیات میں سب سے زیادہ تبدیلی کی گئی۔ یہ اب بھی اپنے جائز مقام کیلئے جدوجہد کر رہی ہے، اسی طرح سے پشتو، بلوچی، براہوی اور سرائیکی بھی۔ اگر لوگ تخلیقی اور زرخیز بننا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی زبانوں میں بات چیت کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن قومی مفاد کے نام پر حکمران انہیں ان کا حق دینے سے انکاری ہیں۔

سانولے صاحبان کا اپنی رعیت سے سلوک بہت زیادہ انتقامی، کینہ پرور اور زہریلا رہا ہے کیونکہ برطانوی راج کی طرح وہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ لوگوں کو محکوم بنانے اور ان کے آدرش، اقدار، اخلاقیات اور ثقافت مسلط کرنے سے وہ درحقیقت لوگوں پر ایک بہت بڑا احسان کر رہے ہیں کیونکہ جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں نہ صرف بہتر ہے بلکہ اس کام کے کرنے میں وہ اللہ کی مرضی پر بھی عمل درآمد کر رہے ہیں۔ خود اتقائی کا یہ رویہ جسکی جڑیں اس ذہنیت میں پیوست ہیں جس نے ان کے دماغ کو تمام منطق اور مکالمے کیلئے بند کر دیا ہے اور ان کے پاس صرف وحشیانہ طاقت کے استعمال کا راستہ چھوڑا ہے تاکہ یہ بیہودہ ناشکرے بھانڈ لوگ اُن کی بالادستی کو قبول کرنے کی ضرورت کو سمجھ سکیں۔

جو قابل رحم اور دلسوز انسانی حقوق، صوبائی حقوق، خواتین کے حقوق اور اقلیتوں کے حقوق اس وقت یہاں لوگوں کو حاصل ہیں اُس تقدس ماب ریاکار نرگسیت کا براہ راست نتیجہ ہے جس پر یہاں کی حکمران اشرافیہ عمل پیرا ہے۔ وہ خود پسندانہ تکبر سے اس بات سے انکار جاری رکھے ہوئے

ہیں کہ گویا ان کے اس چیز کیساتھ جسے وہ ریاکاری سے نظریہء پاکستان کہتے ہیں، یہاں آنے سے قبل اس ملک میں بسنے والے لوگوں کی کوئی تاریخ، ثقافت، زبان، اقدار، یا اخلاقیات بھی تھیں۔ حکمران اشرافیہ کا یقیناً یہ ماننا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو 14 اگست 1947ء میں پیدا کیا ہے۔ وگرنہ اس جغرافیائی ہستی کے اندر رہنے والی قوموں کی زبانوں، حقوق، ثقافت اور تاریخ کی جانب ان کے رویے کی وضاحت اور کس طرح سے کی جاسکتی ہے؟

ون یونٹ نہ صرف سندھ، بلوچستان اور بنگال کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کی ایک کوشش تھی بلکہ انہیں ان کے تاریخی ناموں سے بھی، تاکہ ان کی تاریخ کی اہمیت کو گھٹا کر انہیں مکمل طور پر خارج از وجود کرنا اور آخر کار ان کے پورے وجود کو بھی ختم کر دینا۔ اور انہیں مغربی پاکستان جیسے مصنوعی اور بے معنی چیز میں پناہ تلاش کرنے پر مجبور کرنا۔ کسی شخص کو اس کی قوم کا نام اور شناخت استعمال کرنے کے حق سے انکار اسے اپنا تصورِ ذات کھونے کی طرف دھکیلتا ہے، ایک ایسی صورتحال جسے قابض بھرپور طور پر استعمال کرتا ہے تاکہ وہ اپنے شکار پر اپنا اثر ورسوخ بڑھائے اور اس کے طوق بھی بڑھائے جنہوں نے اسے پابند سلاسل کر رکھا ہے۔

سندھ کو ہتک آمیز سلوک اور ناانصافیاں اسے اپنے جائز حصے سے زیادہ ملی ہیں۔ بھارت سے مہاجرین کی آمد نے نہ صرف اس کی آبادیاتی خصوصیات کو ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیا بلکہ وہاں پہلے سے مقیم لوگوں کے لئے اقتصادی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی شعبوں میں نقصان دہ تبدیلیوں کی بھی بنیاد رکھی۔ یہ سندھ کی تقدیر رہی ہے کہ فروری 1843ء میں برطانوی قبضے کے بعد سے اس کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ برطانوی راج نے بھی اسے صوبے کی حیثیت، جس کا یہ ہمیشہ سے مستحق رہا ہے، نہ دینے کا فیصلہ کر کے ایک سوتیلی ماں کی روش اپنائی ہوئی تھی۔

بلوچ سرزمین کے نام سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ ایک بہت بڑے علاقے میں ان کی آبادی ہے جو کہ درقدیم سے ان کے نام کے ساتھ منسوب ہے۔ اسلئے ان سے ایک مختلف انداز میں نمٹنا تھا۔ ریاست کے پاس طاقت کا ستعمال واحد راستہ تھا کیونکہ نئی ریاست کے پاس ان کو

اپنے آپ میں ضم کرنے کا اور کوئی اخلاقی، قانونی، یا سیاسی جواز موجود نہیں تھا۔ عوامی نمائندوں نے ایک الگ اور آزاد وخودمختار وجود کا انتخاب کیا تھا جو کہ ان کا حق تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جس شخص، جناح، نے برطانوی دور میں اس کی آزادی کی مانگ کی التجا کی تھی اُسی شخص نے اس کے خلاف طاقت کے استعمال کا حکم دیا تھا۔

بلوچستان کے کم آبادی اور لامحدود وسائل کا حامل ہونے نے اس کے وسائل اور بڑے علاقوں کا استحصال کرنے کی تمام کوششوں کو مدعو کیا۔ کسی بھی دوسرے ذرائع سے ان کو محکوم کرنے سے قاصر رہنے کے سبب بلوچستان نے بار بار مختلف سطحوں اور دورانیوں کی شورشیں دیکھیں۔ وہاں کی جانے والی تازہ ترین کارروائی، جو کہ پوری تاریخ میں سب سے زیادہ شیطانی اور جو جبر اور قتل عام وہاں پر کیا جارہا ہے اس سے لاطینی امریکہ میں انسانیت کے خلاف جرائم کا ارتکاب بھی شرما جائے، وہاں کے لوگوں کے وسائل پر اختیارات کے حق کے مطالبات اور طاقت کے ذریعے آبادیاتی خصوصیات میں تبدیلی کیخلاف مزاحمت کو دبانے کی نیت سے کی جارہی ہے۔ لوگوں نے ان تمام پالیسیوں کیخلاف مزاحمت کی ہے جنہیں وہ بلوچ اور بلوچستان کے وسیع تر مفادات کیلئے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اب وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ساتھ مل کر رہنا ناممکن ہے۔

آبادی میں اضافہ اور کم پڑتے وسائل نے بلوچستان کی جانب نئے سرے سے ایک شدید یورش اور توجہ کی حوصلہ افزائی کی ہے تاکہ وہ غیر محسوس اور ظاہری انداز میں زمین کا ایک بڑا حصہ کاٹ کر لے جائیں جس سے وہ ایک مناسب اور اہم علاقائی کھلاڑی بن جائیں جس کی ماضی میں امریکہ کو لیکن اس وقت چین کو ضرورت ہے۔ الحاق اور نوآبادیت عیاری سے خفیہ طور پر جاری رہی اور یہ عمل بہت سارے علاقے ان کے زیر اثر لے آیا، یہ زیادہ تر ان لوگوں، جو ان کا کام آسان کر سکتے تھے، کو مراعات دینے سے کیا گیا ہے یا پھر طاقت کا استعمال کرتے ہیں جب یہ اور دھوکہ دہی دیگر طریقے ناکام ہوجاتے۔

بلوچستان اور سندھ میں سیاسی جماعتوں اور شخصیات نے عناد پر مبنی ان پالیسیوں کو کامیاب

بنانے میں زیادہ تر خبیثانہ اور غلامانہ کردار ادا کیا ہے۔ مخصوص افراد اور عوام کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والے گروہوں جو کہ درحقیقت انہیں بعض اوقات ہر طرف گھسیٹتے ہیں جو عموماً آہستہ آہستہ مگر آخر کار ناانصافیوں اور عدم مساوات کو وسیع تر مفادات کے نام پر اخلاقی اور قانونی طور پر جائز عمل قرار دیکر انہیں قبول کرنے کیلئے لوگوں کو قائل کرتے ہیں جو کہ دراصل تنظیم یا پارٹی کی پرتوں میں موجود چند منتخب افراد کے مفادات سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوتے۔ حکومتوں نے اپنے الحاق اور نوآبادیاتی مقاصد کو آگے بڑھانے کیلئے سیاسی، روحانی اور مذہبی رہنماؤں کا بھی استعمال کیا ہے جو ان کے بنیادی طور پر شیطانی اور غلیظ اہداف کو ایک دردمندانہ، بےلوث اور انسان دوستی کی ظاہری شبیہہ فراہم کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

میڈیا نے ریاستی نظریات کے فروغ میں عموماً ایک آلے اور فعال معاون کا کردار ادا کیا ہے۔ بیرونی کنٹرول اور اندرونی طور پر ازخود سنسرشپ کے سبب میڈیا نے اس 'سرزمینِ اِخلاص'، یا جیسا کہ مرحوم جسٹس کیانی کبھی کبھار اسے 'سرزمینِ افلاس' کہتے تھے، کی حدود میں بسنے والی مختلف قومیتوں کی کاوشوں اور ان کے مطالبات کو بےوقعت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حال ہی میں پریس کی طرف سے ایک نئی اصطلاح گڑھی گئی ہے اور حتیٰ کہ اسے چند ملک گیر روزناموں کے اداریوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے؛ وہ صوبوں میں سرگرم ان رہنماؤں کا حوالہ دیتے ہوئے 'نیم قومپرست' کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں جو اپنے لوگوں کے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ گویا آپ کسی کا حوالہ 'نیم انسان' کے طور پر دیں جب آپ اس کا موازنہ انسانوں کے ساتھ کر رہے ہوں؛ وہ بہ آسانی بھول جاتے ہیں کہ جن لوگوں کو وہ نیم قومپرست کا نام اور شبیہہ دیتے ہیں ثقافتوں، تاریخوں اور قوموں کی نمائندگی کرتے ہیں جنہوں نے ہزاروں سالوں سے ان علاقوں کو اپنے وجود سے آراستہ کیا ہے اور جن لوگوں کو وہ قومپرست کہتے ہیں وہ کم و بیش محض 67 سال سے یہاں آباد ہیں۔ لوگوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی ثقافتوں، تاریخوں، قومی جذبات کو اضافی سامان کے طور پر نکال پھینکیں کسی ایسی شے کیلئے جو انہیں صرف

مصائب فراہم کرنے میں کامیاب رہی ہو۔

یہ توقع کرنا محض خام خیالی ہے کہ میڈیا کے اس رویے میں تبدیلی آجائے گی کیونکہ تمام نہ سہی مگر بیشتر اخبارات اور ٹی وی چینلز کو چلانے والے اور ان کے مالکان وہ لوگ ہیں جنہیں موجودہ نظام کے اندر رہتے ہوئے فوائد حاصل ہوئے ہیں اور وہ ترقی کی منازل طے کرنا جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوگا ماسوائے اس کے کہ کبھی کبھار ان لوگوں کے حقوق کے اظہار کی جھلک دکھائی دے گی جنہیں وسیع تر مفادات کے نام پر ان کے حقوق اور عزت کی زندگی سے محروم کیا گیا ہے۔ سب کو اسٹیٹس کو سے فائدہ مل رہا ہے اور یہ ان کے مفاد میں نہیں ہے کہ وہ اس میں خلل ڈالیں۔ اس میں کسی تعجب کی بات نہیں کہ چند اخبارات اور جرائد چند لکھاریوں سے طاعون کی وبا کی طرح بچنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ان کے مضامین ان خیالات کی تائید کرتے ہیں جو تبدیلیوں کیلئے ہمت بڑھاتے ہیں اور یہ کام ان کے اسٹیٹس کو کو خطرے میں ڈال دے گا۔

ان لوگوں کے خلاف ناانصافیاں اور ہتک آمیز سلوک روا رکھنا جو مخالفت میں صدائے احتجاج بلند کرنے کی ہمت کرتے ہیں، بجائے اس تناؤ کو کم کرنے اور مسائل کا حل نکالنے کے یہ انہیں مزید بگاڑ دیتے ہیں، اور یہ عمل مزاحمت کو بڑھاوا دیتی ہے جس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا جاتا ہے اور آخر کار وہ مرحلہ آجاتا ہے جہاں یہ اُس جابرانہ مشینری کو شکست دے دیتی ہے۔ جبر صرف اور صرف نقصان دہ ہوسکتا ہے لیکن حکمران اشرافیہ ہمیشہ اس حقیقت کو سمجھنے میں ناکام رہتی ہے۔ لوگوں کی نجات جابرانہ مشینری کو شکست دینے کے لئے ان کی جدوجہد میں ہی مضمر ہے۔

عدم برداشت کی فضا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تشدد نے یہاں کی سول سوسائٹی کی اساس تک کو خطرے میں ڈال دیا ہے جو کہ اس جبر کا براہ راست نتیجہ ہے جو قیام پاکستان کے بعد سے مقبول عام رواج رہا ہے۔ پوری تاریخ میں معاشرے، ممالک اور سلطنتیں عدم برداشت اور جبر کے باعث ٹوٹتی رہی ہیں جس کی افزائش اور نشوونما کوتاہ فہم حکمران اشرافیہ کرتے رہے ہیں

جنہوں نے اپنے محدود ذاتی مفادات کا موازنہ ریاست کے مفادات سے کیا ہوا ہوتا ہے اور وہ بخوشی ایسی پالیسیوں کا آغاز کرتے رہے ہیں جو جلد یا بہ دیران کیلئے اور ان کی زیرنگرانی کام کرنے والے بدبخت لوگوں کیلئے مہلک ثابت ہوئی ہیں۔

جو ذہنیت اس جگہ کو نراجیت اور انتشار کے پاتال میں لے آئی ہے وہ کبھی تبدیل نہیں ہوگی اور جلد یا بہ دیر معاملات اپنے قدرتی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔ عوام کو ان نااہل اور سفاک بدھوؤں سے اپنی تقدیر کو چھیننے اور ہر طرح کے استحصال اور ظلم سے پاک آزادی کے ساتھ رہنے کو یقینی بنانے کیلئے نبرد آماز ہونے کی ضرورت ہے۔ جن لوگوں کو نچلے درجے کے عوام الناس کی حیثیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہے اب وہ اس حیثیت کو اپنی قسمت اور تقدیر کے طور پر قبول نہیں کر رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان جعلی عالی نسب لوگوں نے یہ حیثیت دھوکہ دہی اور طاقت کے بل بوتے حاصل کی ہے اور اب انہیں اکھاڑ پھینکا جانا چاہئے۔ تاریخ میں عوام کو معجزات کرنے کیلئے جانا جاتا ہے؛ کچھ بھی ان کی پہنچ سے باہر نہیں۔

بشکریہ: نیکڈ پنچ، 24 جنوری 2014

http://www.nakedpunch.com/articles/200

''جب جرائم غیر مرئی بن جائیں'':

خضدار، بلوچستان کی اجتماعی قبریں

خضدار میں توتک کے مقام پر 25 جنوری کو ایک چرواہے نے ایک اجتماعی قبر دیکھی، جس کے بعد مقامی لوگ لاشیں نکالنے کے لیے وہاں جمع ہوئے۔ مڈل کلاس حکومت کے نمائندے لاشوں کی تعداد کو 13 تک محدود رکھنے کے لیے دردِ زہ میں مبتلا دِکھتے ہیں جب کہ چھن کر آنے والی خبروں کے مطابق تعداد 150 اور اس سے زیادہ کی ہیں۔ یہاں تک کہ سپریم کورٹ کے ایک جج نے ان کی تعداد 25 بتائی ہے۔ تعداد تو ایک طرف مگر یہ جعلی نمائندہ حکومت اس بات کو سمجھنے میں ناکام ہے کہ حتیٰ کہ ایک لاش بھی بہت زیادہ ہے لیکن دراصل بات یہ ہے کہ یہ حکومت بھی گذشتہ کی طرح عوام کی خدمت کرنے کی بجائے اپنی حکومت بچانے کے بارے میں زیادہ فکرمند ہے۔

جینوسائڈ واچ کے صدر گریگری ایچ اسٹینٹن کے مطابق نسل کشی آٹھ مراحل پر مشتمل ہے جو کہ یہ ہیں: درجہ بندی، علامت بندی، سلبِ انسانیت، تنظیم، تقطیب، تیاری، خاتمہ کاری اور تردید۔ بلوچستان میں یہ عمل نازی جرمنی کی طرح صریحاً وحشیانہ یا روانڈا کی طرح کھلم کھلا نہیں رہا ہے لیکن یہ پراسرار طور پر زور پکڑ رہا ہے، ان آرائشی سیاسی لبادوں کے ساتھ جو کہ اسے پوشیدہ رکھنے میں مددگار ہیں۔ بلوچستان میں بیک وقت دو نسل کش کارروائیاں ایک ساتھ جاری ہیں، ایک کا ہدف بلوچ ہیں اور دوسرے کا ہدف ہزارہ اور شیعہ۔

بلوچ منظّم طور پر پسماندہ رکھے جا رہے ہیں تاکہ ان کے خاتمے کو آسان اور ان کے وسائل کے غیر قانونی استحصال کو قابلِ جواز بنایا جائے۔ جیسا کہ میرے دوست ڈاکٹر محمد تقی صاحب اپنے مضمون 'لہولہان بلوچستان' ('ڈیلی ٹائمز' 30 جنوری) میں بجا طور پر کہتے ہیں کہ ہزارہ کو 'گیتھو ائز'

کیا جارہا ہے۔ طاقت کے استعمال کا خطرہ ان کو گیتھوائز کر رہا ہے، جب کہ اکثریت ہونے کے سبب بلوچ کو اس انداز میں جسمانی طور پر گیتھوائز نہیں کیا جاسکتا مگر پاکستان کی طرف سے انہیں سیاسی و معاشی طور پر گیتھوائز کیا جارہا ہے تاکہ آخر کار انہیں جسمانی طور پر بھی گیتھوائز کیا جاسکے۔ اس عمل میں اہم کردار ڈاکٹر مالک کی حکومت، بالکل اسی طرح جیسا کہ اس سے قبل رئیسانی حکومت، اور ان کے مرشد و آقا فوج اور فرنٹیئر کور (ایف سی) کا ہے۔

بلوچ کے خلاف طاقت کا استعمال بھی منظّم طور پر اور بے رحمی سے کیا جارہا ہے اور اس کا ثبوت ہزاروں لاپتہ اور ان میں سے آٹھ سو سے زائد قتل کر کے پھینکے گئے لوگ ہیں اور یہ تعداد ان جعلی مقابلوں میں قتل کیے گئے افراد کے علاوہ ہے جن کی نوعیت بھی اسی شدت کی ہے۔ یہ سب بلوچ عوام کو دہشت زدہ کر کے اطاعت گزاری پر مجبور کرنے اور انہیں ریاست کے دوسرے درجے کی محکوم رعیت ہونے کی قبولیت کے لیے کیا جارہا ہے تاکہ بعد میں انہیں جو کچھ بھی دیا جائے یا جیسی تیسی سیاسی و مادی بچے کھچے ٹکڑے ان کی طرف پھینکے جائیں، وہ انہی پر اکتفا کر لیں۔

بلوچ نے کبھی بھی اطاعت شعاری کے ساتھ اسے بطور اپنا مقدر اور اپنی ناگزیر قسمت کے قبول نہیں کیا ہے۔ انہوں نے 27 مارچ 1948ء کے بعد سے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس کے خلاف مزاحمت کی ہے اور یہی ان کی راہِ نجات رہی ہے اور اسی سے انہیں اپنی بلوچ شناخت کو برقرار رکھنے اور مکمل تسلط کو ناکام بنانے میں مدد ملی ہے جس کی پاکستان خواہش رکھتا اور کوشش کرتا آرہا ہے۔ اگر بلوچ طاقت کا مقابلہ طاقت سے نہ کرتے تو اس وقت بلوچستان دیگر نسلی گروہوں کے دلدل میں دھنس چکا ہوتا اور کثیر قوموں اور خلیجی ریاستوں کے حکمرانوں کی اجارہ داری اور ملکیت میں چلا گیا ہوتا۔ بلوچ نے اپنی شناخت اور وقار کو قائم رکھنے کی بھاری قیمت ادا کی ہے اور تو تک کی اجتماعی قبریں، جو کہ یقیناً وہاں موجود کئی قبروں میں سے محض چند ہیں، تمام لاپتہ اور قتل کیے گئے افراد اس بات کا ثبوت اور اس کی یاددہانی ہیں۔ بلوچ نے اس قیمت کے ادا کرنے میں کبھی بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا اور تاریخ ان لوگوں کی گواہ رہتی ہے جو عزت اور وقار کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔

بگٹی قبیلے کے تقریباً دو لاکھ افراد ڈیرہ بگٹی اور ملحقہ علاقوں سے بے گھر ہوئے جب 2005ء میں مشرف کے تحت فوج نے، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے، ان کے خلاف ایک شیطانی آپریشن شروع کیا، کہ وہ بلا کسی چوں چرا کے ان کے تابعدار بن جائیں اور اس کے نتیجے میں 2006ء میں نواب اکبر بگٹی کی شہادت واقع ہوئی۔ اتنی بڑی تعداد میں بگٹیوں کی اس ہجرت کے اثر کو اس وقت سمجھا جاسکتا ہے جب ہمیں یہ اندازہ ہو کہ یہ اپنے آبائی زمینوں پر رہنے والے بگٹیوں کی غالب اکثریت ہے۔ یہ بگٹی، جو دنیا میں کہیں بھی دیگر لوگوں کی طرح، اسی علاقے میں رہنا چاہتے ہیں جسے وہ جانتے ہیں اور جو ان کا اپنا ہے لیکن انہیں اپنی آبائی زمینوں سے دور رکھا گیا ہے کیوں کہ فوج اور ایف سی کی نظروں میں ان کی وفاداری مشکوک ہے جن کی اس علاقے پر حتمی رٹ قائم ہے۔

نواب اکبر بگٹی کے ایک پوتے شاہ زین بگٹی، جو ہمیشہ پاکستان سے اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے دردِ زہ میں مبتلا رہتے ہیں، کو سپریم کورٹ کے حکم اور کوئٹہ کے کٹھ پتلیوں کی یقین دہانی پر طویل عرصے سے بے گھر بگٹیوں میں سے بہت سوں کے ساتھ ڈیرہ بگٹی جانے کے لیے گزرگاہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا گیا لیکن ایف سی نے انہیں داخلے کی اجازت نہیں دی جو انہیں واپسی کی اجازت دینے سے قبل ان سے وفاداری کی مخصوص شرائط کی منظوری اور یقین دہانیاں چاہتا ہے۔ بے گھر بگٹیوں کو طاقت کے بل پر ان کے آبائی علاقے میں رہنے کے ان کے بنیادی حق سے انکار کیا جارہا ہے اور حتیٰ کہ اس ناانصافی نے ان لوگوں کو بھی ٹس سے مس نہیں کیا جو قوم پرست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہاں کی حکومت ہیں۔ ڈاکٹر مالک اور ان کی حکومت، اگر اس ذلت بھرے، خوشامدی، غلامانہ، قابلِ رحم اور جگر سوز افراد کے جتھے کو حکومت کا یہ قابلِ احترام عہدہ دے بھی دیا جائے تو وہ اپنے مرشدین یعنی فوج اور ایف سی کے اس حد تک شکر گزار ہیں کہ وہ ایک ایسا لفظ بھی نہیں کہہ سکتے جو ان کے ان منافع بخش عہدوں کو خطرے میں ڈال سکے۔

تو تک کی اجتماعی قبروں کی طرف واپس لوٹنے کے لیے سرفراز بگٹی کی جوہر بیانی کا ذکر کرنا لازمی ہے جو بلوچستان میں وزیر داخلہ کا تصحیکی عہدہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ بی بی سی اردو کے انٹرویو

میں جب انہوں نے اس ہولناک جرم میں اپنے مرشدین کے ملوث ہونے سے انکار کیا تو اس کا الزام 'را' اور بلوچ سرمچاروں پر لگانے کی کوشش کی۔ وہ یہ بھول گئے کہ اسی پست ہمت سپریم کورٹ، جو کہ لاپتہ افراد کے کیس پر سو سماعتوں کے باوجود لاپتہ یا ہلاک افراد کے لیے قانونی کارروائی تو درکنار کسی ایک شخص کے خلاف الزام تک عائد کرنے میں ناکام رہی ہے، نے کافی صداقت کے ساتھ لاپتہ افراد اور 'مارو اور پھینک دو' والی پالیسی کے لیے ایف سی اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ لیکن ڈاکٹر مالک اور ان کا قابلِ رحم جتھہ ان لوگوں کے حوالے سے کچھ برا نہیں دیکھتا، کچھ برا نہیں سنتا اور کچھ برا نہیں کہتا جن کے سبب جو کچھ وہ ہیں اور جہاں وہ آج ہیں، انہی کے مرہونِ منت ہیں۔ یہاں تک کہ سو اجتماعی قبریں، وہاں اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہیں، جو انہیں اور ان کے ضمیر کو کم از کم اس حد تک تو جھنجوڑ سکیں کہ اگر مستعفی نہیں ہوتے تو نہ سہی مگر سچ تو بولیں۔

واجب التعظیم ماما قدیر کی قیادت میں یکساں طور پر نڈر بانکوں (بلوچی میں خواتین) اور ورناؤں (بلوچی میں نوجوان مردوں) کے ساتھ وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کا لانگ مارچ اجتماعی قبروں کی دریافت کے ساتھ مزید دل خراش اور اہم بن چکا ہے۔ اس لرزہ خیز دریافت کے ساتھ شرکا کا عزم مزید پختہ ہوا ہے۔ ان کا یہ مارچ بلوچ کے خلاف کی جانے والی ناانصافیوں اور اپنے حقوق کے لیے ان کی جدوجہد کا ایک بالکل نیا باب ہے۔ انہوں نے بلوچ قوم کی ممنونیت اور محبت بہت کٹھن طریقے سے حاصل کی ہے۔ یہ بہادر نفوس بلوچ قوم کے غیر مشروط شکریے اور ممنونیت کے مستحق ہیں۔ کوئی ان سرشار بلوچوں کے سامنے محض احترام میں کھڑا رہ سکتا ہے جنہوں نے نہ صرف صبر اور برداشت کی نئی حدیں قائم کی ہیں بلکہ سیاسی جدوجہد میں اختراعی جدت بھی پیدا کی ہے۔ بلوچ کے خلاف جاری مظالم اور 'غلیظ جنگ' کے مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے جمعرات کو انہوں نے ملتان پریس کلب میں اجتماعی قبروں کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کا احتجاج منفرد ہے اور اس نے ناانصافیوں کے بارے میں لاکھوں لوگوں کو آگاہی دی ہے۔ ہم ایک ملین تقاریر اور مضامین سے جتنا کچھ حاصل کر سکیں اتنا انہوں نے اپنے اس تاریخی مارچ سے حاصل کیا ہے۔ وہ

اب تک تقریباً 1700 کلومیٹر پیدل چلے ہیں اور اسلام آباد سے اب بھی 730 کلومیٹر دور ہیں۔

لگتا ہے کہ بلوچ کے خلاف ناانصافیاں عوام کے ذہنوں پر اور پاکستانی میڈیا میں درج نہیں ہوتیں۔ وہ بلوچ اور حال ہی میں ہزارہ کے خلاف انسانیت کے خلاف جرائم سے بے خبر اور بے حسی کا شکار ہیں۔ کیا اس بے حسی کا باعث یہی ہو سکتا ہے جیسا کہ بیرتوت بریخت کہتے ہیں، ''جب جرائم کا ڈھیر لگنا شروع ہو جائے تو وہ غیر مرئی بن جاتے ہیں۔'' اس بات کا قوی امکان ہے کہ لوگ دوسروں کے خلاف ناانصافیوں کے عادی ہو جاتے ہیں خاص طور پر وہ مظلوم جن پر مذہب کا ٹھپہ لگا ہو جیسا کہ ہزارہ ہیں یا جن پر سیاسی مقاصد کے حصول کا کلنک لگا ہو جیسا کہ بلوچ ہیں۔ بے حسی اور اس کے سبب کو مزید اجاگر کرنے کے لیے میں اپنے مضمون کا اختتام بیرتوت بریخت کی منتخب نظموں سے لیے گئے اس اقتباس کے ساتھ کروں گا:

''پہلی بار یہ خبر آئی کہ ہمارے دوستوں کو قتل کیا جا رہا ہے تو وہاں ایک ہولناک شور برپا ہوا۔
اس کے بعد ایک سو قتل ہوئے۔
پر جب ایک ہزار کو قتل کیا گیا اور پھر قتل کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا تو ہر سُو خامشی چھا گئی۔
جب برائی برسنے لگے بارش کی طرح، تو کوئی نہیں چلاّتا، ''تھم جا!''
جب جرائم کا ڈھیر لگنا شروع ہو تو وہ غیر مرئی بن جاتے ہیں۔
جب اندوہ ناقابلِ برداشت ہو، تو پھر گریے نہیں سنے جاتے۔
موسم گرما میں گریے بھی بارش کی طرح برستے ہیں۔''

بشکریہ: نیکڈ پنچ ڈاٹ کام، جمعہ، 31 جنوری 2014

http://www.nakedpunch.com/articles/201

گمنام ہیرو

وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز (وی بی ایم پی) کا تاریخی لانگ مارچ یکم مارچ کو ختم ہو گیا، جب اس کے بہادر اور بے لوث شرکا 106 دنوں کے مارچ کے بعد اسلام آباد پہنچے۔ اس عظیم الشان کوشش نے بلوچوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور کئی سیاسی تنظیموں اور افراد کو متحرک کیا۔ اس لانگ مارچ کا ایک اہم پہلو جسے سول سوسائٹی، مرکزی دھارے میں شامل سیاسی جماعتوں اور دکھ کی بات یہ ہے کہ حتیٰ کہ بائیں بازو کی قوتوں، پنجاب میں چند کے علاوہ، نے بھی بڑی حد تک نظرانداز کیا، وہ تھی پنجاب میں زیرِ تعلیم بلوچ طلبا کی دل و جان سے شرکت؛ اس مارچ کے پنجاب داخل ہونے کے بعد انہوں نے اپنا وقت اور اپنی توانائیاں اس کے لیے وقف کر دی تھیں۔

اس تاریخی لانگ مارچ میں شرکت کے لیے بلوچ طالب علموں کو ایک بھاری قیمت ادا کرنا پڑی کیوں کہ مارچ کے شرکا جب پنجاب میں داخل ہوئے تو ان کے امتحانات ہو رہے تھے اور انہیں امتحانات دینے یا مارچ میں شرکت کرنے میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ انہوں نے مارچ میں شرکت کا انتخاب کیا اور ان میں سے کئی کے پرچے ضائع ہو گئے کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی ترجیح بلوچ قوم ہے، ان کا کیریئر نہیں۔ وہ جو وظائف پر تعلیم حاصل کر رہے تھے انہیں اپنے وظائف کی منسوخی کے خطرے کا سامنا تھا اور ان میں سے بیشتر کو مارچ میں شرکت کے لیے سزا ملنے کا خطرہ درپیش تھا۔

اس میں شرکت کسی بھی طرح سے آسان نہ تھی؛ وہ ہر صبح وین اور کوچز کے ذریعے اپنے ہوسٹل سے آتے اور اس جگہ پر جمع ہوتے جہاں سے مارچ کے شرکا نے گذشتہ شام مارچ روکا تھا

اور وہ وہاں پر وی بی ایم پی کی ٹیم کے پہنچنے کا انتظار کرتے اور جب وہ وہاں پہنچ جاتے تو وہ اس ریڑھی پر تصاویر کو لگانے میں مدد کرتے جسے شرکا مارچ کرتے ہوئے دھکیلتے اور جب مارچ شروع ہو جاتا تو وہ اس گروہ کے گرد ایک حفاظتی گھیرا بنا دیتے، اس تلخ تجربے کے بعد جب رینالہ خورد میں ایک ٹرک نے مارچ کے شرکا کو کچلنے کی کوشش کی اور سرائے عالم گیر میں پیش آنے والے بداخلاقی کے واقعات جہاں چند افراد آئے اور مارچ کے شرکا کے خلاف غلیظ زبان استعمال کی۔ اپنے محدود وسائل پر اس روزانہ کے آنے جانے نے یقینی طور پر ان پر ایک بہت بڑا بوجھ ڈال دیا تھا لیکن یہ چیز انہیں روک نہ سکی اور وہ باقاعدگی سے آتے رہے۔ اگرچہ یہ مارچ اتنا چلنے اور بہادر خواتین کی طرف سے نعروں کے ساتھ بذاتِ خود توانائی اور سرگرمی کی ایک علامت تھا؛ ان نعروں اور سرگرمی کے ساتھ ان نوجوان طلبا کی موجودگی نے مارچ کے شرکا میں شگفتگی اور توانائی کا ایک احساس پیدا کیا۔

یہ بہادر نوجوان نہ صرف مارچ میں شامل ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے طور پر لانگ مارچ کے مقاصد کو اجاگر کرنے کے لیے ہزاروں، درحقیقت 20,000، پمفلٹ چھپوائے اور راستے میں کھڑے افراد اور گزرتی ہوئی گاڑیوں کے درمیان تقسیم کیے تاکہ لوگ مارچ کرنے والوں کے مطالبات سے آگاہ ہوں۔ پرنٹنگ کے لیے رقم درکار تھی اور تقسیم کرنے کے لیے اضافی تگ و دو کی، یعنی کہ لوگوں کے پاس جانا اور انہیں پمفلٹ تھمانا۔ لیکن صرف یہی اخراجات نہیں تھے جن کا بوجھ انہیں اٹھانا پڑا؛ روزانہ سفری اخراجات اور دن کے وقت کھانا اور چائے بھی ان کے محدود وسائل پر بہت بڑا بوجھ تھا۔

یہ اور بات ہے کہ ایئر وائس مارشل (ریٹائرڈ) شہزاد چوہدھری نے یکم مارچ کو 'کیپٹل' ٹی وی کے پروگرام میں صریحاً جھوٹ بولا جب انہوں نے کہا کہ ماما عبدالقدیر، وی بی ایم پی لانگ مارچ کے رہنما کے پاس ایک تھرایا سیٹلائٹ فون ہے اور انہیں بالکل تعجب نہیں ہوگا کہ اگر وہاں پر ان کے ساتھ تین تین یا چار چار لینڈ کروزر موجود ہوں۔ ریکارڈ کی درستی کے لیے کہنا چاہوں گا کہ ماما

کے پاس نوکیا کا ایک سستا فون تھا اور صرف ایک ہی گاڑی جو لانگ مارچ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی وہ ایدھی فاؤنڈیشن کی طرف سے فراہم کردہ ایمبولینس تھی۔ ٹی وی ون کے چینل پر ایک ٹکر چلایا گیا کہ مارچ کرنے والوں کو روزانہ بیس لاکھ روپے دیے جا رہے ہیں اور ان کے لیے کھانا فائیو اسٹار ہوٹل سے آ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مارچ کے شرکا وہی کھانا کھاتے جو راستے کے ہوٹلوں میں دستیاب ہوتا۔ دو مرتبہ ہوٹل مالکان نے کھانے یا چائے کے پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ مارچ کے مرکزی گروہ کی تعداد 20 تھی جنہیں رات گزارنے کیلئے مختلف اشخاص جگہ دیتے جو ان کے حامیوں کے دوست تھے اور جو کچھ بھی وہ انتظام کر سکتے تھے، وہی کچھ رات کے کھانے اور ناشتے میں فراہم کرتے۔ ان اشخاص کو مارچ کے شرکا کی میزبانی کرنے کی پاداش میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف ہراساں کرنے کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلم وڑائچ، جو کہ ایک کلاکار اور سیاسی کارکن ہیں، نے چھ راتوں تک وزیر آباد میں اپنی رہائش گاہ پر ان کے میزبان کا کردار ادا کیا۔ نام نہاد باخبر تجزیہ کاروں اور بعض ٹی وی چینلوں نے انتہائی بے شرمی سے اس مارچ کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹ بولا کیوں کہ یہ مارچ اس جنگ کو اسٹابلشمنٹ کے مرکزی خطے میں لے گیا تھا۔

بلوچ طلبا کی اکثریت نے اپنے چہرے سرجیکل ماسک یا رومال کے ساتھ ڈھانپ رکھے تھے تاکہ وہ پہچانے نہ جا سکیں کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ کینہ پرور اور جوابدہی سے مستثنیٰ انٹیلی جنس ایجنسیاں یقینی طور پر انہیں اپنے غیض و غضب کا نشانہ بنائیں گی۔ یہ بات مزید واضح ہوگئی جب راولپنڈی کے قریب چند انٹیلی جنس اہلکاروں نے ان طلبا کو واضح الفاظ میں بتایا کہ وہ جتنا چاہیں ماسک کے پیچھے اپنے چہرے چھپائیں مگر وہ پہچانے جا چکے ہیں اور مارچ میں شامل ہونے اور اسٹابلشمنٹ کی نافرمانی کی جرأت کرنے کے لیے انہیں جلد از جلد ٹھیک کیا جائے گا۔ اس کا کریڈٹ ان بہادر لڑکوں کو جاتا ہے جو دھمکیوں اور خطرات سے نہ مرعوب ہوئے اور نہ ہی پیچھے ہٹے بلکہ اور زیادہ جوانمردی کے ساتھ اس میں حصہ لینا جاری رکھا۔

یہ دھمکیاں 8 مارچ کو ہفتے کے روز صحیح ثابت ہوئیں جب تقریباً ڈھائی بجے تین بلوچ طلبا

مہران، محمد خالد اور فرخ پریسٹن یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں دوپہر کا کھانا کھانے والے تھے، تب 8 یا 9 لڑکوں کا ایک گروہ وہاں آیا اور ان سے کہا کہ وہ بلوچی میں کیوں بات کر رہے ہیں اور وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان کے سوال پر فرخ نے کہا کہ آپ ہمیں ہماری اپنی ہی زبان بولنے سے کس طرح منع کر سکتے ہیں، کیا آپ یہاں کے حاکم ہیں؟ وہ لوگ اچانک برنجی پنجوں، بوتلوں، کرسیوں وغیرہ کے ساتھ ان لڑکوں پر ٹوٹ پڑے۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ ان سے لڑے اور کسی نے مداخلت نہیں کی۔ تینوں زخمی ہوگئے۔ خالد کے سر کے زخموں کو 18 ٹانکوں کی ضرورت پڑی۔ پولیس نے عذر لنگ پیش کرتے ہوئے اس کی ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر دیا۔ پیر کے روز انہوں نے انتظامیہ کے ساتھ ایک میٹنگ کی تھی جس میں انہیں تعاون کی یقین دہانی کرائی گئی لیکن یہ ابھی دیکھنا باقی ہے کہ ان مجرموں کے خلاف کیا کارروائی کی جاتی ہے، جن کے حوالے سے یہ قوی امکان موجود ہے کہ انہیں کچھ نہیں کیا جائے گا کیوں کہ یہ کالج کا کوئی اتفاقی جھگڑا نہیں تھا بلکہ بلوچ طلبا کو لانگ مارچ کے لیے ان کی مخلصانہ حمایت اور اسٹیبلشمنٹ کی نافرمانی کرنے کے لیے سزا دینے کی ایک منظّم کوشش تھی۔ بلوچ کو سزا دینے کے لیے ایجنسیوں نے غنڈوں کا استعمال کرتے ہوئے ایک تیر سے دو شکار کیے؛ انہیں وہی ملا جو وہ چاہتے تھے اور الزام سے بھی بری الذمہ رہے۔

بلوچستان میں جاری مظالم، لاپتہ افراد کی بڑھتی ہوئی تعداد اور مغوی افراد کی لاشیں پھینکنے کی پالیسی کو اجتماعی قبروں میں دفنانے میں تبدیل کرنا انسانیت کے خلاف سنگین جرائم ہیں لیکن قصورواروں کو سزا سے مکمل استثنیٰ حاصل ہے۔ اب اس جارحیت کے دائرہ کار کو پنجاب میں زیرِ تعلیم بلوچوں تک وسعت دی گئی ہے اور ہوسکتا ہے کہ پریسٹن یونیورسٹی کا واقعہ آخری نہ ہو چونکہ اسٹابلشمنٹ ان لوگوں سے بدلہ لینا چاہتی ہے جنہوں نے لانگ مارچ میں شرکت کی تھی یا اس کی حمایت کی تھی کیونکہ اس لانگ مارچ نے اسٹابلشمنٹ کے مکروہ چہرے کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے۔

میں خوش قسمت تھا کہ 22 فروری کو جہلم کے قریب مارچ میں شامل ہونے کے بعد مجھے ان بہادر اور جذبے سے سرشار بلوچ طلبا، نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (این ایس ایف) کے ارکان، پاکستان یوتھ الائنس (پی وائی اے) کے ارکان کے ساتھ گھل ملنے کا موقع ملا اور جب ہم اسلام آباد پہنچے تو بلوچ طلبا اور دیگر دوستوں کی جانب سے دو راتوں تک بڑی خاطر تواضع کے ساتھ میری میزبانی کی گئی۔ یہ میرے لیے ایک مسرت اور اعزاز کی بات تھی کہ میں نے بلوچستان کے مستقبل کے ساتھ وقت گزارا۔ ان بہادر نوجوانوں نے اپنے کیریئر اور اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال دی تھیں، ایک ایسی چیز کے لیے جو انہیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ فراخ دل لڑکے، بشمول ان تمام لوگوں کے جنہوں نے لانگ مارچ کی حمایت کی، اس عظیم تاریخی لانگ مارچ کے عظیم گمنام ہیرو ہیں اور ہماری غیر مشروط محبت اور احترام کے مستحق ہیں۔

بشکریہ: ویو پوائنٹ آن لائن ڈاٹ نیٹ، جمعرات، 13 مارچ 2014

http://www.viewpointonline.net/2014/03/vp192/3684

''وائے وطن ہُشکیں دار''

کرسچن یوہان ہائنرخ ہائن (13 دسمبر، 1797 تا 17 فروری، 1856) ایک صحافی، مضمون نگار اور سب سے اہم جرمن رومانوی شاعروں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے ہٹلر سے ایک سو سال قبل، جب انہوں نے وہ کتابیں جلائیں جنہیں نازی وطن دشمن اور تخریبی سمجھتے تھے، کہا تھا کہ ''جہاں کہیں بھی انہوں نے کتابیں جلائیں، ان کا انجام انسانوں کو جلانے پر ہوگا'' اور نازی دور حکومت میں بالکل ایسا ہی ہوا اور یہ نہ صرف جرمنوں کیساتھ ہوا بلکہ یورپ بھر کے عوام کیساتھ۔ کتب سوختگی کے عمل کو ببلیو کلاسم یا لبریسائیڈ کے طور پر جانا جاتا ہے اور اسے اسلئے کیا جاتا ہے کیونکہ حکمران تحریری الفاظ اور علم سے خوفزدہ ہوتے ہیں؛ اسکی ایک طویل تاریخ ہے اور اختیار داروں کا اختلاف رائے اور لوگوں کی جداگانہ حیثیت کا خوف اسکے فروغ کا باعث ہوتے ہیں اور اسکا مقصد عوام کو انکے جوابی بیانیے سے محروم کرنا ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر چند کتابوں کیساتھ شروع ہوتی ہے لیکن مقتدرہ کے بڑھتے ہوئے عدم تحفظ کیساتھ یہ آہستہ آہستہ وسعت اختیار کر لیتی ہے۔

پاکستانی مقتدرہ نے اب بلوچستان میں کتابیں جلانا شروع کی ہیں اگرچہ انہوں نے کتابوں پر توجہ وقف کرنے سے کافی پہلے بلوچ عوام کو جلانا شروع کر دیا تھا۔ یہ توجہ اس استحصال اور جبر کیخلاف بڑھتی ہوئی مزاحمت کا نتیجہ ہے جو 27 مارچ 1948ء سے جاری ہے۔ گزشتہ ہفتے پولیس نے گوادر میں کتابوں کی دکانوں پر چھاپے مارے اور ''وائے وطن ہشکیں دار'' نامی کتاب ضبط کی جسے میجر مجید نے لکھا ہے جو مسقط میں رہتے ہیں۔ کتاب کے عنوان کا مطلب ہے، ''مشتاقِ مادر وطن خواہ کیوں نہ ہو یہ سوکھا بن۔'' یعنی کہ، کسی کا مادر وطن خواہ کوئی بنجر زمین ہی کیوں نہ ہو، یہ اسے جنت سے بھی زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ مقتدرہ نہیں چاہتی کہ بلوچ اپنے مادر وطن سے محبت کریں اس کے بجائے یہ انہیں اپنے پاکستان کی پوجا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

انہوں نے بلوچستان کی تاریخ پر دو معروف کتابیں بھی ضبط کیں، لالہ ہتو رام کی 'تاریخ بلوچستان' اور ڈاکٹر شاہ محمد مری کی 'بلوچ'، اور دکان کے مالک کو گرفتار کیا؛ ایک روز قبل دو دکانداروں کو اسی طرح کے الزام میں تربت سے گرفتار کیا گیا تھا۔ بلوچستان میں بلوچ اور بلوچستان کی تاریخ پر کتابیں رکھنا اب ایک جرم ہے۔ جورج اورویل یہ بات بخوبی سمجھتے تھے کہ مقتدرہ کس طرح سے کام کرتی ہے اور انہوں نے بجا طور پر کہا تھا کہ ''لوگوں کو تباہ کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ انہیں اپنی ہی تاریخ کی تفہیم سے محروم کرنا اور اسے مٹانا ہے۔ پاکستانی مقتدرہ نے بلوچ قوم کو علم سے محروم کرنے اور انکی اپنی تاریخ کی تفہیم کو مٹانے کے ذریعے تباہ کرنے کی ٹھان لی ہے۔

بلوچ کو ان کی تاریخ کے بارے میں علم سے محروم کرنے کی تازہ ترین کوشش کی پیشروی 13 جنوری کو عطاء شاد ڈگری کالج تربت میں منعقد ایک کتب میلے پر فرنٹیئر کور (ایف سی) کی طرف سے لگائے چھاپے سے کی گئی۔ اس چھاپے کے بعد ایف سی کے ایک لیفٹیننٹ کرنل محمد اعظم نے ڈھینگیں مارتے ہوئے کہا کہ انہوں نے پاکستان دشمن لٹریچر، کتابیں، نقشے، پوسٹر اور بینرز ضبط کی ہیں اور بی ایس او (آزاد) پر الزام لگایا کہ وہ غیر ملکی طاقتوں کے اشاروں پر اپنے مقاصد کیلئے طلباء کو استعمال کر رہی ہے۔ بلوچستان میں برٹرینڈ رسل، گاندھی، نہرو اور دیگر کی لکھی گئی کتابوں کو تخریبی قرار دیا جاتا ہے جبکہ یہی کتابیں پنجاب یونیورسٹی میں لگے ایک حالیہ کتب میلے میں آزادانہ طور پر دستیاب تھیں؛ آپ اسے دہرا معیار کہیں یا کچھ اور کہنا چاہیں مگر یہ بلوچ کو دنیا سے بے خبر رکھنے کی ایک منظّم کوشش ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بلوچ صرف ان کی تراشیدہ کتابیں پڑھیں جو منظّم طریقے سے ماضی اور حال کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرتی ہیں اور انہیں ایسی کسی چیز کے پڑھنے کے مواقع سے محروم کریں جو ریاستی بیانیے کے برخلاف ہو اور تاکہ اس سے انہیں بلا چوں چرا سر خم تسلیم کرنے والے اذہان مل سکیں۔

ریاست اور اس کے ادارے جنہیں کتابوں اور روشن خیال بلوچوں سے نفرت ہے، منشیات فروشی کی سرپرستی کرتے ہیں اور یہ میرے تخیل کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ایک وزیر نے اسمبلی میں یہ

بیان دیا تھا۔ 29 مارچ کو بلوچستان اسمبلی نے حکومت سے افغانستان کی سرحد سے ملحق بلوچستان کے ضلع قلعہ عبداللہ میں سیراب زمینوں کے ہزاروں ایکڑ اراضی پر پوست کی کاشت کے خاتمے کے مطالبے کی ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور کی تھی۔ یہ قرارداد صوبائی وزیر ڈاکٹر حامد اچکزئی نے ایوان میں پیش کی تھی جس میں کہا گیا کہ پوست کی کاشت سزا سے استثنیٰ کیساتھ کی جا رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ، ''قلعہ عبداللہ حشیش کی کھلے عام فروخت کیلئے بدنام ہے۔ ضلع میں ہیروئن کی تقریباً 120 فیکٹریاں ہیں۔'' انہوں نے مزید کہا کہ، ''پولیس، فرنٹیئر کور (ایف سی)، اینٹی نارکوٹکس فورس اور حتیٰ کہ پاکستان آرمی بھی قلعہ عبداللہ میں موجود ہے لیکن پھر بھی یہ غیر قانونی کاروبار پنپ رہا ہے۔'' ایک اور رکن عبید اللہ بابت نے کہا کہ، ''وہاں کچھ مذہبی لوگ ہیں جو یہ کاروبار کر رہے ہیں۔ میں انہیں مذہبی لوگ نہیں سمجھتا کیونکہ وہ ماحول کو پراگندہ کر رہے ہیں۔'' ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ مقتدرہ جو روشن خیال کتابوں کو تو تخریبی سمجھتی ہے لیکن ہیروئن اور افیون جیسے خطرناک منشیات پر نہایت لاپرواہ ہے جو بنی نوع انسان کیلئے حقیقی عذاب ہیں۔

ان مجرمانہ سرگرمیوں پر آنکھیں موند لینے کا مطلب پولیس، فرنٹیئر کور (ایف سی)، اینٹی نارکوٹکس فورس اور پاکستان آرمی سمیت تمام اداروں کے درمیان ہر سطح پر ایک ملی بھگت موجود ہے۔ بظاہر اس کو مذہبی منظوری بھی حاصل ہے چونکہ ایک رکن نے کہا تھا کہ مذہبی لوگ بھی ملوث ہیں۔ اس جرم کو فروغ دینے اور برداشت کرنے کی محض ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے جو کہ بڑے پیمانے پر ملنے والا وہ منافع ہے جسے منشیات کی تجارت ان لوگوں کیلئے لاتی ہے جو اس کا کاروبار کرتے ہیں اور ان کیلئے بھی جو اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ اخلاقیات، اقدار، مذہبیت، ضمیر اور تقویٰ سب ایک گہری نیند سو جاتے ہیں جب انہیں ڈالر اور روپیوں کی لوری سنائی جائے اور قلعہ عبداللہ میں بالکل یہی ہو رہا ہے۔ اس کی کوئی امید نہیں ہے کہ یہ ادارے جلد ہی اس خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں گے کیونکہ 6 مئی 2011ء میں انسپکٹر جنرل فرنٹیئر کور (آئی جی ایف سی) میجر جنرل عبید اللہ خان نے ضلع قلعہ عبداللہ کے علاقے گلستان میں پوست کی کاشت کے خاتمے کا آغاز کیا تھا لیکن بظاہر یہ غیر قانونی کاروبار پھلا پھولا ہے۔

یقینی طور پر ان 120 فیکٹریوں میں تیار ہونیوالا تمام ہیروئن مقامی طور پر استعمال نہیں ہوتا، اور یقیناً یہ پاکستان میں اندازے کیمطابق 6.4 ملین منشیات کے عادی افراد تک حرکت بعید (ٹیلی پورٹیشن) کے ذریعے نہیں پہنچتا ہے کیونکہ سائنس نے ابھی تک اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ اس کام کو انجام دے سکے۔ یہ ہیروئن مختلف راستوں سے آتا ہے جنکی نگرانی قانون نافذ کرنے والے مختلف ادارے کرتے ہیں اور یہ تب تک کراچی نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس پر لگی آنکھیں اندھی نہ ہوں؛ پیسہ اختیارداروں کے اندھے پن کو یقینی بناتا ہے۔ رپورٹوں میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ افغان ہیروئن کا 40 فی صد یعنی تقریباً 240 ٹن پاکستان کے ذریعے گزر کر دنیا کے مختلف حصوں تک پہنچتا ہے۔ ہر قدم پر بہت سارا پیسہ کمایا جاتا ہے اور اس وجہ سے کوئی اسے روکنے میں دلچسپی نہیں رکھتا؛ درحقیقت جنہیں اس سے منافع ملتا ہے وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جیسا کہ قلعہ عبداللہ کی مثال سے ظاہر ہوتا ہے۔

ایک قابل اور پڑھے لکھے بلوچ کا مطلب ایک زیادہ پرعزم قومپرست ہوگا اور پاکستانی اسٹابلشمنٹ اسی سے خوفزدہ ہے۔ وہ بلوچ جو جبری گمشدگیوں کا شکار بنے، وہ کہ جن کی لاشیں بلوچستان کے مختلف علاقوں میں پھینکی گئیں اور وہ کہ جنہیں جعلی مقابلوں میں قتل کیا گیا، تعلیم یافتہ اور اپنے آپ کو اپنے مقصد کیلئے وقف کیے ہوئے بلوچ تھے، جنہوں نے مطالعہ اور بلوچ کیخلاف روزروا رکھی جانیوالی ناانصافیوں کا مشاہدہ کر کے سیاسی سمجھ بوجھ حاصل کی تھی۔ اس طرح کے بلوچ مقتدرہ کی بلوچ اور بلوچستان کو غلام رکھنے کی پالیسی کیلئے خطرہ بن جاتے ہیں اور لہٰذا انہیں ماردیا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف بدنام زمانہ منشیات کے بے تاج بادشاہ امام بھیل اور ان کے صاحبزادے یعقوب کو ڈاکٹر مالک کی نیشنل پارٹی کے قابل احترام ارکان کے طور پر ریاست کی سرپرستی حاصل ہے۔ قلعہ عبداللہ منشیات کی تجارت کیساتھ پھل پھول رہا ہے جبکہ نیو کاہان، آواران، مشکے، ڈیرہ بگٹی، مری علاقے، قلات اور وہ جگہیں جہاں لوگوں میں ریاستی جبر کیخلاف غم و غصہ ہے فوجی کارروائیوں اور دہشت کے راج کا نشانہ بنائے جارہے ہیں۔ قلات میں قیاساً 40 عسکریت پسندوں کی حالیہ ہلاکتیں اسکی ایک مثال ہے۔ یہ 'لاشوں کی تعداد' والی پالیسی ہے جسے

امریکی فوج نے ویت نام میں اپنائی ہوئی تھی اور تمام ہلاک شدگان کو ویت کانگ قرار دیا جاتا تھا جبکہ یہاں انہیں ''عسکریت پسند'' کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے مقابلوں میں زیادہ تر عام بلوچ مارے جاتے ہیں اور اسوقت اس طرح کے مقابلے عروج پر ہیں اور یہ 'مارو اور پھینک دو' والی پالیسی کی جگہ لے رہے ہیں۔

بلوچستان میں کتب سوختگی جاری رہے گی کیونکہ اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ سیاسی اور انقلابی کتابوں کی تجارت کبھی بھی اتنا منافع بخش ہوگی جتنا کہ پوست کی کاشت اور قلعہ عبداللہ کی ہیروئن فیکٹریاں ہیں اور یہ کبھی بھی اس قابل نہیں ہوگی کہ اسے پاکستانی مقتدرہ کی سرپرستی حاصل ہو۔ تاہم بلوچ نوجوانوں کو پرمغز کتابوں کے ذریعے علم حاصل کرنا جاری رکھنا چاہئے خاص طور پر ان کتابوں کے ذریعے جنہیں پاکستانی ریاست اپنے اس جعلی اور من گھڑت اقدار کیلئے خطرہ تصور کرتی ہے جو وہ بلوچ پر مسلط کرنا چاہتی ہے اور دعویٰ کرتی ہے کہ مذہب قومیت کی بنیاد ہے۔ یہ وہ مخصوص اقدار ہیں جنکا وہ سب سے برتر و اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو قلعہ عبداللہ میں تو ہیروئن اور افیون کی تجارت کو پنپنے کی اجازت دیتا ہے لیکن ان لوگوں پر ظلم و جبر کرتا ہے جو علم کے متلاشی ہوں اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہوں۔ بلوچ کیلئے انتخاب واضح ہے اور اس بات کا فیصلہ ان پر منحصر ہے کہ وہ قلعہ عبداللہ والے اقدار کی تقلید کرنا چاہتے ہیں یا ''وائے وطن ہشکیں دار'' والے اقدار کی۔

بشکریہ: نیکڈ پنچ 10 اپریل 2014

http://nakedpunch.com/articles/208

آزادی کی لگن

نواب خیر بخش مری 29 فروری 1928ء کو پیدا ہوئے، ان کا نام ان کے نام ور دادا کی وساطت سے رکھا گیا جنہوں نے پہلی عالمی جنگ کے لیے مریوں کو بطور ایندھن فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے لیے انہوں نے 1918ء میں برطانیہ کے خلاف گمبز اور ھڑب کی تاریخی لڑائیاں لڑیں۔

وہ سردار دودا خان کی بھی اولاد میں سے تھے، جن کے تحت مریوں نے مئی 1840ء میں سارتاف کے علاقے میں لیفٹیننٹ والپول کلارک کی قیادت میں برطانوی فوجیوں کا مکمل صفایا کیا تھا۔ پھر اگست 1840ء میں، میجر کلبورن کے تحت ایک بڑی فوج کاہان کی امداد کو بھیجی گئی لیکن نفسک سے ہی اسے پسپا کیا گیا۔

بھاولان کے بعد خیر بخش آٹھویں مری سردار تھے جنہیں قبیلے کے لیے خدمات کے عوض سرداری سونپی گئی تھی۔ لوگوں کی اکثریت اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ بلوچ کے دل میں آزادی کے لیے ایک والہانہ محبت موجود ہے اور آزادی کے لیے ان کی جدوجہد خالصتاً اپنی ہے۔

ایک بچہ جو 'پلنگیوں' یا غیر ملکیوں کے خلاف مریوں کی غیر معمولی بہادری کے قصے سن سن کر جوان ہوا ہو تو وہ اور کچھ بن ہی نہیں سکتا، ماسوائے ایک کٹر آزادی پسند کے۔ بہت سے سیاسی تجزیہ کاروں کا یہ دعویٰ ہے کہ نواب صاحب نے بہت دیر بعد ایک آزاد بلوچستان کے خیال کو قبول کیا تھا؛ لیکن یہ بات صریحاً غلط ہے۔

برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ ڈیوس نے 1951ء میں ان سے پوچھا، ''خیر بخش، آپ حکومت کو اپنے بدبخت لوگوں کو ترقی دینے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟'' انہوں نے جواب دیا، ''ڈیوس،

اگر ہٹلر نے برطانیہ پر قبضہ کر لیا ہوتا اور آپ سے یہ کہا جاتا کہ آپ اپنے بدبخت لوگوں کو ترقی دینے میں جرمنوں کی مدد کریں، تو آپ کا ردِعمل کیا ہوتا؟'' ڈیوس نے جواب دیا، ''مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں پھر کبھی آپ سے یہ سوال پوچھوں۔''

وہ دو مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے لیکن استحصال کے خلاف ان کی مسلح مزاحمت بھی ساتھ ساتھ جاری رہی۔ بلوچ عوام کا ایک المیہ یہ ہے کہ وہ واحد شخص تھے جو کہ مسلسل ایک آزاد بلوچستان کا مطالبہ کرتے رہے جب کہ دیگر رہنما با آسانی سمجھوتے کرتے رہے۔

مارشل لا حکام نے 1958ء میں بندوقیں جمع کرانے کا حکم دیا۔ دیگر سرداروں نے احتجاج تو کیا مگر حکم بجا لائے جب کہ نواب صاحب نے انہیں جمع کرانے سے پہلے آری سے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ ان کے لیے کوئی بھی عمل ہتھیار ڈالنے سے زیادہ شرمناک نہ تھا؛ انھوں نے اپنی زندگی میں اس بات کی تبلیغ بھی کی اور اس پر عمل بھی کرتے رہے۔

اسیری کے دوران انھیں کبھی بھی کسی ہسپتال میں داخل نہیں کیا گیا اور نہ کبھی انھوں نے شکایت کی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے کپڑے بھی خود دھویا کرتے۔ دستبرداری اور کمزوری کا اظہار ان کا خاصا نہیں تھا۔ وہ اپنے رویوں میں غیر مصالحانہ تھے۔ دسمبر 2005ء میں پرویز مشرف کے کوہلو دورے کے دوران ایک راکٹ حملے کے بعد، ان کے بیٹے بالاچ نے ان کی رائے معلوم کرنا چاہی تو انہوں نے پوچھا: ''تمہارا نشانہ خطا کیونکر ہوا؟''

انہوں نے اپنے اصول دنیاوی آسائشوں سے زیادہ محبوب رکھے اور اس چیز نے انھیں سمجھوتے کرنے سے بچنے میں مدد دی۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ وہ اب بھی افغانستان سے واپسی کے بعد لیے گئے قرض کی ادائیگی کر رہے ہیں اور اگر ان کے پاس پیسے ہوتے تو وہ اپنے داماد کے گھر میں نہ رہتے۔ دنیاوی آسائش کے عوض اپنے اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرنے نے انھیں بلوچ آزادی کی جدوجہد کی دائمی علامت بنا دیا۔ انہوں نے اپنے اقدار اور اصولوں پر عمل کرنے کی بہت بڑی قیمت ادا کی۔

میں ان چند خوش قسمت افراد میں سے ہوں جن کے ساتھ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ میں ہمیشہ اپنے مضامین انہیں بھیجا کرتا اور وہ ان میں خامیوں کی نشان دہی کرتے۔ وہ مجھ سے ان اردو اور فارسی اشعار کو لکھ بھیجنے کا کہتے جن کا حوالہ میں دیا کرتا۔ وہ نہایت مہربان اور کریم النفس انسان تھے؛ وہ کبھی بھی مجھ سے پہلے کمرے میں داخل نہ ہوتے، اور اصرار کرتے کہ میں آگے چلوں، اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی مان لیا کرتا۔ میں ان کی موجودگی میں ہمیشہ اس طالب علم کی طرح بیٹھتا جو کہ اپنے سب سے زیادہ محترم استاد کی تعظیم میں سہمے ہوئے انداز میں بیٹھے۔

نواب صاحب کی مرغے لڑانے کی محبت افسانوی تھی اور ان کی گفتگو میں بھی ان کا چھڑکاؤ ہوتا۔ انہوں نے ایک بار مجھ سے اور میرے بھتیجوں سلیمان اور زبرکش ٹالپر کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹے تک مرغوں کی یادگار لڑائیوں کے قصے بڑے جوش وولولے کے ساتھ سنائے؛ ان کی تیز یادداشت نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ وہ اکثر اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے مرغ بازی کی اصطلاحات کا استعمال کرتے۔ وہ ان تمام لوگوں کا احترام کرتے جو لڑ سکتے اور کوئی لڑائی منظّم کر سکتے۔

وہ ایک برف پوش آتش فشاں کی طرح اتاہ تھے۔ وہ کبھی بھی اپنے جذبات کو اونچی آواز میں بولنے سے یا سخت لہجے میں یا رقیق القلبی سے بات کر کے مجروح نہیں کیا کرتے۔ وہ ہر طرح کے حالات میں حیرت انگیز تحمل کا مظاہرہ کرتے۔ اپنی 43 سالہ رفاقت کے دوران میں خوش قسمت تھا کہ ان سے سیکڑوں بار ملا لیکن کبھی بھی انہیں ناراض ہوتے یا نامناسب الفاظ کا استعمال کرتے نہیں دیکھا۔ میں نے صرف ایک بار 1988ء میں انہیں لشکر گاہ میں مریوں سے خطاب کے دوران اشک بار ہوتے دیکھا تھا۔ تاہم ان کی آنکھیں اپنے شہید بیٹے بالاچ کے بارے میں بات کرتے ہوئے نم ہو جاتیں۔ وہ اپنے جذبات کو چھپاتے تھے، مگر انہیں دبا کر نہیں رکھتے۔

انہیں اپنے لوگوں سے انتہائی محبت تھی اور وہ اپنے دشمنوں سے شدید نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں لوگوں کی بہت فکر تھی اور وہ ہمیشہ کہا کرتے کہ اگر آزادی لوگوں کو انصاف دلانے میں ناکام ہوئی تو یہ بے معنی ہوگی۔

وہ ایک علامتی والد، ایک رول ماڈل، ایک فلسفی، ایک مدبر اور بلوچ میں جو کچھ بھی اچھا ہے، وہ اس سب کی بہترین مثال تھے۔ انہوں نے نجات اور آزادی کے لیے بلوچ میں موجود غالب خصوصیت کی نمائندگی کی۔ ان کی رحلت ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے اور ان کے حامی اور پیروکار کبھی بھی ان کے غم کو بھلا نہیں پائیں گے۔

یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو ان کی جگہ لے سکے، جس سے بلوچ اس نقصان کے درد کو طاقت کے ایک منبع میں تبدیل کر سکیں تاکہ وہ بھرپور طریقے سے اس جدوجہد کو جاری رکھیں، جس کے لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی۔ اگر وہ یہ کام کر پائیں تو یہ جدید دور کے عظیم ترین بلوچ کے لیے بہترین خراجِ عقیدت ثابت ہوگا۔

بشکریہ: ڈان، اتوار، 29 جون، 2014

http://www.dawn.com/news/1115756/a-love-for-liberty

28 اگست: بلوچستان کیلئے صدائے بیداری

28 اگست کی صبح میرے دوست صاحب جان مری کے ایک رشتہ دار کو سکرنڈ پولیس کی جانب سے ایک فون کال موصول ہوئی۔ پولیس نے انہیں بتایا کہ ان کو پئی جنگل کے قریب سے تین لاشیں ملی ہیں اور ان میں سے ایک کی جیب میں یہ نمبر تھا، جسے انہوں نے ملایا ہے۔

صاحب جان کے خاندان کو پتہ تھا کہ بدترین انہونی ہو چکی ہے کیونکہ ایک دن قبل وہ مٹیاری شہر سے لاپتہ ہوئے تھے جہاں وہ اپنے خاندان، جو کہ شہر سے کچھ فاصلے پر رہتا ہے، کے لیے ضروری اشیا خریدنے گئے تھے۔

جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے صاحب جان کی لاش دیکھی۔ انہیں سر پر انتہائی قریب سے ایک گولی ماری گئی تھی؛ اسی طرح سے ان دونوں کو بھی جو بگٹی تھے۔ بگٹیوں میں سے ایک، شیر دل عرف جرو ولد درمحمد، کو رواں سال کے اوائل میں 18 جون کو اغوا کیا گیا تھا۔ سبزل بگٹی کو اسی دن اغوا کیا گیا تھا، جس دن صاحب جان اغوا ہوئے تھے۔

جرو 22 سال کے تھے، سبزل 20 کے اور صاحب جان کی عمر 45 برس تھی۔ پولیس نے بتایا کہ ان کی لاشیں مگسی کے قریب ایک مزدا ٹرک سے پھینکی گئی تھیں۔ صاحب جان کے رشتہ داروں نے احتجاجاً سڑک بلاک کر دی، جب پولیس نے ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں انہوں نے بادل نخواستہ نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کیا۔

اسی روز بعد میں ایک سینئر صحافی اور بلوچستان یونین آف جرنلسٹس (بی یو جے) کے سیکرٹری جنرل ارشاد مستوئی، زیر تربیت رپورٹر عبدالرسول اور ایک اکاؤنٹنٹ، یہ سب ایک خبر رساں ایجنسی کے لیے کام کرتے تھے، کو کوئٹہ میں گولیاں مار کر قتل کیا گیا۔

استغاثہ تو چھوڑیں بلوچستان میں کسی پر بھی صحافیوں کے قتل کا الزام تک عائد نہیں کیا گیا، یا اس لیے کہ جہاں کہیں بھی وہ لوگ جو صحافیوں کو نشانہ بناتے ہیں، وہ قانون کی گرفت سے باہر ہیں۔ اس میں کوئی تعجب نہیں کہ 2011ء میں انٹرنیشنل پریس انسٹیٹیوٹ کی جانب سے پاکستان کو عالمی سطح پر، صحافیوں کے لیے خطرناک ترین مقام کے طور پر، چوتھے نمبر پر رکھا گیا تھا۔ 8 جولائی 2012ء کو کوئٹہ میں 'بلوچستان میں میڈیا اور سول سوسائٹی' پر ایک ورکشاپ منعقد کی گئی، جس میں یہ انکشاف کیا گیا کہ 2008ء سے لے کر اب تک بلوچستان میں 22 صحافیوں کو قتل کیا گیا ہے۔ اتفاقاً ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے مرحوم ارشاد مستوئی نے کہا تھا کہ، ''تمام مزاحمتی گروہ کو ریچ کے لیے ہم سے رابطہ کرتے ہیں جب کہ سیاسی جماعتیں اور کچھ ادارے میڈیا کو مزاحمتی گروہ سمجھتے ہیں۔''

انہوں نے سیاسی رہنماؤں پر بھی یہ الزام لگایا کہ وہ اپنے 'پریس ریلیز' شائع کروانے کے لیے نامہ نگاروں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ ہر کوئی یہ تصور کر سکتا ہے کہ ہراس دیانت دار صحافی کا انجام کیا ہو سکتا ہے، اگر بعض ادارے اور ان کی کٹھ پتلی سیاسی جماعتیں میڈیا کو محض اس لیے مزاحمتی گروہ سمجھتے ہیں کہ وہ آئی ایس پی آر کے پریس نوٹ شائع کرنے کے بجائے، جو حقیقت ہے اس کو بیان کرنے کی ہمت کرتے ہیں۔ ارشاد مستوئی کا قتل اسی طرح کے صحافتی اقدار کا پاس رکھنے کے عزم کا نتیجہ ہے۔

بعد میں، اسی دن تیرتیج میں ذکریوں پر ایک مہلک مسلح حملہ کیا گیا جو ماشی کے قریب واقع اپنے ذکر خانے میں عبادت کر رہے تھے۔ اس میں سات افراد شہید ہوئے بشمول رضا جہانگیر [بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن - آزاد (بی ایس او - آزاد) کے سیکرٹری جنرل جنہیں گزشتہ سال 14 اگست کو پاکستان فوج نے شہید کیا تھا] کے والد بختیار اور تیرہ سالہ نیاز بلوچ کے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک ماہ قبل ذکری زائرین کی بس کو خضدار کے علاقے میں مذہبی عسکریت پسندوں کی طرف سے نشانہ بنایا گیا جس میں سات افراد زخمی ہوئے تھے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ستمبر 2013ء کے 7.6 شدت کے تباہ کن زلزلے کے بعد آواران

کے علاقے میں عسکریت پسند تنظیموں کو فوج کی طرف سے سہولیات فراہم کی گئی تھیں۔ یہ صرف زلزلے کے بعد ممکن ہوسکا کہ فوج وہاں گھس آئی اور بلوچ قوم پرستی کا مذہب کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے مذہبی گروہوں کو اپنے ساتھ لے آئی۔ بلوچستان کی روادار سیکولر سرزمین کو اسٹابلشمنٹ کی جانب سے ایک مکروہ، غیر روادار، متعصب اور فرقہ وارانہ میدانِ جنگ میں تبدیل کیا جارہا ہے۔

جو بھی مقتدر قوتیں ہیں انہوں نے کچھ وقت کے لیے ہزارہ نسل کشی کو روک دیا ہے اور ذکریوں کو نشانہ بنا رہے ہیں تاکہ بلوچ معاشرے کو ناقابلِ تلافی حد تک تقسیم کریں اور حقوق کے لیے جاری جدوجہد کو کمزور کریں۔ پنجگور میں اسکول کا جلایا جانا بھی ایک بڑے طے شدہ منصوبے کی تکمیل میں موزوں عمل تھا اور اس کا مقصد بلوچ کو تعلیم سے محروم رکھنا ہے۔ گذشتہ اگست بلوچ کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا: 38 ہلاک ہوئے، تقریباً 20 زخمی اور سو سے زائد اغواء ہوئے۔ مزید درجنوں افراد فوج کے ساتھ 'جھڑپوں' میں مارے گئے۔

28 اگست کے واقعات ایک صدائے بیداری ہے۔ قارئین کو تعجب ہوگا کہ میں اسے کیوں صدائے بیداری سمجھتا ہوں: یہ تینوں واقعات نہ بے ترتیب تھے اور نہ ہی غیر متعلق۔ یہ پاکستانی ریاست اور اس کے اداروں کی طرف سے بلوچ کی اپنے حقوق اور وسائل کے لیے جاری جدوجہد کو کمزور کرنے کی اس منظّم اور جابرانہ کوشش کا حصہ ہیں۔

صاحب جان مری اور دیگر افراد کا اغوا اور قتل اس گھناؤنے 'اٹھاؤ-مارو- پھینک دو' والی پالیسی کا تسلسل ہیں، جس کا مقصد بلوچ کی صفوں میں کارکنوں کی تعداد گھٹانا اور دوسروں کو ڈرانا ہے تاکہ وہ بلوچ حقوق کی حمایت سے گریز کریں۔

ارشاد مستوئی کا قتل ان لوگوں کی خاموشی کو یقینی بنانے کے لیے تھا جو بلوچستان میں ناانصافیوں اور مظالم کو بے نقاب کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ آواران اور دوسری جگہوں میں ذکریوں پر حملوں کا مقصد تاریخی طور پر سیکولر بلوچ معاشرے میں عدم رواداری اور تعصب کے کینسر

کو پھیلانا اور سیاسی مزاج میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے سماجی مزاج کو تبدیل کرنا ہے۔

خیر، اب یہ صدائے بیداری کس کے لیے ہے؟ ظاہر ہے میں یہاں ڈاکٹر مالک اینڈ کمپنی جیسوں کو شمار نہیں کر رہا ہوں۔ وہ یہاں پر فوج کی طرف سے منظّم کردہ کھیلوں کی تقریبوں اور ثقافتی میلوں کی زینت بننے کے لیے بیٹھے ہیں۔ وہ ترقی کے ڈرامے اور امن وامان کو برقرار رکھنے کے نام پر بلوچ وسائل کی غیر قانونی لوٹ مار اور بلوچ کے خلاف سفاکانہ جبر کو قانونی جواز فراہم کرتے ہیں۔ انہیں بلوچ حقوق یا ان کے دکھوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ میرا دعویٰ بڑی حد تک تو تک کمیشن رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے جس میں ہر خاص و عام کو الزام سے بری قرار دیا گیا کہ گویا یہ لاشیں کسی غیر معمولی طوفان میں تو تک پر بارش کی طرح برسی تھیں۔ اس سے مزید پتہ چلتا ہے کہ بلوچ کو ان سے کبھی انصاف نہیں ملے گا جو کہ صرف پاکستانی مفادات کی تعمیل کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ، ان سے پہلے کے شریک کاروں کی طرح، بلوچ کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ان سے بلوچ کی تکلیف پر کسی ردعمل کی توقع نہیں کر سکتے۔

یہ صدائے بیداری بالعموم تمام بلوچوں کے لیے اور بالخصوص ان لوگوں کے لیے ہے جو بلوچ حقوق اور وسائل کے لیے بلوچ مزاحمت کی قیادت کر رہے ہیں۔ جب تک کہ نواب خیر بخش خان مری حیات تھے تو وہ اپنی غالب قدآور شخصیت کے ساتھ ان لوگوں کے دل و دماغ پر ایک ہوش مندانہ اثر رکھتے تھے جو بلوچ حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کی رحلت کے ساتھ ایک خلا پیدا ہوا ہے، چونکہ ہمارے درمیان ان جیسا کوئی قدآور واحد رہنما باقی نہیں رہا۔ اس خلا کو صرف ایک بڑے متحدہ بلوچ محاذ سے ہی پُر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ عمل قربانیوں اور دانشمندی کا تقاضا کرے گا۔ مجھے امید ہے کہ بلوچ مزاحمت کی موجودہ قیادت اس عمل کے لیے تیار ہو جائے گی۔

اس ذمہ داری کا بوجھ انہی پر ہے کہ وہ اسٹابلشمنٹ کی طرف سے تیار کردہ ان مذموم عزائم کا مقابلہ کریں جن سے وہ بلوچ معاشرے میں تقسیم پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان آوازاوں کو دبانا چاہتے ہیں جو سچ کا بول بالا کرتی ہیں اور ان لوگوں کا راستہ روکنا چاہتے ہیں جو حقوق کے لیے جدوجہد

کررہے ہیں۔ رہنماؤں پر، ان سب کا مقابلہ کرنے کے لیے، مربوط حکمتِ عملی کیساتھ آگے بڑھنے کی ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب وہ صورتحال کی سنگینی کو سمجھیں اور اپنے اختلافات ختم کردیں۔ رہنماؤں کے درمیان موجود اختلافات اور عدم اتحاد عوام کو منتشر کررہے ہیں جب کہ سرگرم کارکن افسردگی اور مایوسی کی حالت میں کنارہ کشی اختیار کررہے ہیں۔ وہ سرگرم کارکن جنہوں نے اپنی زندگی وقف کررکھی ہے اس نااتفاقی کے سبب ناامید ہورہے ہیں جب کہ دیگر نئے دھڑوں کی تشکیل میں لگے ہوئے ہیں کہ گویا پہلے والے کافی نہ تھے۔ ان سے میں یہی کہوں گا کہ: جدوجہد شخصیات سے زیادہ بڑی ہوتی ہے اور وہ اس پروقار سفر کو جاری رکھیں جس پر وہ نکل پڑے تھے۔

اگر یہ رہنما بلوچ تاریخ میں ایک حاشیے سے کچھ زیادہ بننا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے طریقے بدلنے پڑیں گے اور جلد بدلنے پڑیں گے۔ صرف وہ جو بلوچستان سے زیادہ اپنے آپ سے اور اپنے ذاتی مفاد سے محبت کرنے والے ہیں ان کے لیے متحد ہونا مشکل ہوگا۔ ذاتی انا اور اختلافات کو ایک طرف رکھنے کی ضرورت ہے۔ تمام تنظیموں پر بلوچ عوام کی جانب سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لوگوں اور مادرِ وطن کی بے لوث خدمت کریں۔ اگر وہ عوام کی خدمت اور ان کی رہنمائی کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

بشکریہ: ویوپوائنٹ، جمعرات، 4 ستمبر 2014

http://www.viewpointonline.net/2014/09/vp217/3930

بلوچستان میں متحارب فریق ناقابلِ مصالحت ہیں

قومی سوال پر پاکستان کی بائیں بازو کی سیاست ریاست کے ساتھ ملی ہوئی ہے

انٹرویو: فاروق سلہریہ

ایک حالیہ ریڈیو انٹرویو میں سینیٹر ثنا بلوچ نے اس بات کی نشاندہی کی کہ پاکستان میں پنجاب کی کل گیس پیداوار صرف 2 فیصد ہے، جب کہ 80 فیصد پنجابیوں کو گیس کے استعمال تک رسائی حاصل ہے۔ بیک وقت بلوچستان پاکستان کی کل گیس کا 46 فیصد فراہم کرتا ہے لیکن بلوچستان کے صرف 20 فیصد لوگوں کو گیس تک رسائی حاصل ہے۔ بلکہ اس بات کو بھی رپورٹ کیا گیا ہے کہ بلوچستان کے ساتھ گیس کی نرخوں کے تعین میں بھی امتیازی سلوک برتا جاتا ہے۔ صوبہ بلوچستان سے نکلنے والی قدرتی گیس کے وسائل کے معاملے پر اس کی دیگر شکایات کیا ہیں؟

ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ بلوچستان کی گیس تھی کہ جس نے پاکستانی معیشت کی ابتدا کی۔ سوئی میں گیس کی دریافت کے بغیر بہت کم ترقی ہوئی ہوتی۔ 1955ء سے لے کر 1970ء تک، سندھ میں گیس کی دریافت سے قبل، یہ سوئی سے نکلنے والی گیس تھی جس کا بنیادی طور پر پنجاب اور کراچی کو ترقی دینے کے لیے اندھا دھند استحصال کیا گیا۔ کسی نے بھی اس لوٹ مار کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اس کے نتیجے میں، بلوچ اور بلوچستان کے لوگوں کو اس کی بھیانک قیمت چکانا پڑی ہے۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار ناانصافی کی اس وسعت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ تازہ اعداد و شمار نہیں ہیں۔ یہاں کوئی حالیہ جائزہ یا مطالعہ نہیں کیا گیا ہے جس سے استحصال کی سطح اجاگر ہوسکے۔

بلوچستان:۔ کل پیداوار: 374,161 (ملین کیوبک فٹ) - کل فیصد: 40 -

استعمال: 66,477 - فیصد: 2

سندھ:۔ کل پیداوار: 536,452 (ملین کیوبک فٹ) - کل فیصد: 54 -

استعمال: 386,262 - فیصد: 38

پنجاب:۔ کل پیداوار: 67,691 (ملین کیوبک فٹ) - کل فیصد: 0.6 -

استعمال: 6395,388 - فیصد: 144

خیبر پختونخواہ:۔ کل پیداوار: صفر - کل فیصد: صفر -

استعمال: 24,138 - فیصد: 2

صوبہ وار گیس کی سالانہ پیداوار 7-2006:

سندھ: غیر متعلقہ گیس (ایم ایم سی ایف) 979,198 - متعلقہ گیس (ایم ایم سی ایف) 21,217 - کل (ایم ایم سی ایف) 1,000,415 - فیصد 70.77

پنجاب : غیر متعلقہ گیس (ایم ایم سی ایف) 52,481 - متعلقہ گیس (ایم ایم سی ایف) 16,127 - کل (ایم ایم سی ایف) 68,608 - فیصد 4.85

صوبہ سرحد: غیر متعلقہ گیس (ایم ایم سی ایف) 22,818 - متعلقہ گیس (ایم ایم سی ایف) 3,552 - کل (ایم ایم سی ایف) 26,370 - فیصد 1.86

بلوچستان: غیر متعلقہ گیس (ایم ایم سی ایف) 318,188 - متعلقہ گیس (ایم ایم سی ایف) 0 - کل (ایم ایم سی ایف) 318,188 - فیصد 22.50

پاکستان: غیر متعلقہ گیس (ایم ایم سی ایف) 1372,685 - متعلقہ گیس (ایم ایم سی ایف) 40,896 -

کل (ایم ایم سی ایف) 1413,581 - فیصد 100%

صوبہ وار گیس کی سالانہ پیداوار اور استعمال کا رجحان 7-2006:

سندھ: کل گیس کی پیداوار (ایم ایم سی ایف) 1,000,415 - کل گیس استعمال (ایم ایم سی ایف) 459,369 - تناسب (استعمال بمقابلہ پیداوار) فیصد 45.91

پنجاب: کل گیس کی پیداوار (ایم ایم سی ایف) 68,608 - کل گیس استعمال (ایم ایم سی ایف) 638,008 - تناسب (استعمال بمقابلہ پیداوار) فیصد 930

صوبہ سرحد: کل گیس کی پیداوار (ایم ایم سی ایف) 26,370 - کل گیس استعمال (ایم ایم سی ایف) 42,480 - تناسب (استعمال بمقابلہ پیداوار) فیصد 161

بلوچستان: کل گیس کی پیداوار (ایم ایم سی ایف) 318,188 - کل گیس استعمال (ایم ایم سی ایف) 82,138 - تناسب (استعمال بمقابلہ پیداوار) فیصد 25.81

(ماخذ: پاکستان سالانہ کتاب برائے توانائی 2007)

یہ جدول یہی دکھاتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ کس طرح سے معاملات بگڑے ہیں۔

ایک دستاویز بعنوان ''تیل و گیس اور صوبوں کے حقوق: سندھ کی کیس سٹڈی'' میں اسٹرینگتھنگ پارٹیسپیٹری آرگنائزیشن (ایس پی او) کے چیف ایگزیکٹو نصیر میمن لکھتے ہیں: ''سندھ اور بلوچستان مل کر گیس کی قومی پیداوار کا 93 فیصد سے زائد مہیا کرتے ہیں لہٰذا انہیں پاکستان کی توانائی کا منبع سمجھا جا سکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سندھ اپنی پیداوار کا نصف سے بھی کم گیس استعمال کرتا ہے۔ بلوچستان اپنی پیداوار کا تقریباً ایک چوتھائی گیس استعمال کرتا ہے۔ پنجاب اپنی پیداوار کے مقابلے میں 85 گنا زیادہ گیس استعمال کرتا ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں: ''پنجاب میں 2,760,238 گھریلو صارفین ہیں جب کہ بلوچستان میں صرف 179,372 ہیں۔ اسی طرح سے صنعتی صارفین کی تعداد بالترتیب 4,792 اور 46 ہے۔ اوپر دیے گئے اعداد و

شمار کے مطابق ان کا تناسب بالترتیب 53 فیصد اور 3 فیصد، اور کل کا 53 فیصد اور 1 فیصد ہے۔ قومی اوسط بھی بالترتیب 53 فیصد اور 3 فیصد ہے۔'' بلوچستان کے خلاف امتیازی سلوک اور استحصال کی حقیقت فی منبع نرخوں سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ یہ اعداد و شمار اس کی ایک مثال پیش کر سکیں گے۔ کاملاً غیر مساوی قدرتی گیس کی پیداوار اور فی منبع نرخیں درج ذیل میں شامل ہیں:

گیس فیلڈ	فی منبع قیمت روپوں میں فی ملین برٹش تھرمل یونٹ
سوئی	47.4
پیرکوہ	75.82
لوٹی	75.82
اوسط	66.34

سندھ کی پیداوار 5,36452 ملین کیوبک فٹ سالانہ ہے۔ اس کے فی منبع قیمتیں مندرجہ ذیل ہیں:

گیس فیلڈ	فی منبع قیمت روپوں میں فی ملین برٹش تھرمل یونٹ
قادر پور	137.86
کنڈن واڑی	181.26
بدین	108.61
اوسط	142.57

پنجاب کی پیداوار 67,691 ملین کیوبک فٹ سالانہ ہے۔ اس کے فی منبع قیمتیں مندرجہ ذیل ہیں:

گیس فیلڈ	فی منبع قیمت روپوں میں فی ملین برٹش تھرمل یونٹ
پنج پیر	222.97

روتانہ	188.06
ڈھوڈک	77.77
اوسط	162.93

یہ حکومت آرٹیکل 158 کو ترمیم کرنا چاہتی ہے، جس میں کہا گیا ہے: ''قدرتی گیس کی ضروریات کی ترجیح: جس صوبے میں قدرتی گیس کا منبع واقع ہو اس منبع سے حاصل شدہ گیس سے وہاں کی ضروریات کو پورا کرنے میں اسے پاکستان کے دیگر حصوں پر برتری حاصل ہوگی، روزِ اول سے بمطابق معاہدوں اور ذمہ داریوں کے۔''

مجوزہ ترمیم موجودہ استحصال اور ناانصافی کو مزید تیز کر دے گی اور اسے قانونی درجہ دے دے گی۔ بلوچستان تکلیف میں ہے کیونکہ اس کے قدرتی گیس کے وسائل بے جا استعمال کا شکار ہیں۔ اس کی ناجائز طور پر استعمال ہونے والی گیس کے نرخیں کم ہیں اور اس سے بہت کم روزگار میسر ہوا ہے۔

چودہ اپریل 2006ء کو قومی اسمبلی میں پٹرولیم کے اس وقت کے وزیر امان اللہ جدون نے سوئی سدرن اور سوئی ناردرن کمپنیوں میں ملازمین کے مندرجہ ذیل اعداد و شمار پیش کیے:

کل آسامیاں: 11,613

سندھ سے ملازمین: 3,613 (جس میں سے شہری ڈومیسائل رکھنے والوں کے لیے 1,960 ہیں)

پنجاب سے ملازمین: 5,454

بلوچستان سے ملازمین: 353

اس تناسب کو بہتر بنانے کے بجائے اب یہ اور بھی زیادہ نیچے جا رہا ہے۔

روزنامہ 'ڈان' میں 3 اکتوبر 2014ء کو چھاپے گئے ایک اشتہار میں ہائر ایجوکیشن کمیشن (ایچ

ای سی) نے 22 خالی آسامیوں کا اعلان کیا جس میں پنجاب 11، میرٹ 4، خیبر پختونخواہ 3، سندھ شہری 2، سندھ دیہی 1، اور آزاد جموں کشمیر 1۔ بلوچستان کا کوئی کوٹہ نہیں ہے۔ کوئی بھی بلوچستان کا ڈومیسائل رکھتا ہو، اسے دیگر صوبوں کے ساتھ میرٹ پر مقابلہ کرنا پڑے گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آیا بلوچستان کے خلاف تعصب کسی مخصوص حکومت یا رژیم کی پالیسی ہے؟

یہ امتیاز یقینی طور پر ایک منظّم رجحان ہے، نہ کہ ایک بے ہنگم سرکاری کارروائی۔ اس کی ابتدا بلوچ کے خلاف ایک منظّم پالیسی میں مضمر ہے جو کسی بھی مسابقتی سطح پر تیار ہونے کے لیے اسے کوئی مواقع دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ تعلیم ہی ہے جس سے ایک مساوی کھیل کا میدان بنانے کے لیے لوگوں کو بااختیار بنانے میں مدد ملتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے وہ ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے۔

فاروق سلہریا نے 6 ستمبر 2013ء کو 'دی نیوز' میں شائع ہونیوالے اپنے تحقیقی مقابل اداریے ''تعلیمی رنگ بھید'' میں ثابت کیا ہے کہ یہ امتیاز کا ایک منظّم رجحان ہے۔ یہاں وہ بڑی مہارت سے بلوچستان میں تعلیم کے فروغ کے دعوے کی قلعی کھولتے ہیں اور اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ صوبے میں غیر اعلانیہ طور پر نسلی عصبیت پر عمل کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ''پنجاب اور پنجاب کے زیر تسلط مرکزی دھارے کے ذرائع ابلاغ میں بلوچ کی شکایات کو اکثر معروف حیلوں سے مسترد کر دیا جاتا ہے۔ ایک گھسا پٹا عذر یہ ہے کہ بلوچ سردار صوبے کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ تاہم، جب بھی کوئی بلوچستان کے ساتھ روا رکھے گئے اس منظّم امتیازی سلوک کو دیکھتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ ترقی مخالف بلوچ سردار نہیں ہیں بلکہ یہ 'وفاق' ہے کہ جس نے پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی ہوئی ہے۔'' وہ کہتے ہیں کہ جو تعلیمی رنگ بھید بلوچستان پر ہائر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) کی جانب سے نافذ کیا گیا ہے وہ بالکل واضح ہے، جیسا کہ، اس کے آغاز کے بعد سے، مالی سال میں 03-2002 تا 13-2012 تک اس نے کل ایک کھرب 57 ارب 10 کروڑ 20 لاکھ (157,102 ملین) روپے مالیت کے

737 منصوبوں پر مختص کیے تھے۔ ان میں سے، محض 9 ارب 43 کروڑ 30 لاکھ (9,433 ملین) روپے مالیت کے 48 منصوبے بلوچستان کی سات یونیورسٹیوں کے لیے مقرر کیے گئے۔ سلہریا کہتے ہیں کہ بلوچستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی (بی یو ای ٹی) خضدار کو 10 سال میں 284 ملین روپے (8 منصوبے) ملے ہیں لیکن لاہور یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کو 8,361 ملین روپے (23 منصوبے) عطا کیے گئے۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ٹیکسلا کو بی یو ای ٹی خضدار پر ترجیح دی گئی۔ اسے 110 ملین روپے (20 منصوبے) دیے گئے۔ اس طرح سے لسبیلہ یونیورسٹی آف ایگریکلچر، واٹر اینڈ میرین سائنسز (ایل یو اے ڈبلیو ایم ایس) کو 1,943 ملین روپے (5 منصوبے) دیے گئے۔ یونیورسٹی آف ایرڈ ایگریکلچر راولپنڈی اور یونیورسٹی آف ایگریکلچر فیصل آباد کو بالترتیب 1,815 ملین روپے (21 منصوبے) اور 2,647 ملین روپے (25 منصوبے) دیے گئے۔ اسی طرح سے بلوچستان کی واحد خواتین یونیورسٹی کو 965 ملین روپے موصول ہوئے جب کہ ایف جے خواتین یونیورسٹی راولپنڈی، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور اور خواتین کی یونیورسٹی ملتان کو دل کھول کر بالترتیب 879 ملین روپے (10 منصوبے)، 847 ملین روپے (13 منصوبے)، اور 1,144 ملین روپے (بغیر کسی منصوبے) الاٹ کیے گئے۔

سلہریہ مزید کہتے ہیں کہ بلوچستان میں تعلیمی رنگ بھید اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے جب اس کے مقابلے میں اسلام آباد کے لیے مختص کی گئی رقم سے اس کا موازنہ کیا جائے کیونکہ یہ موازنہ آبادی میں فرق کی دلیل کی نفی کر دیتا ہے۔ ایچ ای سی کی دریا دلی سے دو سب سے زیادہ مستفید ہونے والے ادارے، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اور ٹیکنالوجی (این یو ایس ٹی) اور کومسیٹس انسٹی ٹیوٹ انفارمیشن ٹیکنالوجی (سی آئی آئی ٹی)، کو 15205 ملین روپے (22 منصوبے) اور 7373 ملین روپے (28 منصوبے) بالترتیب دیے گئے جو اتفاق سے بلوچستان کو الاٹ کی گئی کل رقم سے 13145 ملین روپے زیادہ ہے۔ بلوچستان کو الاٹ کی گئی کل رقم این یو ایس ٹی اور سی آئی

آئی ٹی کو الاٹ کی گئی کل رقم کے نصف سے بھی کم ہے۔ سلہری یہ کہتے ہیں کہ اس رنگ بھید کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ایچ ای سی کی بیوروکریسی اسے پنجاب کے حق میں کرنے کے لیے جان بوجھ کر اور بدنیتی سے طریقہ کار کی توڑ مروڑ کرتی ہے، 60 فیصد پنجابی اپنے 50 فیصد مختص کوٹہ پر بیرون ملک گئے جب کہ بلوچ کی نمائندگی اس کے چھ فیصد کوٹہ سے بھی نیچے رہی۔

ریاست یہیں پر نہیں رکتی۔ اس نے بلوچ نوجوانوں کو تعلیم کے ذریعے احساسِ بیگانگی میں مبتلا کرنے کے لیے فوج اور بحریہ پر اس کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ وہ اس میدان میں ڈاکٹر مالک اور ان کے حلقہ احباب سے زیادہ فعال ہیں۔ ہر جگہ 'کیڈٹ کالج' کھولنے پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ ریاست تعلیم دینے کے بجائے سیاسی اور سماجی اقدار کو تبدیل کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔

سوال: 'ویو پوائنٹ' کی طرف سے حال ہی میں ڈاکٹر اللہ نذر اور حیربیار مری کے ساتھ ہوئے انٹرویو شائع کیے گئے۔ دونوں نے دعویٰ کیا کہ اسٹابلشمنٹ قوم پرست قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بلوچستان میں جان بوجھ کر مذہبی عسکریت پسندی کی سرپرستی کر رہی ہے۔ کیا آپ اس رائے سے متفق ہیں؟

جواب: زمین پر موجود شواہد کو، کسی بھی ذی شعور شخص کو قائل کر لینا چاہیے کہ ریاست فعال طور پر بلوچستان میں قوم پرست قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مذہبی عسکریت پسندی کی سرپرستی کر رہی ہے۔ تمام آزاد نامہ نگاروں اور مبصرین کا کہنا ہے کہ آواران میں 24 ستمبر 2013ء کے زلزلے کے بعد حافظ سعید اور ان کے جیسے عسکریت پسند تنظیموں کو ان علاقوں میں جگہ بنانے کے لیے معاونت کی جا رہی ہے جو کہ اس سے پہلے ان کی پہنچ سے باہر تھیں۔ اس کے نتائج تیزی سے ظاہر ہو رہے ہیں، خاص طور پر خواتین کی تعلیم کے خلاف حملوں سے اور عموماً حصول تعلیم کے خلاف کارروائیوں سے۔ جدید علوم سے آراستہ اسکولوں کو خطرہ لاحق ہے، حتیٰ کہ کیچ اور تربت میں انہیں جلایا تک گیا، تنظیم الاسلام الفرقان اور الجہاد جیسی تنظیموں کی جانب سے۔ کسی مجرم کو گرفتار نہیں کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ، بلوچستان، جو کہ سماجی طور پر ہمیشہ سے سیکولر رہا ہے، جہاں برادریاں امن اور ہم آہنگی کے ساتھ رہتے آ رہے تھے، اب مذہبی عداوتوں کے سبب شکستی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ 28 اگست کو ذکری فرقے کے ذکر خانے پر حملہ کیا گیا اور اس میں سات افراد شہید ہوئے۔ ان میں سے ایک بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے سیکرٹری جنرل رضا جہانگیر کے والد بختیار تھے۔ خود رضا کو پاکستان فوج نے گذشتہ سال 14 اگست کو قتل کیا تھا۔ اس سے قبل خضدار میں ذکری زائرین کی ایک بس پر حملہ ہوا اور سات افراد زخمی ہوئے تھے۔

تو تک کی اجتماعی قبریں، جہاں سو سے زائد لاشیں دفن کی گئی تھیں، 'اسٹریٹجک اثاثوں' کی کارستانی تھی۔ اس جگہ پر جہادی لٹریچر اور نعرے بکھرے پڑے تھے۔ لہٰذا اس کی تحقیقات کے لیے جو جعلی عدالتی کمیشن قائم کیا گیا، اسے قصوروار ٹھہرانے کے لیے کوئی نہیں ملا۔

ہزارہ شیعوں کو مسلسل ہدف بنایا جا رہا ہے، انہیں اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر خستہ حال کشتیوں میں ہجرت کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں عید کی خریداری پر تازہ ترین حملہ (یہ انٹرویو 23 اکتوبر 2014 کے حملے سے قبل کیا گیا تھا) یہ ظاہر کرتا ہے کہ حکومت متحرک طور پر بلوچ کے پیچھے لگی ہوئی ہے لیکن ان فرقہ وارانہ قاتلوں کو دیکھنے پر بہ آسانی اندھی ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ بلوچ قوم پرستوں کے خلاف جنگ میں ان کی مدد کرنے کا معاوضہ ہے۔

سوال: ڈاکٹر عبدالمالک کی حکومت سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن ذرائع ابلاغ میں بہت سے لوگوں نے بلوچستان کی موجودہ حکومت سے اپنی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ آپ ذاتی طور پر مالک حکومت کی، اب تک کی، کامیابیوں اور ناکامیوں کا اندازہ کس طرح لگائیں گے؟ کیا آپ کو لگتا ہے کہ یہ حکومت ریلیف دینے میں ناکام ہوئی ہے، اور بلوچستان میں پارلیمانی طرزِ سیاست سے مایوسی میں اضافہ ہوگا؟

جواب: ہمیں ایک بات بالکل صاف سمجھنی چاہیے۔ بلوچ کی اکثریت کو ڈاکٹر مالک اور ان کی قبیل سے کوئی امیدیں وابستہ نہیں ہیں۔ انہوں نے مؤثر طور پر انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا اور اس حقیقت کو یہ بات ثابت کرتی ہے کہ پی بی 48 کیچ کے جس حلقے سے ڈاکٹر مالک ایک فاتح

کے طور پر سامنے آئے ہیں، انہوں نے صرف 4539 ووٹ حاصل کیے جب کہ ووٹروں کی کل تعداد 74374 ہے۔ تمام جعلی ووٹنگ کے باوجود، صرف 14 فی صد لوگوں نے ووٹ ڈالا۔ پی بی 41 آواران سے عبدالقدوس بزنجو، جو کہ ڈپٹی اسپیکر ہیں، نے کل 57666 ووٹوں میں سے صرف 544 ووٹ حاصل کیے: یعنی صرف 1.18 فی صد لوگوں نے ووٹ ڈالے۔ الیکشن کمیشن اور نادرا نے ستمبر 2013ء میں کہا تھا کہ بلوچستان میں 65 فیصد ووٹ پڑے ہیں، سب جعلی تھے۔

صرف خوش فہمی میں مبتلا لبرل اس متوسط طبقے والی طوطا بیانی سے متاثر ہوئے ہیں۔ زمینی حقائق سے بے خبر یہ لوگ ان سے معجزاتی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کی امید کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو ہر وہ چیز موہ لیتی ہے جس پر متوسط طبقے کا لیبل لگا ہوا ہو اور وہ بنا کسی تحفظات کے نغمہ سرا ہو جاتے ہیں اور جس کا انجام انہیں ندامت کی صورت میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر مالک کی حکومت نے اب تک یہ کیا ہے کہ چین کے ساتھ یادداشتوں پر دستخط کرنا اور بلوچستان کے حقیقی حکمرانوں، یعنی فوج اور فرنٹیئر کور، کو ایک سویلین چہرہ فراہم کرنے کے لیے ان کی طرف سے منعقد کردہ نام نہاد ثقافتی اور کھیلوں کے میلوں میں شرکت کرنا رہا ہے۔ ان کے تمام کیے گئے وعدے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اگرچہ وہ اکثر کہتے ہیں کہ اگر وہ لاپتہ افراد کا مسئلہ حل نہیں کر سکے تو مستعفی ہو جائیں گے مگر پھر بھی وہ بلوچ کی اس سست رفتار نسل کشی اور بلوچ وسائل کی لوٹ مار کی صدارت کر رہے ہیں۔

بلوچ کی ایک بڑی اکثریت پارلیمانی طرز سیاست پر بالکل یقین نہیں رکھتی۔ یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ غیر ملکی طاقتیں اس عمل پر اعتماد کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں، بلکہ سردار عطا اللہ مینگل (1972ء تا 73ء) کی حکومت کے بعد تمام حکومتوں نے بلوچ کی حالت زار میں بہتری لانے کے لیے نہایت کم اقدامات اٹھائے ہیں۔ ڈاکٹر مالک اور ان کی حکومت کو فوج اور ایف سی کا پٹھو سمجھا جاتا ہے۔ ان کے اور بلوچ عوام کے درمیان کسی قہر و مہر کا رشتہ نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ کو لگتا ہے کہ پرامن جدوجہد کے ذریعے حقیقی فوائد حاصل نہیں ہو پا رہے، جس کے نتیجے میں عسکریت پسند مزاحمتی گروہ زیادہ سے زیادہ بلوچ نوجوانوں کو اپنی طرف

مائل کر رہے ہیں؟ اس کے علاوہ، ڈاکٹر اللہ نذر کا دعویٰ ہے کہ وہاں تقریباً 6000 جنگجو پاکستان فوج کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ 6000 جنگ جوؤں کی ایک قوت دنیا کی سب سے بڑی افواج میں سے ایک کے خلاف مزاحمت کو آزادی کی جانب لے جا سکتی ہے؟

جواب: اس سے پہلے کہ میں اس سوال کا جواب دوں، یہ کہتا چلوں کہ میرا ایمان ہے کہ یہ عوام ہیں جو کہ تاریخ کے دھارے کا تعین کرتے ہیں نہ کہ افواج کا حجم اور طاقت۔ اگر افواج اس کا موجب ہوتیں تو پھر اس حساب سے دنیا پر آج تک فرعونوں، سکندر اور چنگیز خان کی آل و اولاد کی حکومت ہوتی۔ اگر افواج تاریخی عمل کے حتمی فیصلہ کنندگان ہوتے تو امریکہ کو ویت نام یا سوویت یونین کو افغانستان میں شکست نہیں ہوئی ہوتی۔ تاریخ میں افواج کی حیثیت زیادہ تر آرائشی و زیبائشی ہے۔ یہ بات تا ابد حقیقت رہے گی۔

خاص طور پر بلوچ نوجوان اور عموماً بلوچ عوام نے پرامن ذرائع جدوجہد پر آس لگانا چھوڑ دیا ہے۔ میں اس بات کو دہرانا چاہوں گا کہ یہ غیر ملکی طاقتوں کے سبب نہیں ہے بلکہ اس سلوک کے سبب ہے جو ان سے 27 مارچ 1948ء سے لے کر اب تک برتا جا رہا ہے۔ بلوچ نوجوانوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس حقیقت کو بلا تعرض قبول کر لیں گے کہ فوج اور ایف سی جب چاہے اپنی مرضی کے مطابق انہیں اٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے، ان کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ وہ سرمچاروں کے ساتھ جڑ جائیں تا کہ انہیں اپنی بقا کے لیے لڑنے کا موقع ملے یا عزت کے ساتھ مرنے کا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ 6000 سرمچار، کہ جن کا ذکر ڈاکٹر اللہ نذر نے صرف اپنی تنظیم کے حوالے سے کیا ہے، غیر ملکی نہیں ہیں کہ جنہیں بلوچستان میں تعینات کیا گیا ہے۔ ان کے رشتہ دار ہیں، دوست اور ہمدرد ہیں۔ مزید برآں، یہ 6000 کہ جنہوں نے اس وقت معمول کی زندگی کے ساتھ ناطہ توڑ دیا ہے، وہاں اور بھی بہت سارے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی صفوں میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں۔ تاہم سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ 6000 سرمچار بلوچ عوام کے وسیع سمندر کی مچھلیاں ہیں جو ان کی حمایت کرتے ہیں۔ وہاں اور بھی بہت سارے سرمچار ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ تاریخ کی لہر کا رخ تبدیل کرنے کے قابل ہیں۔

سوال: حالیہ برسوں میں بلوچ مزاحمت کی نئی نسل کی قیادت نے بھارت، امریکہ یا ہر کسی سے مدد قبول کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ماضی میں غوث بخش بزنجو، نواب خیر بخش مری اور سردار عطا اللہ مینگل جیسے رہنماؤں کو ان کے سوشلسٹ جھکاؤ اور سامراج مخالف میلان کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ نئی نسل کے آنے سے ایک نظریاتی تبدیلی بھی واقع ہوئی ہے؟

جواب: اس بات کو پرانے مؤقف سے نظریاتی انحراف کے طور پر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ یہ محض زمینی حقائق کی تبدیلی کی قبولیت ہے۔ وہ اس امر کو مکمل طور پر سمجھتے ہیں کہ اس بات کا انحصار ان کی اپنی قوت پر ہے، جو ان کی فتح یا شکست کا تعین کرے گی کیوں کہ اگر کوئی ان کی مدد کرنے پر غور کرے بھی تو وہ کسی خلا میں ایسا نہیں کرے گا۔ بلوچ مساوات پر یقین رکھنے والا معاشرہ ہے اور اب بھی مری جیسے قبائل ہیں جہاں ہر عشرے بعد زمین کی از سرِ نو تقسیم ہوتی ہے۔ موجودہ رہنما محض اپنی ساکھ اور کامیابی کے امکانات کو شدید خطرے میں ڈالنے کے بعد ہی اپنے سوشلسٹ جھکاؤ اور سامراج مخالف ذہنی میلان سے منحرف ہو سکتے ہیں۔ ان کے امداد قبول کرنے کے اعلان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کسی دوسری طاقت یا ملک سے اسی طرح کے سلوک کو قبول کریں جو کہ پاکستان نے ان سے روا رکھا ہوا ہے۔ کسی بھی آنے والی امداد کو برابری کی بنیاد پر ہونا پڑے گا۔

سوال: آپ کے خیال میں بلوچ شکایات کا ازالہ فیڈریشن کے موجودہ فریم ورک کے اندر کیا جا سکتا ہے یا یہ کہ بلوچستان کا مسئلہ ناقابلِ واپسی نقطے تک پہنچ چکا ہے؟

جواب: میرا ماننا یہ ہے کہ بلوچ شکایات کا ازالہ فیڈریشن کے موجودہ فریم ورک کے اندر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بلوچ عوام کے خلاف یہ کوئی اتفاقی یا الگ تھلگ ناانصافی، جبر اور استحصال کا ایک مسئلہ نہیں ہے۔ ناانصافیوں کا ارتکاب منظّم انداز میں ادارہ جاتی رہنمائی کے تحت ہوتا آ رہا ہے اور ہر گزرتا لمحہ بلوچ کے اس یقین کو مزید تقویت دے رہا ہے کہ انہیں پاکستان میں انصاف نہیں مل سکتا۔ اب یہ ان کے لیے کسی انوکھے این ایف سی ایوارڈ کے حصول یا کسی کم بخت اٹھارویں ترمیم کا مسئلہ نہیں رہا۔ اب وہ اپنی قسمت کا مالک بننا چاہتے ہیں۔

دنیا میں کہیں اور ہزاروں لوگوں کی جبری گمشدگیوں اور 'مارو اور پھینک دو' والی منظّم پالیسی کے خلاف احتجاج کے لیے 106 دن کا مارچ کوئی ردِعمل اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ لیکن یہاں ماما قدیر بلوچ اور بہادر بلوچ خواتین کی طرف سے کیا گیا لانگ مارچ ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں کہلوا سکا۔ اگر کوئی اب تک یہی سوچتا ہے کہ بلوچ خالی خولی الفاظ اور کھوکھلے قوانین سے مطمئن ہو جائیں گے تو وہ صریحاً غلطی پر ہے۔ اعلیٰ ترین عدالت کی طرف سے کیے گئے وعدوں کے باوجود، بلوچستان میں جاری 'غلیظ جنگ' کے ذمہ داروں کے خلاف مقدمہ چلانا تو درکنار ان میں سے کسی ایک شخص پر الزام تک عائد نہیں کیا گیا ہے۔ ناقابلِ واپسی نقطے پر پہنچنا کوئی مخصوص واقعہ نہیں تھا۔ یہ ایک طویل عمل تھا اور یہ عمل اب ناقابلِ واپسی ہے۔

سوال: پونم کے پلیٹ فارم سے یہ کوشش کی گئی تھی کہ مظلوم اقوام کو ان کے حقوق کا دفاع کرنے کے لیے اکٹھا کیا جائے۔ اس میں تبخیر تو پیدا ہوئی لیکن وقت سے پہلے ہی اسے ختم کر دیا گیا۔ صورتحال اس سے بھی زیادہ خراب ہوئی ہے۔ آپ کے خیال میں قوم پرست قوتوں کے اتحاد کو نہ صرف پاکستان بلکہ پورے جنوبی ایشیا میں ابھر کر سامنے آنا چاہیے؟

جواب: قوم پرست قوتوں کا اتحاد آج نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ پوری دنیا کے لیے وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اسکالٹش ریفرنڈم ایک دم سے غیر متوقع طور پر پیدا نہیں ہوا۔ اس کی وجوہات اکثریتی اقوام کا اقلیتی اقوام سے سلوک میں پیوستہ ہیں۔ یوگوسلاویہ کا انہدام ہوا اس لیے کہ سرب اکثریت کروشیائی، بوسنیائی باشندوں اور دیگر کو ساتھ ملانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ تبت اور دیگر علاقے جہاں اقلیتی عوام آباد ہیں، وہ چین وغیرہ جیسی اکثریت کے غلبے میں ہیں اور وہاں لوگ اس طوق کو ہٹانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ ایک عالمی رجحان ہے اور اگر وہ سب کسی قسم کا اتحاد بنا لیں ہے تو اس سے ضرور مدد ملے گی۔

یہاں نفرت صرف بلوچستان میں نہیں پائی جاتی ہے۔ سندھ میں بہت سے لوگ ہیں جو اپنے استحصال سے متنفر ہیں، اسی طرح سے گلگت اور بلتستان میں بھی۔ قومی جبر زیادہ تیزی سے اور کم خون ریزی کے ساتھ ختم ہو سکتا ہے اگر تمام خطوں کے مظلوم کوئی مشترکہ محاذ تخلیق کرنے کے لیے

کام کریں بجائے اس کے کہ وہ اپنے مختلف مسکنوں تک محدود رہیں۔

سوال: قومی جدوجہد میں طبقاتی سوال کو اتحاد کے نام پر پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ بلوچ قومی جدوجہد بمشکل اس سے مستثنیٰ ہے۔ براہِ مہربانی اس پر اپنی رائے دیں۔

جواب: بلوچ قوم پرست جدوجہد میں طبقاتی کے سوال کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے، کیونکہ کسی بھی قومی جدوجہد کے لیے بنیادی دشمن قومی ہوتا ہے، نہ کہ طبقاتی جابر۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ بالائی طبقہ ہے جو فعال طور پر دشمن کے ساتھ تعاون کر رہا ہے اور یہ امر مستقبل میں طبقاتی جدوجہد کی اساس پیدا کرتا ہے۔ لیکن بالائی طبقے سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ دشمن کے کیمپ میں نہیں ہیں۔ یہ اگر خودکشی نہ سہی مگر کاملاً بے وقوفی ہوگی اگر وہ لوگ جو قومی جابر کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں، اپنی طبقاتی جدوجہد کی لگن میں، اپنے ان گراں قدر حامیوں کو حریف بنالیں اور الگ تھلگ کر دیں۔

افسوس کی بات ہے کہ یہاں دائیں بازو اور بائیں بازو، مختلف نظریاتی بنیادوں پر، پاکستانی ریاست کی سالمیت کی حمایت اقلیتی اقوام کی امنگوں کی قیمت پر کر رہے ہیں۔ پاکستان میں بایاں بازو، جو کہ طبقاتی جدوجہد کی نمائندگی کرتا ہے، قومی جدوجہد کے حقائق کو سمجھ نہیں سکا ہے، اور اس نظریے کا احترام کرنے کے بجائے اس کا کردار زیادہ تر ریاستی نمائندے کی طرح کا ہے۔ جب بنگلہ دیش کے لوگوں کو سب سے زیادہ شیطانی انداز میں کچلا جا رہا تھا تب بہت سے بائیں بازو والوں نے فوج کی حمایت کی تھی اور بنگالیوں کی مذمت۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر بائیں بازو نے زیادہ ارتباط کے ساتھ بلوچ قومی جدوجہد کی حمایت کی ہوتی تو وہ بھی زیادہ فعال طور پر طبقاتی جدوجہد کی حمایت کرتے۔

سوال: بلوچستان میں جبکہ صورت حال کئی حوالوں سے انتہائی گھمبیر ہے، کیا آپ کو لگتا ہے کہ اقتدار کے ایوانوں میں کسی کو اس بات کا احساس ہے؟ یا یہ معاملہ کچھ یوں ہے کہ فوج یہ امید کر رہی ہے کہ وہ بندوقوں اور مذہب کی خوراک کے ذریعے بلوچستان کو ٹھنڈا کر دے گی؟ نوشتہ دیوار کے باوجود کیا وہ اتنے ہی جاہل ہو سکتے ہیں جتنا کہ 1971ء میں تھے؟ اگر ہاں تو اس

صورتحال پر ان کی سراسر جہالت کا سرچشمہ کیا ہے؟

جواب: وہ لوگ جو اقتدار کے ایوانوں میں مقیم ہیں، حقیقی دنیا میں ہونے والے واقعات دیکھنے سے عاری ہیں۔ وہ طاقت کے نشے میں چور انتہائی مغرور ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ طاقت کا استعمال کر کے اور اپنی عیارانہ حکمتِ عملی سے لوگوں کی خواہشات کو ختم کر سکتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی تین جہتی حملے والی حکمتِ عملی سے آخر کار بلوچ کو شکست دے دیں گے۔ ان کی حکمتِ عملی کا انحصار بنیادی طور پر طاقت کے استعمال پر ہے۔ دوسرا، بلوچ معاشرے کی تاریخی طور پر سیکولر سماجی اقدار کو تبدیل کرنے کے لیے مذہبی عناصر کی رواج دہی ہے، اور تیسرا بلوچ سرمچاروں کی صفوں میں اپنے خفیہ ایجنٹ اور جاسوس بھیجنا تاکہ وہ ان میں اختلافات پیدا کریں اور دھڑے بنائیں۔ یہ حکمتِ عملی 2007-2008ء کے بعد سے کارفرما ہے جب صرف انٹیلی جنس بیورو نے بلوچستان میں انسداد بغاوت کے لیے 400 ملین روپے خرچ کیے۔ وفاداریاں خریدنے اور جاسوسی کی خدمات حاصل کرنے کے لیے پیسہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان سب نے ایک مخصوص حد تک کام کیا ہے لیکن یقینی طور پر اس حد تک نہیں جتنی کہ ان کی توقعات تھیں، جیسا کہ سرمچاروں کے حملے حسب منشا جاری ہیں اور حال ہی میں وہ ان کے مذہبی پراکسی تنظیموں کو بھی نشانہ بنا رہے ہیں۔

اس سراسر جہالت کا ماخذ ان کا یہ غلط عقیدہ ہے کہ وہ اسلام کے مشعل بردار ہیں اور یہ ملک اسلام کے لیے بنایا گیا تھا۔ فوج یہ سکھاتی ہے کہ ایک مسلمان دس ہندوؤں کے برابر ہے۔ انہیں لگتا ہے کہ وہ اسلام کی سب سے بہترین نمائندگی کرتے ہیں جو کہ حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ بنگلہ دیش میں ان کا خیال تھا کہ طاقت کا استعمال سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔ انہیں مذہبی جماعتوں کی حمایت حاصل تھی لیکن ان سب کا نتیجہ صفر نکلا۔

تاریخ سے ناواقف کبھی بھی نوشتہ دیوار نہیں پڑھ سکتے۔ وہ ہمیشہ وہی غلطیاں دہراتے ہیں اور پھر ان غلطیوں کے لیے دوسروں کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔

سوال: کیا کیا جانا چاہیے؟

جواب: ایمانداری سے کہوں تو کچھ زیادہ نہیں۔ کیوں کہ متحارب فریق ناقابلِ مفاہمت

ہیں۔ کسی پرامن حل کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ ایک طویل جدوجہد ہوگی جس میں بلوچ کو یقین ہے کہ وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ پاکستان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بہ آسانی دستبردار ہو جائے گا، خودفریبی کے مترادف ہے۔ تاہم بلوچ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ آسانی سے دستبردار ہو جائیں گے، یکساں طور پر معصومانہ خیال ہے۔ پاکستان دنیا میں دہشتگردی کا مرکز نگاہ بن چکا ہے اور یہ مختلف اقسام کے دہشتگردوں کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہے۔ یہ چند شرپسند عناصر کے سبب نہیں ہے۔ یہ ادارہ جاتی ہے اور اسے ریاست کی سرپرستی حاصل ہے۔ پاکستان عالمی امن کے لیے خطرہ بن چکا ہے۔ تاہم یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ایک آزاد، جمہوری اور سیکولر بلوچستان اس ریاستی معاونت سے بڑھتی ہوئی مذہبی عسکریت پسندی کو روکنے کے لیے مددگار ثابت ہوگا اور یہ خطے میں پرامن ماحول کے قیام میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ یہ منظرنامہ آج ناممکن لگتا ہے لیکن خطے میں امن کو یقینی بنانے کے لیے صرف یہی واحد راستہ ہے۔

بشکریہ: ویوپوائنٹ آن لائن

تاریخ اشاعت: جمعرات، 23 اکتوبر 2014

http://www.viewpointonline.net/2014/10/vp224/warring-sides-in-balochistan-are-irreconcilable-pak-left-sides-with-state-on-national-question

کیا یہ اختتام ہے؟

گذشتہ سال نومبر کے اوائل میں جب یونائیٹڈ بلوچ آرمی (یو بی اے) نے یہ خبر دی کہ ان پر بلوچ لبریشن آرمی (بی ایل اے) کے ارکان کی طرف سے حملہ کیا گیا ہے، ان کے ایک کمانڈر کو ہلاک اور ان کے چار جنگجوؤں کو گرفتار کرلیا گیا ہے، اور یہ قیاس آرائی کی جانے لگی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بلوچستان میں شورش اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ اس افسوسناک واقعے پر چند حلقوں میں برملا خوشی کا اظہار کیا جانے لگا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ پاکستان کے لیے اس سردرد کے خاتمے کی طرف اشارہ کرتا ہے جیسا کہ بہت سے اس پر یقین کرنا اور اسے ہوتا ہوا دیکھنا پسند کریں گے؟ آیئے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے بلوچ مزاحمت کوئی یک سنگی ہستی کبھی نہیں رہی ہے۔ ماضی میں مزاحمتی جتھے ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہوا کرتے تھے اور پیغام رسانوں کے ذریعے رابطے کرنے میں اگر مہینے نہ سہی تو ہفتے ضرور لگتے اور پاکستانی ریاست کی طرف سے حقوق سے انکار اور جبر کے خلاف مزاحمت کرنے کے واحد مقصد کے لیے وہاں ہمیشہ ایک بہت ہی ڈھیلا ڈھالا انتظام اور اتحاد ہوا کرتا تھا۔ ابلاغ کے جدید ذرائع کی کمی نے اتحاد کو محدود رکھا اور اسی وجہ سے اختلافات کو بھی۔

مزاحمت کا تازہ ترین دور ماضی کی طرح مریوں کے علاقے میں سال 2002ء کے اردگرد شروع ہوا جہاں مزاحمت کی جڑوں کو محفوظ رکھا گیا تھا۔ نواب اکبر خان بگٹی کی ریاست کے ساتھ محاذ آرائی اور اس کے نتیجے میں اگست 2006ء میں شہادت کے بعد مزاحمتی گروہوں نے بلوچ شناخت کے تحفظ اور جارحیت کے خلاف مزاحمت کرنے کی سعی کی۔ بی ایل اے پہلے سے موجود تھی، ڈاکٹر اللہ نذر کی بلوچستان لبریشن فرنٹ (بی ایل ایف) بھی سرگرم تھی اور بلوچ ری پبلکن

آرمی (بی آر اے) کا قیام بھی عمل لایا گیا۔ ان تینوں کے درمیان تعاون تھا اور اس نے اسٹابلشمنٹ کو بے انتہا فکرمند کر دیا تھا مگر بدقسمتی سے نومبر 2008ء میں بالاچ مری کی شہادت کے ساتھ اشتراک عمل نہایت کم ہو گیا۔

مزاحمتی گروہوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تعاون نے اسٹابلشمنٹ کو الجھن میں ڈال دیا تھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ تعاون ان کی پہلے سے ہی کمزور گرفت کو مزید خطرے میں ڈال دے گا۔ یہ 2007-2008ء تھا جب پاکستان نے بلوچ مزاحمت پر ایک چار رخی حملے کی ابتدا کی۔ سب سے پہلا حقیقی یا مشتبہ بلوچ کارکنوں کو جسمانی طور پر ختم کرنے کا تھا؛ یہاں تک کہ ذرہ برابر شک بھی موت کا پروانہ ہوتی اور اس کے ساتھ ہی بلوچ کے خلاف ایک منظّم اور ادارہ جاتی 'غلیظ جنگ' شروع ہوگئی۔ دوسرا ان موجودہ گروہوں کے درمیان دراڑیں پیدا کرنا تھا جو کہ ان کے بھیجے گئے بندوں کے نفوذ کے سبب آسان تھی کیونکہ ان گروہوں کی قیادت نسبتاً نئے رہنما کر رہے تھے اور نئے رنگروٹوں کے ماضی کے بارے میں جانچ پڑتال ناکافی ہوتی۔ جو کوئی بھی اس جبر کی زوردار انداز میں مذمت کرتا وہ شمولیت کا اہل ہوتا۔ تیسرا شفیق مینگل جیسے لوگوں کے ذریعے قوم پرستوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قاتل دستوں کو منظّم اور ان کی فنڈنگ کرنا۔ اور آخری مگر اہم ترین یہ کہ روایتی طور پر سیکولر بلوچ معاشرے کی سماجی اقدار میں تبدیلی لانے کے لیے ریاستی سرپرستی میں مدارس کا قیام۔

وحشیانہ طاقت اور مالی اسراف کے استعمال نے اثر دکھانا شروع کر دیا اور سوشل میڈیا کی آسان رسائی سے اسے تقویت ملی جہاں ہر ایک سزا و جزا سے مبرا کسی بھی جعلی شناخت کے ساتھ کچھ بھی کہنا چاہے کہہ سکتا ہے۔ اپنے نئے پن، آسان رسائی اور ظاہراً قابل اعتبار ہونے کی وجہ سے سوشل میڈیا کو غلط معلومات پھیلانے سے الجھن اور فسون ربائی پیدا کرنے کے لیے مؤثر طریقے سے استعمال کیا گیا۔ سائبر لہروں پر بلوچ مزاحمت کے خلاف الزامات، بہتان طرازی اور دروغ گوئی چونکا دینے والی ہے اور اس نے کسی اور چیز کی نسبت سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، اس سے کیڈر کے حوصلے پست ہوئے ہیں جنہیں ان شکوک و شبہات کو مٹانے میں مدد دینے

کے لیے معلومات تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ کوئی بھی سوشل میڈیا کو کنٹرول نہیں کر سکتا؛ بہتان طرازی اور الزامات نے ماحول کو بگاڑنا جاری رکھا ہوا ہے، جیسا کہ کوئی بھی کسی کی بھی شناخت ظاہر کر کے اسے جاری رکھ سکتا ہے۔ پاکستانی اسٹابلشمنٹ اس میں کافی حد تک ملوث ہے جیسا کہ وہ اس کے ثمرات دیکھ چکے ہیں۔ یہ عمل پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) کی جانب سے بلوچ ویب سائٹوں پر ایک مکمل پابندی سے بھی جڑا ہوا ہے۔ سوشل میڈیا پر ڈالے جانے والے مواد کی قبولیت اور اسے سچائی سمجھ لینا مزاحمت کو کمزور کرتا جا رہا ہے اور بدقسمتی سے یہ سلسلہ تب تک جاری رہے گا جب تک کہ اس بگاڑ کا پردہ فاش کرنے کے لیے سنجیدہ ادب نہیں آ جاتا مگر یہ محض اس وقت ممکن ہے جب کیڈر اپنا تمام وقت سوشل میڈیا پر گزارنے کے بجائے دوبارہ کتابیں پڑھنے میں صرف کرنے لگیں۔

یقیناً، ایک طرف بی ایل ایف، یو بی اے اور بی آر اے اور دوسری جانب بی ایل اے کے درمیان گہرے اختلافات ہیں۔ اور پھر وہاں تعاون کے حوالے سے دیگر مسائل بھی تھے جن کے حل کے لیے لچک درکار تھی مگر اکڑپن غالب رہا اور آخر کار سائبر جنگجوؤں اور الفاظ تو پچیوں نے ماحول کو اس حد تک پراگندہ کر دیا کہ بی ایل ایف جوابی کارروائی کرتے ہوئے ایک بیان کے ساتھ آگے آئی اور بی ایل اے کو مزاحمت کے لیے ایک رکاوٹ اور بالعکس قرار دیا۔ نواب خیر بخش خان مری کی رحلت کے بعد سے الفاظ کے یہ تبادلے مزید تند ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ مصالحت کی کوششیں بے ثمر رہی ہیں۔ ان اختلافات نے طلبا تنظیموں میں بھی سرایت کر لیا ہے جو کہ مزاحمت کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ جب مصالحت کی کوششوں کا جواب نہیں دیا جا رہا ہے تو محض ایک ہی راستہ باقی رہتا ہے کہ مخالف فریقین خود ہی پیچھے ہٹ جائیں، جس کا نتیجہ مصالحت کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

رہنماؤں کے درمیان اختلافات اور نااتفاقی نے عوام اور کارکنوں کو منتشر کر دیا ہے جو کہ افسردگی اور مایوسی کی حالت میں دست بردار ہو رہے ہیں۔ عدم اتحاد کے سبب سرگرم کارکن ناامید ہو کر کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں جبکہ بعض نئے دھڑے تشکیل دے رہے ہیں کہ گویا پہلے والے

کافی نہ تھے۔ وہ جو بلوچ مزاحمت کے ساتھ ہمدردیاں رکھتے ہیں اکثر اوقات ایک دوسرے کے خلاف غیض وغضب کے اظہار کے سبب فکر مند ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ یہ اختلافات بین الاقوامی ہم دردی کو بھی کم کرنے کا باعث ہیں۔ کوئی بھی بحث وتکرار کرنے والی جھگڑالو تنظیموں کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتا؛ جو لوگ اپنے گھر کو نہیں سنبھال سکتے وہ یہ امید نہیں کر سکتے کہ دوسرے ان کی حمایت کریں گے۔ حامیوں کی قوتِ برداشت نہایت کم ہوتی ہے۔ وہ احمقوں کا شکار بننا پسند نہیں کرتے۔ یہ چپقلش بلوچستان کے ساتھ ساتھ باہر بھی اپنے نقصانات وصول کر رہی ہے۔ اس چپقلش اور شکستگی کے نتائج سنگین ہیں۔ اس کے علاوہ، پاکستان نے ظلم وستم بھی بڑھا دیا ہے۔

اپنے ایک مضمون میں میں نے لکھا تھا کہ ''اگر یہ رہنما بلوچ تاریخ میں 'لڑے تھے' جیسے ایک حاشیے سے کچھ زیادہ بننا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے طریقے بدلنے پڑیں گے اور جلد بدلنے پڑیں گے۔ صرف وہ لوگ جو بلوچستان سے زیادہ اپنے آپ سے اور اپنے ذاتی مفاد سے محبت کرتے ہیں، ان کے لیے متحد ہونا مشکل ہوگا۔ ذاتی انا اور اختلافات کو ایک طرف رکھنے کی ضرورت ہے۔ تمام تنظیموں پر بلوچ عوام کی جانب سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان کی اور مادرِ وطن کی بے لوث خدمت کریں۔ اور اگر وہ عوام کی خدمت اور ان کی رہنمائی کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔''

سب نے کہا، کہ آیا ان اختلافات اور مسائل کا مطلب اختتام ہی ہوگا؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے کیونکہ، جیسا کہ میں نے کہا کہ، تحریک یک سنگی و جامد نہیں ہے اور اس کے علاوہ یہ جدوجہد کسی بھی تنظیم یا فرد سے بہت بڑی ہے اور اسے بلوچ عوام کے دل ودماغ میں ایک جگہ مل چکی ہے کیونکہ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی نجات جدوجہد کی کامیابی میں پنہاں ہے۔ جو تنظیم یا فرد عوام کی خواہشات کے برخلاف ہوگا جلد یا بہ دیر مسترد کر دیا جائے گا اور موجودہ بحران کہ جس پر کچھ لوگ خوشی کا اظہار کر رہے ہیں، انہیں ایک بہت بڑی مایوسی کا سامنا ہوگا۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 4 جنوری 2015

http://www.dailytimes.com.pk/Columnist/mir-mohammad-ali-talpur

'گوادر کی سڑک بلوچستان سے گزرتی ہے'

انٹرویو: رضا وزیر

رضا وزیر: آپ کیوں پاک چین اقتصادی راہداری کی مخالفت کرتے ہیں؟ یہ ایک بہت بڑا پروجیکٹ ہے جس سے یقینی طور پر پاکستان کو فائدہ ہوگا؟

میر محمد علی ٹالپر: ضروری نہیں ہے کہ جو پاکستان کے مفاد میں ہے، وہ بلوچستان کے مفاد میں بھی ہو۔ اگر آپ بلوچستان سے گزرنا چاہتے ہیں، اس کے ساحل کو استعمال کرنا اور اس کے معدنیات نکالنا چاہتے ہیں تو اس میں بلوچ عوام اہم ترین حصہ دار ہیں۔ ان کے مفاد کو اولیت حاصل ہونی چاہیے۔

وہاں بلوچ قوم میں پہلے ہی سے ناراضگی موجود ہے، خاص طور پر چین کے ساتھ معاملات طے کرنے میں۔ انہوں نے سینڈک میں جس طرح بلوچ عوام کو ایک طرف رکھا، یہ اس بات کی طرف ایک اشارہ ہے کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ فضل حیدر (ایک معروف صحافی) کے مطابق وہاں کوئی تانبا، سونا یا چاندی نہیں بچے گا، جب چینی وہاں سے نکلیں گے۔ انہوں نے اپنے لیز میں 2017ء تک کی توسیع کرائی ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں بلوچستان کے مفاد کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ مقامی لوگوں کی خواہشات کو برتری حاصل ہونی چاہیے۔ چین بلوچ عوام کی مدد کرنے کے لیے بلوچستان میں نہیں آ رہا، بلکہ اس لیے کہ اس کے اپنے مفادات ہیں۔

رضا وزیر: اگر گوادر پورٹ کو ترقی دے دی جائے اور اس راہداری کے ساتھ ساتھ اقتصادی زونز فعال ہو جائیں تو کیا وہاں بلوچ عوام کے لیے روزگار کے بہت سارے نئے مواقع

پیدا نہیں ہوں گے؟

میر محمد علی ٹالپر: مجھے یقین ہے آپ نے وہ کہانی سنی ہوگی کہ ایک غریب شخص کو ایک جادوئی چراغ ملتا ہے؛ اس کے بعد وہ جن کو کہتا ہے کہ اس کے لیے ایک بڑا سا محل بنائے اور اس میں کچھ امیر لوگوں کو ڈال دے، اور پھر اسے اس محل کا چوکیدار بننے کا کہا جائے۔

بلوچ کسی اور کے محل کا چوکیدار نہیں بننا چاہتے۔ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ (بلوچستان کے وزیر اعلیٰ) ہمیں چند معمولی ملازمتیں دلوا سکتے ہیں۔ مگر وہاں ایک کہاوت ہے کہ غربت میں آزادی، خوشحال غلامی سے بہتر ہے۔

یہ کوئی روزگار کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلوچ کا کہنا ہے کہ یہ زمین ہماری ہے۔ یہ تب ہمارا تھی جب یہ ویران تھی۔ اب انہوں نے یہاں سونا، چاندی اور تانبا دریافت کیا ہے، یہ ہمارا ہے۔

رضا وزیر: اور منصوبے کے راستے پر حالیہ بحث کے بارے میں بلوچ عوام کیا کہتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: یہ مسئلہ راستے کا نہیں ہے۔ ہمیں اس پورے منصوبے کے بارے میں خدشات ہیں۔ ہمیں گوادر کے مستقبل کے بارے میں خدشات ہیں، جہاں سے یہ راستہ نکل کر آئے گا۔ اس بات سے قطع نظر کہ آیا یہ سڑک لاڑکانہ اور رتو ڈیرو کے ذریعے گزرے گی یا ژوب یا ڈیرہ اسماعیل خان سے، اس پر ہمارے خدشات ہیں۔ گوادر جانے کے لیے یہ سڑک بلوچستان سے گزرے گی، تو لہٰذا بلوچستان کے مفادات داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔

رضا وزیر: بلوچستان کی منتخب حکومت نے منصوبے پر اتفاق کیا ہے۔ کیا اس کا مطلب بلوچ عوام کی رضامندی نہیں ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: میرے خیال میں یہ کہنا مبالغہ آرائی ہے کہ موجودہ حکومت صوبہ بلوچستان کے عوام کی مرضی و منشا کی نمائندہ ہے۔ اگر آپ پاکستان کے الیکشن کمیشن کی ویب سائٹ پر جائیں، تو آپ دیکھیں گے کہ ڈاکٹر عبدالمالک نے 4000 سے تھوڑا زیادہ ووٹ حاصل کیے۔ ان کے حلقے میں ووٹ ڈالنے کی شرح محض 17 فیصد رہی۔ ڈپٹی اسپیکر قدوس

بزنجو کو 544 ووٹ ملے۔ نادرا اور الیکشن کمیشن یہ بات مانتے ہیں کہ 2013ء کے انتخابات میں بلوچستان میں ڈالے گئے 65 فیصد ووٹ جعلی تھے۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ انہیں کس نے ووٹ دیا اور وہ کس کی نمائندگی کرتے ہیں؟ وہ محض ایک سویلین چہرہ ہیں جو ایف سی کے زیر انتظام چلنے والی انتظامیہ کو قانونی جواز فراہم کرتے ہیں۔

رضا وزیر: کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس مسئلے کو سیاسی طور پر حل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: ایک سیاسی جدوجہد اس وقت کارگر ثابت ہوتی ہے جب آپ کا سامنا سیاست دانوں کے ساتھ ہو۔ بلوچستان میں تنازعے کو حل کرنے کے لیے انہوں کب سیاسی ذرائع استعمال کیے ہیں؟ ہم 27 مارچ 1948ء کے بعد سے فوجی طاقت کا سامنا کرتے آئے ہیں۔

انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن اور بنگالیوں کیساتھ کس قسم کا سیاسی تصفیہ بروئے کار لایا؟ بلوچ کے پاس اور کون سا راستہ باقی رہ گیا ہے؟

رضا وزیر: پنجاب میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ جب بھی بات پاکستان کی خوشحالی کی آتی ہے تو چھوٹے صوبے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

میر محمد علی ٹالپر: میرا خیال ہے کہ جو لوگ ایسی باتیں کہتے اور لکھتے ہیں وہ زمینی حقائق سے آگاہ نہیں ہیں۔ وہ بلوچ عوام کے جذبات کو نہیں سمجھتے۔ اگر پاکستان کی خوشحالی ضروری ہے، تو وہاں رہنے والے لوگوں کے جذبات بھی۔ ہم خوشحالی کے خلاف نہیں ہیں۔ ہم استحصال کے خلاف ہیں۔ ہمیں اپنے حقوق چاہئیں۔ ترقی خود آئے گی۔

بشکریہ: دی فرائیڈے ٹائمز

تاریخ اشاعت: 13 مارچ 2015

http://www.thefridaytimes.com/tft/the-road-to-gwadar-passes-through-balochistan

میر محمد علی ٹالپر کی کہانی

(حصہ اول)

انٹرویو: شیر علی خان

سن 1971ء کے موسم خزاں میں میر محمد علی ٹالپر نے اپنی زندگی بطور ایک طالب علم کے ترک کرنے اور بلوچ حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی فہم و فراست نے انہیں متحرک کیا کہ ناانصافی اور غفلت نے بلوچ عوام کو الگ تھلگ کر کے رکھ دیا ہے اور انہوں نے محسوس کیا یہ ان کے ساتھ کھڑے ہونے کا وقت ہے۔ انہیں بہت کم پتہ تھا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ آخری بار ہو جب وہ اپنے گھر واپس لوٹیں اور اپنے خاندان سے ملیں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بلوچ کے ساتھ بلوچستان میں اور افغانستان میں جلاوطنی میں رہنے پر منتج ہوا۔

بلوچ جدوجہد کا سوال آج بھی اتنا ہی موزوں ہے جتنا کہ چار دہائیاں قبل تھا چونکہ ریاستی جبر اور ظلم وستم کا سلسلہ بلاوقفہ جاری ہے۔ اس بنا پر ٹالپر بلوچستان پر ریاستی بیانیے سے پیدا کردہ تصورات کے خلاف بات کرنا جاری رکھے ہوئے ہیں، اور وہ اس خطے میں جدوجہد کی بنیاد کے بارے میں بہتر تفہیم کو فروغ دینے کے لیے کام کرتے ہیں۔ 2013ء میں مجھے ایک ذاتی دستاویزی منصوبے کے حصہ کے طور پر، سرگرم عمل کارکنوں کی جدوجہد، جن کی کہانیاں شاذ و نادر ہی، اگر کبھی بتائی بھی جاتی ہوں تو، کے سلسلے میں میر محمد علی ٹالپر سے انٹرویو کرنے کا موقع ملا۔

شیر علی خان: آپ ہمیں اس پس منظر پر کچھ بتا سکتے ہیں کہ کس طرح سے آپ نے خود کو بلوچ جدوجہد میں ملوث پایا؟

میر محمد علی ٹالپر: میرے خاندان، حیدرآباد میں قدیم ٹالپر شاہی خاندان، کے بلوچ عوام کے ساتھ پرانے تعلقات ہیں۔ یہ ایک تاریخی تعلق ہے جو کہ بہت پیچھے جاتا ہے۔ 15 جولائی 1960ء میں بلوچ رہنما نواب نوروز خان کے دو بیٹوں اور پانچ رشتہ داروں اور دوستوں کو حیدرآباد اور سکھر میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ خود نواب نوروز خان اور ان کے چھوٹے بیٹے جلال خان کو ان کی عمروں کی وجہ سے عمر قید کی سزا دی گئی۔ ان کے رشتہ داروں میں سے تین کو حیدرآباد میں اور ان کے سب سے بڑے صاحبزادے بٹے خان سمیت چار افراد کو سکھر میں پھانسی دے دی گئی۔

یہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے تحت مارشل لا کا دور تھا۔ یہ ایک ایسا وقت تھا کہ کوئی بھی ان کی لاشیں وصول کر کے انہیں بلوچستان بھیجنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ میرے مرحوم چچا میر رسول بخش ٹالپر نے ان بلوچ کارکنوں کی لاشیں وصول کیں ان کی نماز جنازہ کا اہتمام کیا اور اس بات کو یقینی بنایا کہ لاشیں ان کے گھر پہنچ جائیں۔

میرے چچا بلوچ عوام کے حامی تھے اور وہ اکثر کوئٹہ کا دورہ کرتے اور بلوچ حقوق کے حق میں تقاریر کرتے۔ لہٰذا میرے خاندان کا بلوچ عوام کے ساتھ ہمیشہ سے ایک پرانا تعلق رہا ہے۔ میرے چچا باقاعدگی سے نواب نوزور سے ملنے جاتے اور ہر عید پر ان کے لیے ایک خاص طور پر پکایا ہوا کھانا لے جاتے۔ چونکہ 1962ء میں عید کے موقع پر میں حیدرآباد میں تھا، مجھے نواب نوروز سے ملنے کا موقع ملا، اور اس وقت عطا اللہ خان مینگل اور غوث بخش بزنجو بھی جیل میں تھے۔ تو مجھے ان سے بھی ملاقات کا موقع ملا، اور میری جوانی میں اس کا مجھ پر بہت اثر پڑا۔ وہ ایک جدوجہد میں ملوث تھے، اور وہ ایک بہت بڑی فوج اور حکومت سے نافرمانی کر رہے تھے۔ یہ ہمیشہ سب کے لیے متاثر کن رہا۔ یہی ہمارے لیے بھی سچ تھا۔ مجھ میں اس جدوجہد کے لیے دلچسپی پیدا ہوئی، لیکن اس وقت اس سے واقعتاً کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

شیر علی خان: کیا آپ اس وقت کی انقلابی سیاست کے خیالات اور سیاق وسباق مقرر کرسکتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: قائم شدہ طاقت کے مراکز کے خلاف بغاوت کو معزز سمجھا جاتا تھا اور عقیدہء مساواتِ انسانی کے معاشرے کے خواب نے سیاسی شعور رکھنے والے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔ میرے خاندان کی برطانوی راج کے خلاف بغاوت کی ایک شاندار تاریخ تھی جس کے نتیجے میں 17 فروری 1843ء میں میانی کی جنگ ہوئی۔ میرے والد خاکسار تحریک کے نائب اور قائم مقام سربراہ تھے جب 1942ء میں علامہ مشرقی قید کیے گئے۔ میرے والد اور میرے چچا نے ایوب خان کی بھی مخالفت کی۔ 1964ء میں فاطمہ جناح صدارتی انتخابات کی مہم کے دوران ہمارے ہاں ٹھہری تھیں۔ مزید برآں، میرے خیال میں وہاں بہت سارے لوگ ہیں کہ جنہوں نے ساٹھ کی دہائی نہیں گزاری ہے۔ وہ اس بات کا ادراک نہیں کریں گے کہ اس دور میں انقلاب کی لہریں دنیا بھر میں پھیلی تھیں: کیوبا اور چے گویرا کی کامیابیاں، ویتنام کا امریکہ کے خلاف سرکشی اور پھر ماؤزے تنگ جو کہ اس دور کی متاثر کن شخصیت تھے۔ ان تمام چیزوں نے سیکولر اور بائیں بازو کے نوجوانوں کو متاثر کیا۔

اسی طرح سے بائیں بازو نے پاکستان میں ایک بہت بڑا مقبول اثر چھوڑا، سب انقلاب کے بارے میں بات کرتے تھے۔ تو بطور ایک طالب علم جب میں کراچی یونیورسٹی سے صحافت میں ماسٹرز کر رہا تھا تو میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ چپقلش میں ملوث رہا۔ میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (این ایس ایف) میں نہیں تھا لیکن میں یقیناً ان کا ایک حامی تھا اور این ایس ایف کے تمام ارکان اور دیگر تمام بائیں بازو کے طالب علم کارکنوں کے ساتھ اپنے تعلق کو برقرار رکھا۔

وہ ایک مختلف دور تھا، بائیں بازو کا مشاہدہ کیا اور ان کے ساتھ ملوث رہا، اور میں ایوب خان کے خلاف تحریک میں بھی شامل تھا۔ 1967ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے حیدرآباد کا دورہ کیا، انہوں نے حکومت چھوڑ دی تھی اور انہیں اورینٹ ہوٹل میں ٹھہرنا تھا لیکن انہیں وہاں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ تو وہ ہمارے خاندان کے ہاں ٹھہرے، اور اس کے نتیجے میں ایوب خان نے میرے چچا رسول بخش کو 9 ماہ کے لیے جیل میں ڈال دیا۔

میرے چچا مقامی طور پر حیدرآباد میں ٹریڈ یونین سیاست کے ساتھ ملوث رہے اور اس کے

ساتھ ساتھ مزدور اور دیگر شعبوں سے متعلق دیگر انجمنوں کے ساتھ بھی رہے۔ انہوں نے سہروردی کے ساتھ تحریک میں بھی حصہ لیا۔ بھٹو کے آنے کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کا آغاز بھی میر رسول بخش کے باغیچے میں ہوا جو کہ بائیں بازو کی تحریک کے ساتھ بھی شامل تھے۔

شیر علی خان: بھٹو کو عوامی رہنما کے طور پر دیکھا گیا ہے جو کہ پہلی بار عوامی امنگوں کے ساتھ منسلک ہونے کے قابل رہے۔ کارکنوں میں سے چند کا خیال یہ بھی ہے کہ وہ اپنی فطرت میں ایک متکبر اور آمرانہ شخص تھے۔ آپ نے اس تحریک کو کس طرح سے دیکھا اور اس دور میں بھٹو کس چیز کی نمائندگی کر رہے تھے؟

میر محمد علی ٹالپر: ذاتی طور پر میں ان سے متاثر نہیں ہوا چونکہ بلوچستان میں مسائل جاری تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب یحییٰ خان نہیں آئے تھے اور ون یونٹ کو تحلیل کر دیا گیا تھا اور وہاں معاملات ٹھنڈا ہونا شروع ہوئے تھے۔ مشرقی پاکستان کا مسئلہ سامنے آنے سے قبل ہی میں بھٹو کی سیاست کے فریب سے نکل چکا تھا۔

ہماری سیاست کا جھکاؤ بائیں بازو کا تھا اور وہ ہمارے معیار پر پورا نہیں اترتے تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرا مفروضہ بجا تھا اور بعد میں ثابت بھی ہوا کہ میں غلط نہیں تھا۔ میرے والد مرحوم میر علی احمد ٹالپر، جو 1971ء میں ایم این اے تھے، نے ذوالفقار علی بھٹو کو یہ بتانے کی بہت کوشش کی کہ بنگال کے لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ کر لینا چاہیے اور یہ کہ انہیں حکومت کی تشکیل کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ بھٹو اس بات پر قائل نہیں تھے اور اسے قبول نہیں کیا۔

شیر علی خان: فعالیت کے لحاظ سے آپ بلوچ جدوجہد کے ساتھ کس طرح سے ملوث ہوئے؟

میر محمد علی ٹالپر: میرے دوستوں میں سے چند، جیسا کہ محمد بھابھا اور میر پور خاص کے علی بخش ٹالپر، میر منور کے والد، کا بھی بلوچ عوام کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ بھابھا نے ان کے ذریعے شیر محمد خان مری سے ملاقات کی جو کئی سالوں سے جنرل شیروف کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ اصل میں بلوچوں کے درمیان وہ عام طور پر بابو کے نام سے جانے جاتے ہیں

جو کہ ایک بزرگ چچا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

بھابھا نے شیر محمد خان سے اس ارادے کے ساتھ ملاقات کی کہ بلوچستان میں کچھ کام کیا جانا چاہیے۔ ہم تینوں تھے اور ہمارا ایک تعلق تھا۔ ان کے نجم سیٹھی، احمد رشید، اسد رحمٰن، راشد رحمٰن اور دلیپ داس کے ساتھ بھی تعلقات تھے جو کہ سب اس وقت لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ بات غلط طور پر سمجھی جاتی ہے کہ میں لندن گروپ کا حصہ تھا، گو کہ میں کبھی بھی اس کا حصہ نہیں رہا اور میں آج تک کبھی لندن نہیں گیا۔

بلوچستان جانے سے قبل میں انہیں نہیں جانتا تھا؛ میرا تعلق صرف محمد بھابھا کے ذریعے تھا۔ بنگلہ دیش کے لیے تحریک شروع ہونے سے کافی پہلے، میں نے اپنی تعلیم چھوڑنے کے لیے اپنا ذہن بنا لیا تھا۔ یہ اس لیے کہ یحییٰ خان نے میرے والد کو چھ سے سات ماہ کے لیے جیل بھیج دیا تھا۔ میرے والد ایک بہت اچھے مقرر تھے اور انہوں نے حکومت کے خلاف بہت سی تقاریر کی تھیں۔

ایوب خان نے میرے چچا کو جیل بھیجا اور پھر میرے والد کو، تو جب ایسے واقعات رونما ہوں تو یہ آپ کو اور آپ کے رویے کو متاثر کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ آپ کو سخت بنا دیتے ہیں اور آپ کا نقطہ نظر جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے۔

ایک نقطہ یہ بھی تھا کہ بلوچستان بہت قریب اور دسترس میں تھا۔ آپ کہیں بھی نظر دوڑائیں، خواہ یہ فلسطینی جدوجہد ہو یا ویتنام کی، میرا خیال ہے کہ یہ موقع کے حصول کا ایک معاملہ تھا۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے ان جگہوں میں سے کسی ایک میں بھی جانے کا موقع ملتا تو میں چلا جاتا۔

تو اس جستجو میں، میں نے 1971ء میں اپنی تعلیم چھوڑ دی اور میں اپنے داماد غلام قادر کے پاس رہنے کے لیے چلا گیا جو کہ ایک سرکاری ڈاکٹر تھے۔ میں مارچ میں بنگلہ دیش کا کریک ڈاؤن شروع ہونے سے محض چند دن قبل وہاں چلا گیا۔ میں ان کے ساتھ چھ ماہ کے لیے رہا جہاں مجھے دوائیوں اور علاج معالجے کے بارے میں سیکھنا تھا۔ یہ وہ کچھ تھا جو میں نے عملی طور پر سیکھا اور اس

کے ساتھ ساتھ انہوں نے مجھے علمی پہلوؤں کے بارے میں بھی بہت کچھ سکھایا۔

اکتوبر 1971ء میں مجھے محمد بھابھا کی طرف سے ایک پیغام موصول ہوا کہ بلوچستان میں میری ضرورت ہے۔ تو میں چلا گیا۔

شیر علی خان: منظّم ہونے کا فیصلہ آپ نے کیسے کیا؟ آپ اپنے دوست کے لیے جا رہے تھے یا کسی قسم کی مقامی تنظیم تھی کہ جس نے آپ کو آنے کا کہا تھا؟

میر محمد علی ٹالپر: وہ پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ وہاں بلوچ عوام کی طرف مزاحمت چل رہی تھی، اور جنگ کو اس کا ایک حصہ ہونا تھا۔ پس میں گیا اور کچھ دوست پہلے ہی سے وہاں موجود تھے، اور میں نے آخر میں مری علاقے میں قیام کیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میرے دوست احمد رشید، اسد رحمٰن اور محمد بھابھا پہلے ہی سے وہیں تھے۔ میرے فرائض ایک ڈاکٹر کے تھے۔

شیر علی خان: آپ جس وقت وہاں پہنچے، اس دوران بلوچستان میں کیا ہو رہا تھا؟

میر محمد علی ٹالپر: جب تک کہ ون یونٹ تحلیل نہیں ہوا تھا، مری اور مینگل علاقوں میں فوجی کارروائیاں جاری تھیں اور لوگ لڑ رہے تھے۔ حالات انتہائی سنگین ہو چکے تھے اور حکومت کے خلاف بڑے پیمانے پر عدم اطمینان تھا جب انہوں نے سیاسی مداخلت کرنا شروع کی تھی، نواب خیر بخش خان مری کو حکمرانی کی طاقت سے محروم کر کے خارج کر دیا گیا تھا۔ حکومت نے نواب خیر بخش مری کے چچا دودا خان کو قبائلی سردار کے طور پر مقرر کیا۔ 1965ء میں حکومت کے فیصلے سے ناپسندیدگی کے جذبات پیدا ہونے کے باعث چند ہفتوں بعد دودا خان کو گھات لگا کر حملہ کر کے ہلاک کر دیا گیا۔

تو مری اور مینگل علاقوں میں لوگ حکومت سے انتہائی مایوس تھے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مری علاقوں میں تیل کے ذخائر موجود ہیں۔ ایما کو (امریکن آئل کمپنی) کے ایک سروے کے مطابق تدڑی جاندران بھمبور کے علاقے میں ایک بہت بڑی شاندار ساخت موجود ہے۔ 1978ء میں او جی ڈی سی ایل (آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ) کے ایک سروے میں

کہا گیا تھا کہ بھمبور، پیرکوہ اور ڈھوڈک سے منسلک ایک وسیع علاقہ 'طلائی مثلث' کی تشکیل کرتا ہے، اس علاقے میں گیس اور تیل کی بڑی مقدار کے سبب۔ بلوچ ان ذخائر کے استحصال کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے اور ہم نے، بطور بائیں بازو کے پیروکار یا معاشرے کے باشعور عناصر کے، محسوس کیا کہ ہمیں مدد کرنی چاہیے۔

شیر علی خان: اس زمانے میں بائیں بازو کی جماعتوں نے کئی سطحوں پر مرکزی سیاسی دھارے میں اپنی افادیت کھو دی تھی۔ ساٹھ کی دہائی میں نیشنل عوامی پارٹی (این اے پی)، جو کہ کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کے درمیان ایک اتحاد تھا، کو ٹوٹ پھوٹ کا سامنا تھا۔ جدوجہد اس سے کس طرح نمٹی تھی؟

میر محمد علی ٹالپر: سب سے بڑی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی تھی، جس نے اپنی تشہیر بائیں بازو کے طور پر کی تھی، اور ہمارا این اے پی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ہم ایک طرح سے ایک آزاد یا بائیں بازو کے نظریات سے وابستہ فری لانس گروہ کی مانند تھے۔

شیر علی خان: تو آپ ایک عزم کے ساتھ بلوچ عوام کے ساتھ جدوجہد کرنے کے لیے بلوچستان پہنچے۔ جب آپ ابتدائی طور پر وہاں پہنچے تو آپ کا مقرر کردہ کام کیا تھا اور آپ نے کیا کیا؟

میر محمد علی ٹالپر: بنیادی طور پر میرا زیادہ زور بنیادی تعلیم پر تھا اور لوگوں میں بیداری پیدا کرنا، اور طبی علاج فراہم کرنے کا تھا۔ میں لوگوں کے پاس جاتا اور ان کا علاج کرتا اور کچھ دوست پڑھانے اور اسکول کی تعلیم کے ساتھ مدد کرتے۔ ہم وہاں رہنے کے لیے اس ماحول سے مانوس ہو رہے تھے۔ میرے لیے یہ اتنا مشکل نہیں تھا مگر دیگر دوستوں کے لیے یہ ثقافتی طور پر بہت مشکل تھا کیونکہ یہ عمل ایک صدی سے کسی دوسری صدی کی جانب پیچھے جانے کا تھا۔

ہم پہاڑی زندگی کے عادی ہو رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ثقافتی طور پر بھی وہاں کے مطابق ڈھل رہے تھے۔ ہمارے دوست اسد رحمٰن، دکھ کی بات ہے کہ وہ گذشتہ سال انتقال کر گئے، مجھ سے آخر تک صرف بلوچی میں بات کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ میرے لیے یہ

بہت آسان تھا چونکہ ٹالپر بلوچ ہیں، شہروں میں رہنے کے باوجود ہم میں بہت سی ایسی روایات ہیں جو کہ مری کے علاقے میں مروجہ ہیں۔

شیر علی خان: نواب شیر باز خان مزاری کی کتاب 'حقیقت بینی کا ایک سفر' میں وہ سرداری نظام سے نالاں ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نے بلوچ مزاحمت میں رکاوٹ ڈالی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ صورتحال یہی ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: ایک بات واضح کرتا چلوں کہ نواب خیر بخش خان مری نے غیر مبہم طور پر ریاست کی مخالفت کی ہے۔ وہ کبھی بھی اندر اور باہر نہیں رہے ہیں۔ باقی سب پس و پیش ہوتے رہے ہیں لیکن خیر بخش خان مری کبھی نہیں۔

میں آپ کو ایک واقعے کی مثال دیتا ہوں جو 1953ء میں پیش آیا۔ مری علاقے میں ڈیوس نامی ایک پولیٹیکل ایجنٹ تھا۔ انہوں نے خیر بخش کو بتایا کہ حکومت سڑکیں بنانا چاہتی ہے اور ترقی اور خوشحالی کے خواب دیکھ رہی ہے، جیسا کہ عموماً گفتگو کی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت ان کا مقصد بہتری اور ترقی کی آڑ میں استحصال ہوتا ہے۔

پولیٹیکل ایجنٹ نے پوچھا: ''خیر بخش، آپ کیوں اپنے بدبخت لوگوں کی ترقی کے لیے مدد نہیں کرتے؟''

بہ زبان راوی خیر بخش نے جواب دیا کہ ''ڈیوس، اگر ہٹلر نے دوسری عالمی جنگ کے دوران برطانیہ فتح کیا ہوتا، اور کوئی آپ کے پاس آتا اور کہتا کہ آپ کیوں ہٹلر کو اپنے بدبخت لوگوں کو ترقی دینے کی اجازت نہیں دیتے، تو آپ کیا جواب دیتے؟''

تو ڈیوس نے جواب میں کہا کہ، ''خیر بخش، مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں نے پھر کبھی آپ سے اس بارے میں بات کی۔''

تو لہٰذا خیر بخش نے واضح طور پر بلوچ اور ان کے وسائل کا استحصال کرنے کے حوالے سے ریاست کی مخالفت کی ہے۔ باقیوں نے... خیر، اکبر خان بگٹی نے 1973ء میں بھٹو حکومت میں شمولیت اختیار کی۔ اور پھر جیل میں این اے پی کے پشتون اور بلوچ قوم پرستوں کے درمیان

اختلافات اور کشیدگی پیدا ہونا شروع ہوئے۔ اور پھر بلوچ رہنماؤں کے آپس میں اختلافات موجود تھے۔ غوث بخش خان بزنجو نے لڑائی کے اس طریقہ کے خلاف جانے کا فیصلہ کیا۔ عطااللہ خان مینگل اس کے بارے میں بہت مبہم تھے۔ اس معنی میں خیر بخش مری ریاست کی طرف سے بلوچ وسائل کے استحصال کے خلاف واضح رہے۔

شیر علی خان: آگے بڑھتے ہیں، بھٹو اب اقتدار میں ہیں۔ زمین پر صورتحال کس طرح تبدیل ہو رہی تھی چوں کہ اس دور میں بہت سے لوگوں نے بھٹو کو ترقی پسندی کی علامت کے طور پر سمجھا؟

میر محمد علی ٹالپر: جیسا کہ میں نے کہا کہ بلوچ عوام ہر حوالے سے ایک مختلف انداز میں رہ رہے تھے، اپنے قومی شعور اور اپنی بلوچ شناخت کے علاوہ۔ وہاں غربت تھی، سرداری تھی، کوئی تعلیم نہیں تھی، لیکن وہ اپنی بلوچ شناخت کے بارے میں آگاہ تھے۔ وہ اس بات کو جانتے ہیں، اور شیر محمد خان مری 1963ء سے 1969ء تک مری علاقے کے پہاڑوں میں رہے۔

یاد رہے کہ انہیں 1963ء میں حیدرآباد میں جیل بھیج دیا گیا تھا اور میرے چچا میر رسول بخش نے ان کی ضمانت دی تھی۔ مجھے صحیح وقت یاد نہیں ہے، لیکن انہوں نے ضمانت کی پرواہ نہیں کی اور وہیں سے جدوجہد کا آغاز کیا۔ اسی کو ہم پہاڑوں پر جانا کہتے ہیں۔ حکام نے میرے چچا کو انہیں واپس لانے کے لیے کہا، لیکن میرے چچا نے ان سے کہا کہ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں اور آپ انہیں جا کر پکڑ سکتے ہیں۔ اس کے بعد حکام خاموش رہے۔

شیر محمد خان مری نے اس مدت کے دوران بلوچ جدوجہد کے شعور کو اجاگر کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اسی انداز میں، 1947ء تا 1948ء شہزادہ عبدالکریم کی شخصیت نے بھی یہی کردار ادا کیا جب بلوچستان کے ساتھ قلات پر قبضہ کر لیا گیا۔ پھر 1958ء میں جب مارشل لا نافذ کیا گیا، اور ان افواہوں کے بعد کہ خان کلات علیحدگی کے بارے میں سوچ رہے ہیں، تو ایک بڑا حملہ کیا گیا۔ اس کی وجہ سے نواب نوروز خان پہاڑوں پر چلے گئے۔

اس کے بعد بلوچ کی مزاحمت اور شناخت کے شعور کو منظّم کرنے میں سب سے اہم کردار شیر

محمد خان مری نے ادا کیا۔ وہ ہمیشہ بیک وقت بائیں بازو کے رکن اور قبائلی تھے۔ آپ انہیں ایک بائیں بازو کا قبائلی کہہ سکتے ہیں۔ اسی دوران مینگل علاقے میں علی محمد مینگل مزاحمت کر رہے تھے۔

شیر علی خان: اپنے قیام کے دوران، جب ابتدائی طور پر آپ اپنے اردگرد ماحول کے سے مانوس ہو رہے تھے اور آپ نے لندن گروپ کے مشہور ارکان سے ملاقات کی۔ اس میدان میں آپ صرف ایک کارکن تھے یا آپ اس کی قیادت کے سلسلے میں بھی ملوث رہے؟

میر محمد علی ٹالپر: یہ ایک طرح سے قیادت اور عمومی کاموں میں حصہ لینے والے کارکن کا دوہرا کردار تھا۔ میں جب پہنچا تو اسد رحمٰن، احمد رشید، اور محمد بھابھا پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ ہمارے دوستوں اور ساتھیوں میں سے ایک اور دلیپ داس، جنہیں جانی داس کے نام سے پکارا جاتا، بھی لندن سے آئے تھے۔ یہ اس طرح نہیں تھا کہ ہم ایک گروہ کے طور پر الگ الگ رہ رہے تھے، بلکہ ہم لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ظاہر ہے ہم خاندانوں کے ساتھ نہیں رہ رہے تھے بلکہ ہمارا ایک علیحدہ کیمپ تھا۔

وہاں میر ہزار خان رامکانی بھی تھے، جو فوجی کمانڈر کے طور پر جانے جاتے تھے لیکن بعد میں بطور سیاسی کمانڈر کے بھی۔ سیاسی اس لیے کہ انہوں نے خیر بخش خان، شیر محمد خان کو گرفتار کر لیا تھا، اور بلوچ کی تقریباً پوری قیادت جیل میں تھی۔ تو لہٰذا وہ 1973ء میں جدوجہد کی قیادت کر رہے تھے۔

شیر علی خان: آپ کیسا محسوس کرتے ہیں کہ بھٹو نے بلوچستان میں غلطی کی اور اس کے باعث زمین پر جدوجہد میں ایک اہم موڑ آیا، یعنی کہ بغاوت میں اضافہ ہوا؟

میر محمد علی ٹالپر: جب انہوں نے عطااللہ مینگل کو حکومت دی تو سب سے پہلے غلام مصطفیٰ کھر نے پولیس اور سول بیوروکریسی میں تمام پنجابی بیوروکریٹس کو واپس بلانے کا حکم دیا۔ یہ بلوچ کا ایک دیرینہ مطالبہ تھا کہ صوبے میں بیوروکریٹس بلوچستان سے ہوں۔ لیکن کھر اور وفاقی حکومت کو معلوم تھا کہ اس وقت صوبے کی صلاحیت محدود تھی جیسا کہ حکومت چلانے کے

لیے ان کے پاس اہل لوگوں کی تعداد کافی نہیں تھی۔

اور پھر وہاں جام غلام قادر، لسبیلہ کے جام، تھے جنہوں نے لسبیلہ میں ٹیلی فون کی لائنیں کاٹنا شروع کر دی تھیں اور یہ کہہ کر بدامنی پھیلائی کہ وہاں ظلم ہو رہا ہے اور ہم اس کے خلاف مزاحمت کریں گے۔ یہ وفاقی حکومت کی رضامندی سے ہو رہا تھا۔ اس عمل نے صوبے کو مؤثر طور پر الگ تھلگ کر کے رکھ دیا۔

ہوسکتا ہے یہ بات زیادہ لوگوں کو معلوم نہ ہو لیکن حتیٰ کہ سندھ میں بھی اگر آپ سکھر، گڈو اور غلام محمد بیراج پر نظر ڈالیں تو تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی زمین کا پچپن فیصد غیر سندھیوں کو چلا گیا ہے۔ اسی طرح سے 1972ء میں پٹ فیڈر کے علاقے نے پنجابی آبادکاروں کو دیکھا جس سے نالش میں اضافہ ہوا۔ وہاں چند معمولی جھڑپیں ہوئی تھیں لیکن میڈیا اور مرکزی حکومت نے انہیں بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا۔

یہ تمام چیزیں مینگل حکومت کو کمزور کرنے کے لیے کی گئی تھیں۔ عطاءاللہ خان نے ایک بار کہا تھا وہ حتیٰ کہ آپ سے یہ بھی پوچھیں گے کہ آپ نے یہ گھڑی کیوں کر پہن رکھی ہے، یعنی وہ ہر چیز کے بارے میں انتہائی متخصص تھے اور ہر چیز پر اپنا حکم چلانا چاہتے تھے۔

ایک اور عنصر ایران تھا۔ انہوں نے بلوچ کو دبایا ہے اور اب بھی دبا رہے ہیں۔ انہوں نے بلوچ پر بنیاد پرستی کا لیبل لگانے کی بھی کوشش کی، اور رضا شاہ نے کئی بار کہا تھا کہ اگر بلوچ کو یہاں حکومت دے دی گئی تو پھر ایران میں بھی بلوچ یہی مطالبہ کریں گے۔

تو لہٰذا روز اول سے وہ بلوچستان حکومت کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ میرے خیال میں مینگل نے مئی 1972ء میں حکومت تشکیل دی، لیکن ستمبر یا اکتوبر میں فرنٹیئر کور اور سی اسکاؤٹس کی طرف سے مری علاقوں کی گھیرابندی شروع کر دی گئی۔

شیر علی خان: پہاڑوں میں مواصلات کو کس طرح یقینی بنایا گیا اور آپ کو باہر سے خبریں کس طرح ملتی تھیں؟

میر محمد علی ٹالپر: ریڈیو دستیاب تھا اور کبھی کبھار ہمیں اخبارات بھی ملتے

تھے۔ یہ آج کے معیار کی نسبت بہت پرانی طرز کی تھی، جہاں آج کی سوشل میڈیا، موبائل فونز، سیٹلائٹ فونز جیسی اور ابلاغ کی دیگر بہت سی مختلف چیزوں ہیں۔ ان اوقات کے دوران یہ بہت قدیم طرز کی تھی؛ خط لکھے جاتے، اور انہیں پہنچنے میں کچھ دیر لگ جاتی۔ مری علاقے میں سڑکیں نہیں تھیں، اور حتیٰ کہ آج بھی بمشکل ہی کوئی سڑک ہو۔

یعنی کہ ایک شخص کو سبی تک پیدل جانا پڑتا اور پھر وہاں سے اسے ایک بس پکڑنا پڑتی۔ جیسا کہ نجم سیٹھی اور راشد رحمٰن کی ذمہ داری چیزوں کی فراہمی، فنڈز اور دیگر چیزوں، مثلاً ادویات وغیرہ، کی دیکھ بھال کرنا تھا، یہ دونوں جدوجہد کے شہری پہلو کو بھی دیکھتے تھے۔

شیر علی خان: بائیں بازو کے نظریات سے متاثر، آپ لوگ کس طرح کی گفتگو میں مشغول رہا کرتے؟

میر محمد علی ٹالپر: کئی چیزیں تھیں۔ میرے خیال میں ان میں سے ایک ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرنے کا تھا اور علاقے سے مانوس ہونے کا تھا تاکہ ہم وہاں رات کو بھی چل سکتے۔ پہاڑوں میں سمت کے تعین کا حصول بہت مشکل ہے، اور جسمانی طور پر تیار رہنا بھی۔ میرے خیال میں اس وقت موٹر سائیکلوں کو پہاڑوں میں رسائی حاصل ہے، لیکن ان اوقات کے دوران، یہ آپ کے دو اچھے پیر اور آپ کی دو اچھی ٹانگیں اور اس کے ساتھ ساتھ جوتوں کی ایک اچھی جوڑی ہوا کرتی تھی۔

اگر گفتگو کے حوالے سے کہوں تو ہم امکانات کے بارے میں بات کرتے، اور مارکسزم کے بارے میں کچھ تدریسی حلقوں کو اکٹھا اور منظّم کیا جاتا۔ میں خود کو اپنی دواؤں کے بارے میں بھی اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کی کوشش کرتا۔ ہمارے دوست بہت ساری کتابیں ساتھ لائے تھے جنہیں ہم پڑھتے اور ان پر بات کرتے۔ وہاں مری علاقے پر لکھی گئی پیرسون نامی ایک مصنف کی کتاب تھی جو کہ بہت مفید تھی۔ اس کتاب کو انہوں نے اور ان کی بیوی نے اس علاقے میں قیام کے بعد مرتب کیا تھا، لہٰذا مری معاشرے کو سمجھنے میں مدد دینے کے لیے ہمارے لیے یہ ایک اہم کتاب تھی۔

اور پھر وہاں اینگلز اور مارکس کی لکھی ہوئی 'تمام انسان بھائی بھائی ہیں' اور ہم وہاں قیام کے دوران اپنے آپ کو ترغیب دینے کے لیے یہی کیا کرتے تھے۔ اور بیک وقت ہمارے پاس زیادہ فارغ وقت بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔

شیر علی خان: وہاں پر کافی ذہنی تناؤ کا شکار ہوئے ہوں گے، چونکہ آپ نے جدوجہد کرنے کی خاطر شہروں کی اپنی پرانی زندگی اور مراعات یافتہ طبقے کی طرزِ زندگی ترک کر دی تھی۔

میر محمد علی ٹالپر: ہم سب نے بہت سی قربانیاں دیں، اور ہم نے اپنے ماضی کی زندگی کی کشتیاں جلا دی تھیں۔ ہم اس معاشرے کا ایک حصہ بننے اور حتیٰ الوسع مدد کرنے کے لیے وہاں گئے تھے۔ آپ کو ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ بلوچ کسی کی پیروی کرنے میں انتہائی محتاط ہیں، ایسا بالکل نہیں ہے کہ وہ ہر کسی کے ساتھ شمولیت کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ آپ کو کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو ثابت کرنا پڑے گا، خواہ یہ آپ کی ذہنی، جسمانی صلاحیت اور مہارت ہو.....صرف اسی صورت میں وہ آپ کے ساتھ شامل ہوں گے یا آپ کی پیروی کریں گے۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ بڑے سخت قسم کے جج ہیں۔ ہمیں جسمانی طور پر چاک و چوبند رہنا پڑتا، اور ہمیں اپنی مہارت میں بھی بہتری لانی پڑتی۔ یہ اکتوبر 1971ء تھا۔ 1972ء میں جب حکومت تبدیل ہوئی تو مسائل پیدا ہونا شروع ہوئے، یہ کشیدگی آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوئی، اور حکام نے علاقوں کی گھیرا بندی شروع کر دی تھی۔

بشکریہ: تنقید ڈاٹ کام، اتوار، 31 مئی 2015
شیر علی خان 'تنقید' خاندان کے ایک رکن اور ایک صحافی ہیں جنہوں نے پاکستان میں کئی معروف مطبوعات کیلئے لکھا ہے۔
http://www.tanqeed.org/2015/05/the-mm-talpur-story-part-i/

میر محمد علی ٹالپر کی کہانی

(حصہ دوم)

انٹرویو: شیر علی خان

یہ سرگرم جہدکار اور بلوچ دانش ور میر محمد علی ٹالپر کے ساتھ دو حصوں پر مشتمل ایک انٹرویو کا دوسرا حصہ ہے۔ پہلا حصہ پیر، یکم جون، دو دن قبل شائع ہوا تھا۔

شیر علی خان: یہ آپ کی زندگی میں وہ وقت تھا جب ایک حادثہ پیش آتا ہے جو آپ کی پوری زندگی کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ کیسے پیش آیا؟

میر محمد علی ٹالپر: جی ہاں، یہ ایک اچانک رونما ہونے والا حادثہ تھا جس میں میں نے اپنے ہاتھ کھو دیے اور محمد بھابھا نے اپنی آنکھوں میں سے ایک مکمل طور پر کھو دی۔ دھماکہ خیز مواد کے ساتھ ایک تجربہ کیا جا رہا تھا، اس کے بارے میں سرسری معلومات کے ساتھ۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ کم علمی ایک خطرناک چیز ہے۔ ہمارے معاملے میں یہ سچ ثابت ہوا۔ ایک تجربہ جو بری طرح سے ناکام ہوا، اگرچہ یہ میری دلچسپی کا شعبہ نہیں تھا، اور اتفاق سے میں اس تجربے کے دوران قریب ترین شخص تھا اور نتیجتاً میں نے اپنے ہاتھ گنوا دیے۔

نومبر یا دسمبر 1972ء میں علاقے کی گھیرا بندی میں شدت آنا شروع ہوئی۔ ملیشیا مختلف علاقوں میں آ رہی تھی، اور مری علاقے کی گھیرا بندی اس حد تک پہنچ گئی کہ علاقے میں بنیادی راشن کا لانا بھی روز بروز تیزی سے محال ہوتا گیا۔ مری علاقہ زیادہ خود کفیل نہیں تھا، لہٰذا گندم، گڑ اور

چائے جیسی سب چیزوں کے خلاف کریک ڈاؤن کیا جا رہا تھا۔ اس عمل نے قافلوں، جو کہ اونٹوں پر آتے، کا آنا مشکل بنا دیا جنہیں ہم سامان لانے کے لیے چپکے سے علاقے میں لے آتے۔

رفیع رضا، جو کہ ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی رازدار ساتھی اور اس وقت کے ایک وزیر تھے، نے کہا کہ حکومت جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب سامان کراچی پہنچا تو انہیں معلوم تھا کہ سامان پہنچ چکا ہے۔۔ انہوں نے ان کو دیکھا اور حتیٰ کہ انہیں لے جانے کی اجازت بھی دی تا کہ ان کو اسلام آباد منتقل کیا جا سکے۔ وہ جانتے تھے کہ سامان آ چکا تھا اور کہاں جا رہا تھا اور وہ کس طرح اسلام آباد میں عراقی فوجی اتاشی کے گھر تک پہنچا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سب جانتے تھے۔

مورخہ 12 فروری کو اتاشی کے گھر پر چھاپہ مارا گیا، اور میڈیا کو اپنے ساتھ لے جایا گیا۔ رفیع رضا نے کہا کہ جب انہیں پتہ چلا کہ میڈیا کو اپنے ساتھ لے جایا گیا ہے تو انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے اپنے ہی کیے گئے کام پر چھاپہ مارا تھا۔ اگلے روز مینگل حکومت برطرف کر دی گئی اور میرے والد پر اسلحہ اسکینڈل میں ملوث ہونے کے الزامات عائد کرنے کے بعد میرے چچا رسول بخش ٹالپر نے بطور گورنر سندھ استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت تک سب کو پتہ چل چکا تھا کہ میں پہاڑوں میں ہوں۔

شیر علی خان: جیسے ہی حکومت نے کریک ڈاؤن شروع کیا تو اس دور کی بہت سی رپورٹوں اور بیانات کے مطابق ریاست فاشسٹ طرز کی اجتماعی حراستی کیمپوں کی نقل کرنے کے قریب تر تھی۔

میر محمد علی ٹالپر: جیسا کہ میں نے کہا کہ حکومت کو فروری میں برطرف کر دیا گیا، اس کے بعد علاقے کی ناکہ بندی تیز کر دی گئی۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ مینگل علاقے میں حالات کتنے خراب تھے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہاں پر بھی یہی کچھ ہوا تھا کیونکہ حکومت عطا اللہ مینگل اور علی محمد مینگل سے خوفزدہ تھی۔ میں ذاتی طور پر اس بارے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کتنا شدید

تھا لیکن میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ ناکہ بندی موجود تھی۔

مذاکرات کے لیے کوششیں ہو رہی تھیں۔ حکومت نے بلوچ قیادت کو دھوکہ دینے کی کوشش کی، لیکن مری علاقے کی گھیرا بندی تیز ہو چکی تھی۔ آج سے اکتالیس سال قبل 18 مئی 1973ء میں سبی اسکاؤٹس کے آٹھ اہلکار، جو ریل کی پٹڑی اور لوگوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کیا کرتے تھے تا کہ وہ اسے پار کر کے مری علاقے میں نہ جا سکیں، پر مری پہاڑوں کے دامن کوہ میں تندوری کے قریب گھات لگا کر حملہ کیا گیا اور تمام آٹھ اہلکار ہلاک ہو گئے۔

ہم مری علاقے پر کریک ڈاؤن کا حصہ تھے۔ میرے چھوٹے بھائی میر حیدر علی، جنہوں نے مینگل علاقے میں کچھ وقت گزارا تھا، سمیت ہم سب مطلوب افراد کی فہرست پر تھے جو وہاں حیدرآباد سازش ٹریبونل میں شامل تھے، جسے حکومت نے تشکیل دیا تھا۔ مری علاقے میں ہم بلاشبہ اہم اہداف تھے۔

تندوری میں 18 مئی کے واقعے کے 3 دن کے اندر مری علاقے کے مرکز ماوند میں ہیلی کاپٹروں نے پاکستان آرمی کے اہلکار پہنچائے۔ سڑک کے ذریعے جانا مشکل ہوتا، اس لیے فوجیوں کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعے لے جایا گیا۔

ٹکا خان نے بیان دیا اور کہا کہ ''ہم مجرموں کو 72 گھنٹوں کے اندر پکڑ لیں گے اور انھیں ختم کر دیں گے۔'' لیکن مہینے گزر گئے اور نہیں لگتا کہ یہ ان کے لیے ختم ہونے والا ہے۔ میرے خیال میں جو بھی مقامی لوگوں سے لڑنے جاتے ہیں، ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب فرانسیسیوں نے مالی پر حملہ کیا تو انہوں نے بھی دو ہفتوں کے لیے جانے کا کہا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں اور کبھی نہیں سیکھتے۔

مورخہ 21 مئی کے بعد پورے مری علاقے میں بڑے پیمانے پر آپریشن کیے گئے، وسیع علاقے پر محیط کارروائیاں کی گئیں، چونکہ مسلح افواج تلاش کرنے اور تباہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن وہاں رہنے والے لوگوں کو علاقے کے بارے میں اچھی طرح سے علم تھا اور وہ بہت سخت

جان تھے۔

بلوچ بہت کم پر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کے پاس وسیع لاجسٹکس نہیں ہے۔ وہ بکری کی کھال سے بنے اپنے مشکیزے میں پانی لیتا اور انبام (بھیڑ کی کھال سے بنا تھیلا جس میں وہ اپنا آٹا رکھتا) اٹھاتا اور اپنی چائے کی پتی لیتا اور ان کی اپنی ٹیم ہوا کرتی۔ جو روٹی وہ پتھروں پر پکاتے ہیں، اسے 'کاک' کہا جاتا ہے۔ جب آگ دہکنے لگتی، خشک ندی سے لیے گئے چھوٹے سے گول پتھروں کو آگ میں ڈال دی جاتی اور پھر کاک بنانے کے لیے گرم کیا جاتا۔ گوندھے ہوئے آٹے کا گھاڑھا پن پیزا جتنا ہوتا ہے اور اسے صاف کپڑے کے ایک ٹکڑے پر گوندھا جاتا ہے۔ پھر پتھر کے سائز کے حساب سے گوندھا ہوا آٹا توڑا جاتا ہے اور اسے چھوٹی سی موٹی روٹیوں کی شکل دے دی جاتی ہے۔ اور پھر سب سے مشکل مرحلہ آتا جو کہ نہ صرف مہارت کا ایک امتحان ہوتا ہے بلکہ مردانگی کا بھی کیونکہ گرم پتھر کو ہاتھوں سے آگ سے نکالا اور گوندھے ہوئے آٹے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ آٹا پھر آہستہ آہستہ اس کے گرد لپیٹا جاتا ہے اور بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ اس سے خارج ہونے والی بھاپ سے ہاتھ جھلس نہ جائیں۔

اس کے گرد لپٹے ہوئے آٹے کے ساتھ پھر اسے آگ کے قریب انگاروں پر رکھ دیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ گھمایا جاتا ہے، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ یہ مکمل طور پر پک جائے۔ یاد رہے کہ آٹے کا اندرونی حصہ پتھر کی گرمی کے ساتھ مسلسل سینک رہا ہوتا ہے اور جب تک سجّی پک جاتی کاک بھی تیار ہو جاتی اور سجّی کی طرح بہت گرم ہوتی۔ پھر کاک کو توڑ کر کھولا جاتا ہے اور پتھر کو پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر وہ روٹی کو ٹکڑوں میں توڑتے ہیں اور اسے کھاتے ہیں۔ کاک عموماً اس وقت بنایا جاتا ہے جب لوگ حرکت میں ہوں۔ وہ اسی طرح زندہ رہ سکتے ہیں۔

تو لہٰذا بلوچ کو زندہ رہنے کے لیے واقعی کسی وسیع لاجسٹکس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خاص طور پر مری علاقے کی بات کر رہا ہوں کیونکہ تمام مسلح کارروائیوں کا تین چوتھائی وہیں وقوع پذیر ہوئی تھیں۔ اور اس کے باوجود ہم بچ گئے۔ ہم خفیہ انداز میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے

اور ہمیں پتہ تھا کہ مشکل حالات میں کیسے زندہ رہنا ہے۔

ان کے پاس نشاندہی کرنے والے طیارے اور ایرانی ہیلی کاپٹر گن شپ تھے جو گھات لگا کر حملہ کرنے کے لیے استعمال کیے گئے۔ انہیں ایرانی پائلٹ اڑاتے تھے۔ میرے دوست اسد رحمٰن کاہان گئے اور کوئی بھی انہیں پہچان نہ سکا کہ وہ مری نہیں ہے۔ انہوں نے خود وہاں ایرانی پائلٹوں کو دیکھا تھا۔

شیر علی خان: آپ نے کس قسم کی کارروائی کا سامنا کیا؟

میر محمد علی ٹالپر: ہم سب محفوظ رہے۔ وہ تلاش جاری رکھنے کے لیے ہوائی جہاز کا استعمال کرتے۔ ہیلی کاپٹر گن شپ انہیں حملوں کو انجام دینے کے قابل بناتا، اس کے علاوہ وہ جہاں چاہتے وہاں بہ آسانی فوجیوں کو پہنچانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

حالات ایسے تھے کہ میں اور احمد رشید اکتوبر 1974ء میں سندھ آ گئے۔ رشید پہاڑوں پر جاتے اور واپس آ جاتے تھے۔ میں پہاڑوں پر واپس نہیں گیا۔ اسد رحمٰن اور دلیپ داس وہیں رہے، لیکن محمد بھابھا آنکھ میں معذوری کے ساتھ تھے، لہٰذا وہ پہلے ہی جا چکے تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب ہمارے دوست دلیپ داس سندھ واپس آ رہے تھے۔ ایک مری قبائلی شیر علی مری ان کے ساتھ تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جو کہ ڈبل ایجنٹ تھا، وہ ہمارے لیے بھی کام کرتا تھا اور ریاست کے لیے بھی۔ جو آدمی انہیں لا رہا تھا اس نے پہلے ہی سے انٹیلی جنس کو مطلع کر دیا تھا، اور ان کی گاڑی 1975ء کے اوائل میں بیل پٹ میں روکی گئی۔

دلیپ داس اور شیر علی کو گاڑی سے اتارا گیا اور پھر ان کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔ اسی طرح اختر مینگل کے بھائی اسد اللہ مینگل کے ساتھ ہوا تھا، جنہیں 6 فروری 1974ء میں گلستان جوہر کراچی میں ان کے گھر سے اٹھایا گیا۔ ایجنسیوں نے انہیں اور احمد شاہ کو اٹھایا اور آج تک ان کی لاشیں نہیں ملی ہیں۔

اسی طرح دلیپ داس اور شیر علی کی لاشیں بھی نہیں ملیں۔ دلیپ داس کی والدہ اب بھی زندہ

ہیں۔ان کی عمر 92 سال ہے۔اور جب بھی کراچی جاتا ہوں تو میں ان سے ملنے جاتا ہوں۔ان کے والد انتقال کر گئے۔میں نے ان کی والدہ کو آخری بار گذشتہ سال فروری میں دیکھا تھا۔

ان کے لیے اس بات کو تصور کریں، انہوں نے دلیپ کو 1971ء میں کھو دیا، جب وہ مری کے علاقے میں آئے اور ان کے درمیان رابطے منقطع ہو گئے تھے۔ان کی والدہ مجھ سے ہمیشہ پہلا سوال یہی پوچھتی ہیں ''جانی کیسا ہے؟'' ان کا اب بھی یہ ماننا ہے کہ وہ زندہ ہے، تو لہٰذا ان کے لیے یہ باب کبھی بند نہیں ہوتا جنہوں نے کسی پیارے کو کھو دیا ہو۔ ہزاروں لوگ جو اس وقت لاپتہ ہیں اور ہزاروں لاشیں جو برآمد ہوئی ہیں، ذرا تصور کریں اُس درد کو جو وہ خاندان محسوس کرتے ہیں۔

شیر علی خان: اس طرح کے اغوا کتنے عام تھے، جب آپ مری علاقوں میں رہ رہے تھے؟

میر محمد علی ٹالپر: آپ اگر ذاتی طور پر مجھ سے پوچھ رہے ہیں تو جن لوگوں کو میں جانتا تھا، ان میں دلیپ داس اور شیر علی تھے۔ پھر دیگر دوستوں میں بہار خان، علی دوست، اللہ بخش، شفیع محمد تھے، اور مزید دو یا تین لوگ اور بھی تھے جو غائب ہوئے اور پھر ان کی بابت کبھی کچھ نہیں سنا گیا۔

چند لوگ تھے جنہیں اٹھایا گیا اور پھر چھوڑ دیا گیا لیکن آٹھ دس لوگ ایسے تھے جنہیں میں جانتا تھا ان کی طرف سے پھر کبھی کچھ نہیں سنا گیا۔ یہ اس وقت زیادہ قابلِ ملامت اور خطرناک شکل اختیار کر گئی ہے، یہ بنیادی طور پر 'اٹھاؤ اور قتل کرو' کی ایک حکمت عملی ہے۔ پہلے وہ لوگوں کو اٹھایا کرتے، ان پر تشدد کرتے اور اس کے بعد انہیں جانے دیتے، لیکن اب وہ انہیں نہیں جانے دیتے۔

شیر علی خان: 1970ء کی دہائی کے وسط میں بھٹو نے کریک ڈاؤن کا فیصلہ کیا اور بہت سے بلوچ کارکنوں کو جیل میں ڈالا۔اس گروہ، جس سے آپ منسلک تھے، سے یعنی آپ میں

سے کوئی جیل گیا؟

میر محمد علی ٹالپر: صرف نجم سیٹھی جیل گئے۔ہم کافی خوش قسمت تھے کہ کبھی پکڑے نہیں گئے۔اصل میں ہوا یہ تھا کہ سیٹھی کا کراچی میں ایک مشاورتی فرم تھا۔فوج کے لوگ دیہاتوں کو خود کفیل بنانے کے لیے زرعی علاقے قائم کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے، بالکل وہی طریقہ جسے امریکی حکومت نے ویتنام میں استعمال کیا تھا۔ وہ انہیں ایک ہیلی کاپٹر میں ماوند لے جاتے، اور دوسری بار جانے پر انہیں معلوم ہوا کہ وہ تنظیم کا حصہ تھے۔

شیر علی خان: آپ اس دور کے مجموعی منفی ردِعمل پر کیا محسوس کرتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کچھ مختلف کیا جا سکتا تھا؟ اور بلوچ ثقافت کے لحاظ سے، آپ کو کیا لگتا ہے کہ کیا چیز نمایاں طور پر ابھری ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: بلوچ ثقافت میں بہت ساری شاعری موجود ہے۔اس زمانے کی بہت سی نظمیں ہیں جن میں اسد الرحمٰن اور اِس فقیر کا ذکر موجود ہے۔ وہاں مزاحمتی شاعری بھی ہے، اور وہاں ہمارے نام مختلف تھے۔اسد کو چاکر کے طور پر جانا جاتا تھا، احمد رشید کو بالاچ، دلیپ داس دلّی تھے، اور میں عرشو تھا۔ وہاں ہمارے اپنے نام تھے، اور لوگوں کو اب بھی یاد ہے۔ اور میں ذاتی طور پر بیس سال تک مریوں کے ساتھ رہا۔1978ء میں، میں افغانستان گیا، جہاں میں نے مری پناہ گزینوں کیساتھ تیرہ سال گزارے۔تین سال صوبہ زابل میں اور دس سال ہلمند صوبے میں لشکر گاہ کے قریب۔

شیر علی خان: پاکستان کی تاریخ کے تناظر میں، جب آپ بلوچ عوام کے خلاف تشدد اور ریاست کے ظلم کو دیکھتے ہیں، کیا آپ کو لگتا ہے بلوچستان میں جو کچھ ہوا ہے، لوگوں کو اس کی وسعت کا اندازہ ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: یہاں لوگوں کو اس کا بالکل احساس نہیں ہے۔عام آدمی ان باتوں کو نہیں سمجھتا، اور تاریخ بتاتی ہے کہ حتیٰ کہ اگر انہیں تھوڑا بہت معلوم ہو بھی جائے تو وہ یہی

سمجھتے ہیں کہ یہ غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور اسی انجام کے مستحق ہیں۔ وہ یہی کہتے ہیں۔

نہیں، ہم کسی بھی طرح سے یا کسی بھی شکل میں غیر ملکی ایجنٹ نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب ریاست عوام سے ظالمانہ روش رکھے اور اس کے بعد وہ حکومت کے حق میں نعرے کی توقع کریں تو یہ ناممکن ہے۔ جیسا کہ میں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ ان خرافات کا زہر پھیلایا گیا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے افغانستان میں تیرہ سال گزارے ہیں۔ ہمیں کم از کم صرف اتنا ملتا تھا کہ جس سے ہم بمشکل گزارا کر پاتے تا کہ اپنے آپ کو زندہ رکھ سکیں۔ اس وقت روسی اور باقی سب وہیں تھے، ہم نے ان کے لیے کبھی کام نہیں کیا، اگرچہ وہ اس بات کو پسند کرتے اگر ہم ان کے لیے کام کرتے۔

ہم صرف چند لوگ نہیں تھے بلکہ وہاں بارہ سے تیرہ ہزار مری اور دیگر بلوچ تھے۔ وہاں دیگر بلوچوں سے زیادہ مری تھے۔ یہ 1992ء کو ختم ہوا جب نجیب اللہ کو اقتدار سے ہٹا دیا گیا تھا اور مہاجرین واپس ہوئے۔ میں مجموعی طور پر بیس سال تک اپنے گھر سے دور رہا۔ میں 1971ء میں نکلا اور آخر میں 1991ء میں واپس آیا۔

بشکریہ: تنقید ڈاٹ کام، بدھ، 3 جون 2015

http://www.tanqeed.org/2015/06/the-mm-talpur-story-part-ii/

’بھارت کا بلوچوں کو مدد کے الزامات کبھی ثابت نہیں ہوئے‘

بلوچ سیاسی مدبر و دانشور میر محمد علی ٹالپر سے خصوصی انٹرویو

انٹرویو: اے گنیش نڈار

میر محمد علی ٹالپر 1971ء سے پاکستان میں بلوچ قومی جدوجہد کے ساتھ منسلک رہے ہیں۔ وہ اس تحریک کو سوشل میڈیا پر متحرک رکھ کر اور مختلف اخبارات میں کالموں کے ذریعے زندہ رکھتے آئے ہیں۔
’ریڈف ڈاٹ کام‘ کے اے گنیش نڈار کے ساتھ ایک ای میل انٹرویو میں ٹالپر صاحب نے بلوچ عوام کی جدوجہد اور اس کے لیے بلوچ کو جو قیمت ادا کرنی پڑی ہے، اس کے بارے میں بات کی ہے۔

سوال: آپ ہمیں اپنے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟

جواب: میں سندھ کے ٹالپر خاندان سے ہوں۔ ٹالپر بلوچ ہیں جو سندھ میں تقریباً 300 سال قبل آئے تھے۔ میرا خاندان طویل عرصے سے بلوچ قومی جدوجہد کے ساتھ منسلک رہا ہے۔

سوال: آپ بلوچستان میں حقِ خودارادیت کے لیے کب سے لڑ رہے ہیں؟

جواب: میں 1971ء سے بلوچ جدوجہد کے ساتھ منسلک ہوں، جب میں نے کراچی میں اپنی تعلیم چھوڑی اور بلوچوں کی جدوجہد میں مدد دینے کے لیے پہاڑوں پر چلا گیا۔

سوال: آپ کا ان الزامات کے بارے میں کیا کہنا ہے کہ بھارتی حکومت اسلحہ، تربیت اور پیسے کے ساتھ اس تحریک کی پشت پناہی کر رہی ہے؟

جواب: بھارت سمیت غیر ملکی ہاتھ کے ملوث ہونے کے حوالے سے الزامات کی بہتات

ہے، لیکن کبھی بھی ان کے حوالے سے شہادت یا ثبوت مہیا نہیں کیے گئے اور ان کو محض بلوچوں پر مظالم ڈھانے کے جواز کے طور پر پیش کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ یہ اس یا اُس غیر ملکی طاقت کے ایجنٹ ہیں۔

بلوچوں نے 19 ویں صدی میں برطانیہ کے خلاف جنگیں لڑیں۔ اس وقت کوئی بھارتی یا دیگر ایجنسیاں تو نہیں تھیں جو ان کی مالی اعانت کرتیں اور انہیں جنگ کے لیے بھڑکاتیں۔

سوال: پاکستان کی حکومت بلوچستان میں تحریک کے ساتھ کس طرح نمٹی ہے؟

جواب: 27 مارچ 1948ء کو بلوچستان کے جبری الحاق، جب یہ 227 دنوں کے لیے آزاد رہا تھا، کے بعد سے پاکستان نے بلوچوں کی خواہشات اور حقوق کو دبانے کے لیے طاقت کا ستعمال کیا ہے۔ وہاں حقوق اور مراعات اور پیکیجز دینے کے ڈرامے ہوتے رہے ہیں لیکن یہ سب کے سب کھوکھلے اور بے معنی رہے ہیں اور یہ اس کاغذ کے بھی مستحق نہیں ہیں جن پر انہیں لکھا جاتا ہے۔

مئی 1972ء میں عطا اللہ مینگل کی حکومت ایک واحد حقیقی پیشرفت تھی، لیکن اسے صرف نو ماہ کے لیے رہنے دیا گیا اور اسے بلا جواز اور غیر قانونی طور پر برخاست کیا گیا۔ اس کا نتیجہ 1973ء سے لے کر 1977ء تک چار سالہ طویل جدوجہد کی صورت میں نکلا۔

سوال: بلوچستان کی صورتحال کا کشمیر کے حالات سے کس طرح موازنہ کیا جا سکتا ہے؟

جواب: دونوں جگہوں پر لوگوں کے دلوں میں آزادی اور وقار کی زندگی کے لیے امنگیں موجود ہیں اور وہ اس کے لیے قربانی دینا جاری رکھے ہوئے ہیں۔

حکمران طبقے میں بالکنائزیشن کا بے بنیاد خوف اور ان کے ذہن یک سنگی طرزِ زندگی کے غلبے میں ہونے کے سبب اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ سب لوگ کھاتے پیتے غلام رہنا نہیں چاہتے بلکہ وہ آزادی میں ایک مشکل زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ بلوچستان اور کشمیر دونوں میں حکومتوں کے نقطۂ نظر یکساں رہے ہیں۔

بدقسمتی سے ریاستیں اپنی نام نہاد سالمیت کے بارے میں زیادہ فکرمند ہوتی ہیں اور لوگوں کی

پرواہ نہیں کرتیں جو اس سالمیت کا حصہ نہیں رہنا چاہتے۔ بلوچستان کا پاکستان اور ایران میں، کشمیر کا بھارت میں، تبت اور سنکیانگ کا چین میں اور ترکی میں کردوں کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔

ضروری نہیں ہے کہ جدوجہد کو عارضی طور پر دبانے کا مطلب فتح ہو۔ آپ الجیریا کی لڑائی تو جیت سکتے ہیں، لیکن الجزائر کی جنگ ہار جائیں گے۔

سوال: آپ نے بلوچستان میں انسانی حقوق کی کیسی خلاف ورزیاں دیکھی ہیں؟

جواب: انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا ارتکاب کبھی بھی انتخاباً نہیں کیا جاتا؛ یہ بلا کسر ان لوگوں کے آوے کے آوے تک پھیلا ہوا ہے جو اختلاف رائے اور دوسری کی جداگانہ حیثیت سے نفرت کرتے ہیں اور یہ لوگ کبھی بھی مہذب نہیں رہے ہیں؛ ظلم وستم جہالت کے ہم معنی مترادف ہیں۔

انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی گہرائی اور پیمانے ہولناک ہیں۔ وہاں اغوا، تشدد، مسخ شدہ لاشیں، ٹارگٹ کلنگ اور ہر وہ چیز جو ذہن میں آسکتی ہیں، کیے جا رہے ہیں۔ اس بات کو باآسانی نظرانداز کیا جاتا ہے کہ معاشی حقوق اور سماجی حقوق سے انکار بھی شدید ترین انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں سے ہیں جس کے ساتھ جسمانی انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہم رکاب ہیں۔

سوال: آپ کیونکر ایسا کہتے ہیں کہ چین پاکستان اقتصادی راہداری بلوچوں کی زندگی کو تباہ کر دے گی؟ ایک اقتصادی راہداری عام طور پر اردگرد کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

جواب: وہ تمام اقتصادی راہداریاں یا عظیم الشان منصوبے جن کا واحد مقصد کسی ایک کے وسائل کا استحصال کر کے دوسرے کو فائدہ پہنچانا ہو کبھی بھی ان لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے جن کے وسائل اور زمین کا استحصال کیا جا رہا ہو۔ سی پی ای سی (سی پیک) بھی بنیادی طور پر استحصالی منصوبہ ہے اور یقینی طور پر اس کا مقصد بلوچ مفادات نہیں ہیں۔

پاکستان، چین کو سرمایہ کاری کے لیے اطمینان دلا رہا ہے جس سے ان کو فائدہ ہوگا۔ چین

کے ساتھ اقتصادی راہداری بلوچ کو نہ صرف ان کی زمین اور وسائل سے محروم کرے گی، بلکہ باہر کے لوگوں کی آمد سے انہیں ایک اقلیت میں تبدیل کردے گی اور وہ لوگ جو پیسے کی تلاش میں آئیں گے، وہ بڑی تعداد میں آئیں گے جب زمین اور لوگوں کا استحصال کیا جارہا ہو۔

سوال: سی پیک کے بارے میں بلوچ کی کیا رائے ہے؟

جواب: بلوچ سی پیک کو ازارہِ عنایت نہیں دیکھتے کیوں کہ وہ اسے ترقی کے بہانے بلوچوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے ایک آلے کے طور پر دیکھتے ہیں۔

سوال: جب حکومت ترقی کے لیے زمین اپنی ملکیت میں لیتی ہے تو وہ اس کے لیے پیسے ادا نہیں کرتی؟

جواب: زمین کا معاوضہ، اگر کچھ ہو بھی تو وہ، کم سے کم ہے۔ لیکن اصل مسئلہ زمین کے حقوق کا ہے۔ بلوچستان میں صدیوں سے زمینوں کے مالک قبائل ہیں اور محض اس وجہ سے انہیں ان کی وراثت سے عاق نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام آباد میں بیٹھا کوئی شخص ایک قانون بنانے کا فیصلہ کرتا ہے جس میں عاق شدہ کو کچھ کہنے کا حق نہ ہو کہ ساری زمین ریاست کی ہے اور اس میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جنہیں عاق کیا گیا ہو۔ زمین ان لوگوں کی ہو جو اس پر رہتے ہیں نہ کہ ان کی جن کے پاس اسے خریدنے یا ہتھیانے کے لیے پیسہ اور طاقت ہو۔

سوال: آپ کو نہیں لگتا کہ یہ راہداری بلوچوں کو روزگار فراہم کرے گی؟

جواب: بلوچ خود مالک بننا چاہتے ہیں نہ کہ اپنی ہی سرزمین پر غلام اور اجرتی مزدور۔ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ (بلوچستان کے وزیر اعلیٰ) ہمارے لیے کچھ معمولی ملازمتیں حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن وہاں ایک کہاوت ہے کہ غربت میں آزادی خوش حال غلامی سے بہتر ہے۔ یہ روزگار کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلوچ کہتے ہیں کہ یہ زمین ہماری ہے۔ یہ اس وقت ہماری تھی جب یہ ویران تھی۔ اب انہوں نے یہاں سونا، چاندی اور تانبا دریافت کیا ہے، یہ ہمارا ہے۔

سوال: گوادر پورٹ کی ترقی سے بلوچ عوام کو کیوں فائدہ نہیں پہنچا ہے؟

جواب: کہیں بھی ترقی کے لیے وہاں کے باشندوں کی رضامندی اور شرکت ضروری

ہوتی ہے اور گوادر ان دونوں سے مبرا رہا ہے کیونکہ وہاں کے لوگ اسے دوسروں کے فائدے کے لیے ان کے ساحل اور زمین کا استحصال کرنے کی ایک کوشش کے طور پر دیکھتے ہیں۔

اس کے برائے نام آپریشنل ہونے کے بعد سے وہاں اناج کے چند بحری جہاز لنگر انداز ہوئے تو ان کو اتارنے کے لیے مزدور کراچی سے لائے گئے جیسا کہ وہاں کے لوگ اپنے وسائل کے استحصال کے منصوبے کا حصہ نہیں بننا چاہتے۔

مزید براں، اس کے بجائے کہ یہ وہاں کے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا، وہاں کے باشندوں نے اپنی زمین پر قبضے کی بدترین شکل دیکھی اور یہ اس قدر تجاوز کرگئی تھی کہ اس نے پاکستان کی سپریم کورٹ کو زمینوں کی الاٹمنٹ منسوخ کرنے پر مجبور کیا۔

زمین پر اس قبضے نے باہر کے لوگوں کی آمد کی بھی حوصلہ افزائی کی اور اس میں کمی محض اس وقت واقع ہوئی جب لوگوں نے ان ناانصافیوں کے خلاف جسمانی طور پر مزاحمت کی۔

سوال: بلوچ عوام کا چینیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: بلوچ عوام قدرتی طور پر ان سب کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو بلوچ عوام کے مقابلے میں پاکستان کی فوجی یا اقتصادی امداد کریں اور یہ شکوک وشبہات اور نفرت چین اور امریکہ دونوں جانب بلوچستان میں ان کے کردار سے متعلق پائے جاتے ہیں۔

جیسا کہ چین، بلوچستان میں تیزی سے سرگرم سرمایہ کار بن چکا ہے، اس کے خلاف نفرت بڑھی ہے اور ترقی کے نام پر پاکستان کی طرف سے جن مظالم کا ارتکاب کیا جارہا ہے لوگ انہیں سی پیک کے سبب چین سے منسوب کررہے ہیں اور اسے برابر کا شریک سمجھتے ہیں۔

سوال: بلوچ عوام کی امریکہ کے بارے میں کیا رائے ہے، جس کے پاکستان کے ساتھ قریبی تعلقات ہیں؟

جواب: بلوچ عوام میں اس فوجی اور مالی امداد کے لیے غم وغصہ پایا جاتا ہے جسے امریکہ فراہم کررہا ہے کیونکہ وہ اس فوجی ساز وسامان کے نقصانات کے حاصل کنندگان ہیں جو پاکستان کو مہیا کیے جاتے ہیں۔

لوگوں کے پاس اپنے خیالات پیش کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے تو لہٰذا وہ سوشل میڈیا کا استعمال کر کے امریکہ کو پاکستان میں فوجی ساز و سامان اور پیسے کے انبار لگانے پر اس کو اس کی حماقت کی یاد دہانی کراتے رہتے ہیں۔ بلوچ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ملکوں اور بڑی طاقتوں کے دوست یا دشمن نہیں ہوا کرتے؛ ان کے مفادات ہوتے ہیں۔

سوال: آپ نے سیندک کاپر اور سونے کی کانوں میں چینیوں کے ملوث ہونے کا ذکر کیا۔ کیا آپ کے لوگ وہاں کام نہیں کر رہے ہیں؟ آپ کو اپنے وسائل کے بدلے میں کیا ملا ہے؟

جواب: کوئٹہ سے 670 کلومیٹر مغرب میں بلوچستان کے ضلع چاغی میں واقع سیندک پراجیکٹ 412 ملین ٹن متوقع کچ دھات کے ذخائر پر مبنی تھا جو کہ فی ٹن اوسط سے سونے کی 0.5 گرام اور چاندی کی 1.5 گرام فی ٹن پر مشتمل تھا۔ اس سے سالانہ 65 ملین ڈالر پیدا کرنے کی توقع کی جا رہی تھی۔ اس منصوبے کو پاکستان اور چین کی طرف سے 22 مارچ 2002ء کو دوبارہ بحال کیا گیا تھا اور اس کی ترقی کے لیے 350 ملین ڈالر مختص کیے گئے۔ اس کی شرائط بلوچستان اور اس کے عوام کے لیے غیر معمولی حد تک ناموافق ہیں۔

ایم آر ڈی ایل، جو کہ چین کی میٹالرجیکل کنسٹرکشن کمپنی کا ایک ذیلی ادارہ ہے، اسے معدنی فروخت کی کل آمدنی کے 50 فی صد کے عوض چلاتا ہے اور یہ کمپنی 10 سال کی لیز کی مدت کے لیے پاکستان کو ماہانہ 500,000 ڈالر بھی ادا کرتی ہے۔

بلوچستان کو اس سے سالانہ رائلٹی کے طور پر صرف 0.7 ملین ڈالر حاصل ہوگا۔ یہ اعداد و شمار حکومت پاکستان کی طرف سے بلوچوں کے حقوق کو مکمل نظر انداز کرنے کو بے نقاب کرتے ہیں۔

جو لیز 2012ء کو ختم ہونیوالی تھی اسے من مانے طور پر 2017ء تک بڑھا دیا گیا۔ سیندک منصوبہ ایک ماحولیاتی تباہی ہے۔ وہاں کے لوگوں کو سخت محنت والے کاموں کے لیے ملازمتیں دی گئی ہیں جب کہ تعلیم یافتہ بلوچوں کو دوسروں کے حق میں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

سوال: آپ نے پاکستان کی حکومت کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا ہے؟ ان کا جواب کیا رہا ہے؟

جواب: آرا کو پہنچانے کا واحد ذریعہ صرف میڈیا ہے، لیکن یہاں (پاکستان میں) میڈیا بلوچ مسائل کو زیادہ کوریج نہیں دیتا، صرف ایک آدھ ملکی روزنامے ہیں جو کوریج دیتے ہیں۔ سوشل میڈیا کو استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کی وسیع کوریج کے باوجود اس کی تاثیر بہت محدود رہتی ہے۔

سوال: گوادر بلوچ عوام کے لیے کتنا اہم ہے؟

جواب: گوادر کسی اور کے لیے اتنا اہم ہو ہی نہیں سکتا جتنا کہ یہ بلوچ عوام کے لیے ہے۔ چین کے گوادر میں اسٹریٹجک اور اقتصادی مفادات تو ہو سکتے ہیں، لیکن بلوچ کے لیے یہ ان کا مادرِ وطن ہے اور یہ ان کے محبوب مادرِ وطن کا ایک اہم حصہ ہے۔ وہ محسوس کرتے اور سمجھتے ہیں کہ گوادر لازمی طور پر ان کے مستقبل کی خوش حالی سے منسلک ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ماضی میں اس پر تجاوزات کے خلاف مزاحمت کی ہے اور اب بھی مزاحمت کر رہے ہیں۔

سوال: بلوچ عوام کے لیے آپ کے مستقبل کے منصوبے کیا ہیں؟

جواب: اس بات کا فیصلہ بلوچ عوام کریں گے کہ وہ کیا چاہتے ہیں، لیکن ایک بات یقینی ہے کہ وہ ایک آزاد جمہوری بلوچستان چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ایک ایسا ملک ہو جو کہ مذہبی تعصب اور نسلی امتیاز سے پاک ہو جہاں سب کے لیے یکساں اقتصادی اور معاشرتی انصاف میسر ہو۔

بشکریہ: ریڈف ڈاٹ کام، 22 جولائی 2015

http://www.rediff.com/news/interview/allegations-of-india-helping-the-balochs-never-proved/20150722.htm

بلوچستان کو شانت کرنے کی کوشش

’دہشتگرد زدہ‘ بلوچستان کو شانت کرنے کی کوششیں تاملوں کے خلاف سری لنکا کی طرف سے کی جانے والی سفاکانہ تسخیری کارروائی جیسی حکمت عملی کے ساتھ جلد شروع ہونے والی ہیں اور پہلے ہی سے دہشت زدہ بلوچ عوام ان ہولناک اوقات کے لیے چشم براہ ہیں جو 2000ء کے بعد سے عداوتوں کے اس پانچویں راؤنڈ میں مسلسل سفاکانہ حملوں کی زد میں ہیں۔ تاہم بلوچ کو محکوم بنانے کی یہ حکمتِ عملی پچھلی تمام کی جانے والی کوششوں کی طرح ناکام ہو جائے گی کیونکہ جبر کے سبب اس وقت بلوچ عوم کے درمیان پائی جانے والی بیگانگی اور مزاحمت پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہے۔

بظاہر سرمایہ کار بلوچستان کے وسائل کی لوٹ مار میں مدد کے جتنے بڑے وعدے اور جتنا بڑا متوقع منافع دکھاتے ہیں تو اسٹابلشمنٹ اور اس کے یارِ غار سرمایہ داری جھتے کے اعمال اور منصوبے بلوچ عوام کے خلاف پوری طرح سے شیطانی اور سفاکانہ بن جاتے ہیں۔ ’’بلوچستان میں ڈرون جنگ‘‘ کے عنوان سے روزنامہ ’ٹریبیون‘ (14 جون 2015) میں چھپنے والے ایک مضمون میں محمد علی احسان نامی راقم بلوچ کے خلاف نہ صرف ایک شیطانی، سفاکانہ اور پوری طاقت سے ڈرون جنگ کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں بلکہ چینی اور دیگر سرمایہ کاروں کے لیے اسے زیادہ محفوظ بنانے کو انہیں ختم کرنے کے طریقوں پر مزید ناپاک تجاویز کے ساتھ آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کی حفاظت 44 فیصد وسیع زمین پر بسنے والے پانچ فیصد کے مکمل خاتمے کی قیمت پر ملے۔ بدقسمتی سے سب یہ بات بھول جاتے ہیں کہ پانچ فیصد بلوچ اپنی مرضی سے پاکستان کا 44 فیصد نہیں بنے؛ اسٹابلشمنٹ کے حامی انسانی جانوں کی قیمت سے قطع نظر ایسے اقدامات چاہتے ہیں تاکہ اس بات

کو یقینی بنایا جا سکے کہ بلوچستان ان کا 44 فیصد رہے۔

احسان صاحب اس بات پہ ناراض ہیں کہ اب تک بلوچستان میں ڈرون استعمال نہیں کیے گئے کیوں کہ ان کے مطابق ’’بلوچستان میں زمین پر فوجی ایک خالی بالٹی میں پانی کے قطروں کی طرح ہیں‘‘ اور پھر بلوچ پر الزام لگاتے ہیں کہ ’وہ نسل کشی کے رجحانات دکھا رہے ہیں اور مذہبی اور نسلی بنیادوں پر بڑے پیمانے پر لوگوں کو قتل کر رہے ہیں‘۔ وہ بہ آسانی بھول جاتے ہیں کہ یہ پاکستان ہے جو 27 مارچ 1948ء سے بڑی تعداد میں بلوچوں کو نسلی بنیادوں پر قتل کر رہا ہے اور یہ کہ ہزارہ، ذکری اور ہندوؤں کو ان گروہوں کی جانب سے نشانہ بنایا جاتا ہے جنہیں پاکستان نے قائم کیا ہے اور انہیں تحفظ فراہم کر رہا ہے اور ان کا بلوچ کے ساتھ کوئی لینا دینا نہیں ہے جو کہ صرف اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ نسلی بنیادوں پر بلوچ کی طرف سے کی جانے والی ہلاکتیں کسی ہمدردی کی مستحق نہیں ہیں اور میں ان کی مذمت کرتا ہوں۔

پھر وہ پوچھتے ہیں، ’’بڑا سوال یہ ہے: مقامی طور پر تیار کیے گئے ہمارے مسلح ڈرون ’براق‘ اور اس کا لیزر گائیڈڈ میزائل ’برق‘ کہاں ہیں؟‘‘ اور ’’ہم عملی طور پر دہشتگرد زدہ، وسیع زمین بلوچستان میں اسے تعینات کرنے میں اب تک کیوں ناکام رہے ہیں؟ اگر ہم بلوچستان کے آسمان کو باقاعدگی سے نگرانی اور مسلح ڈرون مشن کے ساتھ بھر دیں تو کیا اس سے دہشتگردوں کے لیے پہاڑی علاقے میں نقل و حرکت کرنا اور سزا سے بچنا آسان ہوگا؟ اگر ہمارے پاس ٹیکنالوجی ہے تو ہم اسے استعمال کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ حتیٰ کہ اگر ہم انہیں بڑی تعداد میں تعینات کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ہم کیوں چینی مسلح ڈرون 3 سی ایچ خریدنے پر غور نہیں کرتے جو کہ دو لیزر گائیڈڈ میزائلوں سے لیس ہے۔‘‘ چین ایک ’محفوظ‘ ماحول کو یقینی بنانے کے لیے بہ خوشی ان کو 3 سی ایچ کی فوجی امداد دے دے گا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ امریکی ڈرون کے استعمال کو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن بلوچ کے خلاف اس کا استعمال جائز لگتا ہے۔

لیکن صرف یہی چیز نہیں ہے جسے یہ شریف النفس شخص ’دہشتگرد زدہ‘ بلوچستان میں بلوچ کے

خاتمے کے لیے استعمال میں لانا چاہتے ہیں؛ وہ مشورہ دیتے ہیں، ''بھارت کی مثال لے لیں کہ جس نے مبینہ طور بلوچستان میں ہم پر ایک وسیع پر اکسی جنگ مسلط کر رکھی ہے جسے ہم لڑ رہے ہیں۔ جب 1980ء اور 1990ء کی دہائیوں میں بھارتی ریاست پنجاب ہماری طرح کی شورش کی لپیٹ میں تھا تو انہوں نے ایک رضا کار فورس بنائی۔ انہوں نے 1100 دیہاتوں کی کمیٹیوں اور 40000 رضا کار مردوں پر مشتمل ایک 'دیہاتی دفاعی منصوبہ' منظّم کیا۔ اس فورس کو ریاست کی انسدادِ بغاوت کی حکمت عملی میں مربوط کیا گیا۔ اس دفاعی منصوبے کے تحت انہوں نے رضا کاروں کی تربیت کی اور انہیں مسلح کیا جو معمول کی گشت کیا کرتے اور کسی بھی مشتبہ ملزم کو دیکھتے تو اسے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حوالے کر دیتے۔ آج بلوچستان بھی ایک 'غیر رسمی سیکورٹی نظام' کا مستحق ہے۔ یہ صرف اس غیر رسمی اور رسمی سیکورٹی کے نظام کے مابین باقاعدہ ربط و ہم آہنگی کے ذریعے کیا جا سکتا ہے تاکہ بلوچستان میں غیر محفوظ برادریاں اپنی حفاظت اور دفاع خود کر سکیں۔''

وہ بلوچ الشّمس اور البدر کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں جسے 1971ء میں بنگلہ دیش میں استعمال کیا گیا، وہ بلوچستان میں بھی اسی طرح کی نسل کشی کا ارتکاب کرنا چاہتے ہیں جس کی انہوں نے بنگلہ دیش میں کوشش کی تھی۔ وہ چاہتے ہیں کہ ''ایک غیر رسمی سیکورٹی کا نظام ہو جو کہ 'لوگوں کی حفاظت کے لیے اور لوگوں کی طرف سے' بنائی گئی ہو''، اس کو اس طرح پڑھیں کہ بلوچ کے ذریعے بلوچ کو قتل کروانا۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ شفیق مینگل جیسے لوگ پہلے ہی سے ان کا یہ غلیظ کام سرانجام دے رہے ہیں؛ تو تک کی اجتماعی قبریں اسٹابلشمنٹ کے تحفظ کے تحت کام کرنے والے انہی قاتل دستوں کی کارستانیاں تھیں۔

ڈرون کے مطالبے، 'غیر رسمی سیکورٹی نظام' اور مزید سفاکانہ فوجی کارروائیوں کا مقصد بلوچ عوام پر ظلم وستم ڈھانا ہے تاکہ اس غیر قانونی اور ناجائز طور پر حاصل کی گئی 44 فی صد غیر منقولہ جائیداد میں بسنے والے لوگوں سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور مزاحمت کے بغیر اس کے وسائل کا

استحصال کیا جائے۔ چین جیسے سرمایہ کار ایک محفوظ ماحول کا مطالبہ کر رہے ہیں جو کہ صرف اور صرف ان وحشیانہ اقدامات سے ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں جو سری لنکا کی طرف سے تاملوں کو شانت کرنے کے لیے بروئے کار لائے گئے تھے۔ پس آمدہ انسانی جانوں کی قیمت مرتکبین کے لیے ایک معمولی قسم کی زحمت ہے کیونکہ سزا سے استثنٰی کا کلچر اب بھی اسی طرح غالب ہے جیسا کہ 1971ء میں تھا۔ بلوچ مخالف بیانات، بے لگام جبر اور سزا سے استثنٰی کا کلچر قدرتی طور پر بلوچ کے ذہنوں میں تشویش اور شکوک پیدا کرے گا جو وسائل اور غیر منقولہ جائیداد کے لیے اسٹابلشمنٹ کی وحشیانہ طاقت اور اس کی غیر تسکین پذیر لالچ کے اس مہلک آمیزش کے نتائج کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

جینوسائیڈ واچ کے صدر گریگوری ایچ اسٹینٹن نسل کشی کے 10 مراحل کی فہرست کچھ یوں پیش کرتے ہیں: درجہ بندی، علامت بندی، امتیاز، سلب انسانیت، تنظیم، تقطیب، تیاری، عقوبت، قتل اور تردید۔ وہ مزید کہتے ہیں ''یہ عمل مرحلہ وار نہیں ہے۔ مراحل بیک وقت وقوع پذیر ہو سکتے ہیں.....مگر تمام مراحل اس عمل کے دوران اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔'' بلوچستان میں بھی یہی ہو رہا ہے اور دنیا کو اس مسئلے پر بیدار ہونے کی ضرورت ہے اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو چکی ہو۔ زمینی حقیقت فوجی اور سیاسی رہنماؤں کی طرف سے بلوچ کے لیے اکثر دہرائے جانے والے بھائی چارے اور خیر سگالی کے منتر سے مختلف ہے۔ وہ لوگ جو غلطی سے نسل کشی کو ایک واقعہ تصور کرتے ہیں، میرے استدلال سے اختلاف کریں گے لیکن وہ جو سمجھتے ہیں کہ نسل کشی ایک طویل عمل ہے، ضرور فکر مند ہوں گے۔

پاکستان کی ترقی میں رکاوٹ ہونے کی وجہ سے بلوچ کے خلاف سخت ترین اقدامات کے لیے جو شور مچایا جا رہا ہے یہ نسل کشی کے تمام 10 مراحل کی شدت میں اضافے کے لیے زمین ہموار کر رہا ہے جو کہ پہلے ہی سے پراسرار انداز میں مختلف شدت کے ساتھ بروئے عمل ہے۔ لوگوں کو اسے سمجھنے اور بلوچ حقوق کی حمایت کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے میرا ماننا ہے کہ اس

سفاکانہ جبر سے بھی آخر کار بلوچ بھی اپنا وجود قائم رکھیں گے جیسا کہ بنگالیوں نے کیا اور وہ اس حقیقت کے پچھتاوے میں رہیں گے کہ جب عظیم ناانصافیوں کا ارتکاب کیا جا رہا تھا تو وہ انصاف کے لیے کھڑے نہیں ہوئے۔ وہ تمام لوگ جو انصاف کے لیے کھڑے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آیا وہ بلوچستان کو شانت کرنے کے اس سفاکانہ اور نسل کشیانہ عمل کی حمایت کرتے ہیں یا مخالفت۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 28 جون 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/28-Jun-2015/pacifying-balochistan

Original Text PDF file: Pacifying Balochistan

https://app.box.com/s/za7tiqrrfsair3ewbf811yr7409o03s6

''محبت خریدی نہیں جا سکتی''

حال ہی میں، بلوچستان حکومت نے ان بلوچوں کو، جو اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، اپنے مادرِ وطن کے مقدس مقصد کو ترک کرنے کے لیے عام معافی کی پیشکش کی ہے۔ اس نے مجھے مشہور زمانہ بیٹل کے مدتوں قبل مشہور گانے کی یاد دلا دی، ''مجھے محبت خرید کر نہیں دے سکتے''، کیوں کہ پیسہ محبت اور وفاداری نہیں خرید سکتے۔ اس کے اشعار کچھ یوں ہیں:

''مجھے محبت خرید کر نہیں دے سکتے، میری جان
مجھے محبت خرید کر نہیں دے سکتے
اے میرے دوست میں تمہارے لیے ہیرے کی ایک انگوٹھی خریدوں گا، اگر اس سے تم اچھا محسوس کرو
اے میرے دوست میں تمہیں ہر چیز لا کر دوں گا اگر اس سے تم اچھا محسوس کرو
کیوں کہ مجھے پیسے کی زیادہ پرواہ نہیں، اور پیسہ مجھے محبت خرید کر نہیں دے سکتا
میں تمہیں وہ سب کچھ دوں گا جو میرے پاس دینے کو ہے اگر تم کہو کہ تم بھی مجھ سے پیار کرو گی
میرے پاس شاید دینے کو بہت کچھ نہ ہو لیکن میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب میں تمہیں دوں گا
مجھے پیسے کی زیادہ پرواہ نہیں ہے، پیسہ مجھے محبت خرید کر نہیں دے سکتا
مجھے محبت خرید کر نہیں دے سکتے، ہر کوئی مجھے یہی بتاتا ہے
مجھے محبت خرید کر نہیں دے سکتے، نہ، نہ، نہ، نہ

کہو کہ تمہیں کسی ہیرے کی انگوٹھی کی ضرورت نہیں اور میں مطمئن ہو جاؤں گا
مجھے بتاؤ کہ تمہیں وہ چیز چاہیے جسے پیسہ بالکل خرید نہیں سکتا
مجھے پیسے کی زیادہ پرواہ نہیں ہے، پیسہ مجھے محبت خرید کر نہیں دے سکتا
آوووو
مجھے محبت خرید کر نہیں دے سکتے، ہر کوئی مجھے یہی بتاتا ہے
مجھے محبت خرید کر نہیں دے سکتے، نہیں، نہیں، نہیں، نہیں۔''

مورخہ 26 جون کو بلوچستان کی نام نہاد ایپکس کمیٹی نے ان تمام مقامی بلوچ عسکریت پسندوں کے لیے عام معافی کے منصوبے کا اعلان کیا جو تشدد ترک کرنے اور ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔ اس اسکیم کے تحت، قلیل مدتی جنگجوؤں کو پانچ لاکھ روپے ادا کیے جائیں گے، درمیانے درجے کے کمانڈروں کو دس لاکھ روپے ملیں گے جب کہ اعلیٰ کمانڈروں کو 15 لاکھ روپے ادا کیے جائیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ متمول نقد انعامات اس بات کو یقینی بنانے کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ ہتھیار ڈالنے والے جنگجو دوبارہ باغی گروہوں میں شامل نہ ہوں۔ وہ یہ امید کر رہے ہیں کہ لوگ اپنے آدرشوں کو کوڑیوں کے عوض بیچ دیں گے۔ 2012ء میں نواب ذوالفقار مگسی نے بلوچستان میں تمام جنگجوؤں کو اپنے ہتھیار ڈال دینے کے لیے عام طور پر 10,000 روپے دینے کا اعلان کیا۔ یہ ڈرامہ اس لیے رچایا جا رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ہجوم برائے کرایہ پر لے کر ہتھیار ڈلوانے کی تقریبوں کا بندوبست کیا جائے جو حال ہی میں وقوع پذیر ہوئی تھیں۔

ضمیر اور حب الوطنی پیسے سے نہیں خریدے جاتے؛ پیسہ صرف کرایے کے سپاہی خرید سکتا ہے اور انہیں ان دی گئی بخششوں سے محض یہی ملے گا۔ اسٹابلشمنٹ کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ یہ کبھی نہیں سیکھتی اور یہ پیسے کو ہر مرض کی دوا سمجھتی ہے، لیکن اس پر کسی کو کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ وہ لوگ جو لکشمی دیوی کی پوجا کرتے ہیں انہیں لگتا ہے کہ سب لوگ ان کے ہم مذہب ہیں۔ یہ پیشکش

بھی اسی سوچ کا نتیجہ ہے کیونکہ جو لوگ یہ پیشکش کر رہے ہیں، پیسے کے لیے جیتے اور مرتے ہیں؛ ان کا ماننا ہے کہ سب اسی بیماری میں مبتلا ہیں اور وہ پیسے کی پیشکش کرنا جاری رکھتے ہیں، ان کا اپنا پیسہ نہیں، حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی جو اعلیٰ آدرشوں کے لیے جیتے ہیں۔

یہ پیشکش، جیسا کہ کاملاً مضحکہ خیز ہے، صرف بلوچستان میں اس سفاکانہ کریک ڈاؤن کے ان کے حقیقی نیت کو چھپانے کے لیے ہے جو کہ پہلے سے ہی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ 30 جون کو آواران کے علاقے مشکے میں کی گئی ایک فوجی کارروائی میں ڈاکٹر اللہ نذر کے گھر پر حملہ کیا گیا جس میں ان کے بھائی سفر خان، ان کے بھتیجے سلیمان اور ذاکر بلوچ چند دیگر رشتہ داروں کے ہمراہ قتل ہوئے تھے۔ کسی کو مارنا اور انہیں عسکریت پسند کا لیبل لگانا، صرف یہی جواز پیش کیا جاتا ہے جب کبھی بھی مرنے والے بلوچ ہوں۔ فورسز، خواہ وہ اسٹابلشمنٹ ہو یا اس کے پراکسی، جو کہ بلوچستان میں کام کر رہے ہیں، سزا سے مکمل طور پر مستثنیٰ ہیں اور 27 مارچ 1948ء کے بعد سے وہ قانون سے بالاتر رہے ہیں۔

ہلاکتوں کا سلسلہ جاری ہے لیکن بلوچ جدوجہد ماند نہیں پڑی ہے۔ نواب اکبر بگٹی کا قتل، بالاچ مری کا قتل، دیگر ہزاروں لوگوں کا قتل اور اَن گنت بلوچوں کے اغوا نے بلوچ کی اور بھی زیادہ جوش و ولولے کے ساتھ مزاحمت کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے؛ ان ہلاکتوں سے بھی ایسا ہی ہوگا۔ لوگ موت کے ڈر سے اپنے آدرش ترک نہیں کرتے۔ اس کے برعکس، یہ انہیں اور بھی پرعزم بنا دیتے ہیں۔ اسی سے لوہے میں پختگی آتی ہے اور تاریخ رقم ہوتی ہے۔

بوستان میں سعدی کی حکایت میں، ایک بادشاہ جو اپنے شہر میں درویشوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں فکر مند ہوتا ہے، اپنے وزیر کو سونے کے سکوں کا ایک تھیلا دیتا ہے اور اسے درویشوں میں تقسیم کرنے کے لیے کہتا ہے۔ اگلے روز وزیر نے سونے کے سکوں کا تھیلا اسی طرح واپس لوٹا دیا۔ بادشاہ نے وضاحت طلب کی۔ وزیر نے کہا: ''اے بادشاہ، مجھے ایک بھی درویش نہیں ملا۔'' طیش میں آئے بادشاہ نے کہا، ''بلاشک میں جانتا ہوں کہ یہاں درجنوں رہتے ہیں۔''

وزیر نے کہا: ''اے بادشاہ، وہ جو درویش تھے پیسہ نہیں چاہتے اور وہ جو پیسہ چاہتے تھے وہ درویش نہیں تھے تو میں نے انہیں کچھ نہیں دیا۔'' لہٰذا وہ لوگ جو اس غلیظ پیسے کو قبول کریں گے یقیناً یہ وہ لوگ نہیں ہیں جنہیں بلوچستان سے کوئی محبت ہے اور بے شک انہیں پاکستان سے بھی کوئی محبت نہیں ہوگی؛ ان کی وفاداری پیسے سے ہے۔ جہاں تک اصلی درویشوں کی بات ہے تو وہ ان پیسوں پر نظر تک نہیں ڈالیں گے۔

حکومت خان کلات میر سلیمان داؤد جان کی طرف سے اس کے وفد کے ساتھ مذاکرات پر اتفاق کرنے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے اور انہیں بلوچستان کے نمائندے کے طور پر پیش کر رہی ہے کہ گویا وہ ان لوگوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں جو 27 مارچ 1948ء کے بعد سے ناانصافیوں کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں، اپنی جدوجہد ترک کر دیں گے۔ وہ دونوں لحاظ سے غلط ہیں؛ خان کلات ان ہی کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے اثر و رسوخ کے دائرے میں ان کا اپنا خاندان تک شامل نہیں ہے۔ لوگ سوچ رہے ہیں کہ ان کو عام معافی کے کس زمرے میں شامل کیا جائے گا؛ 15 لاکھ روپے والے میں یا 10 لاکھ روپے والے میں۔

تفنن برطرف، کچھ لوگ پوچھتے ہیں کہ وہاں بات کرنے اور مسائل کو حل کرنے کے لیے کون موجود ہے؟ جی ہاں، نواب خیر بخش مری نہیں رہے لیکن وہ کبھی بھی مذاکرات نہ کرتے۔ خان کلات کو بلوچ کے ترجمان اور مصالحت کے چہرے کے طور پر پیش کرنا بلوچ کو ان ناانصافیوں کو قبول کرانے، جو انہوں نے بھگتی ہیں اور بھگتیں گے، کی ایک لنگڑی لولی پاکستانی کوشش ہے۔ بلوچ اپنی بے پناہ قربانیاں کسی بھی خان یا سردار کی سودے بازی کے لیے استعمال نہیں ہونے دیں گے۔

سعدی شیرازی کہتے ہیں:

''اگر از جہان، ہما شود معدوم
کس نہ رود زیرِ سایہء بوم

اگر دنیا سے معدوم ہما ہو جاوے
تو کوئی الو کے زیر سایہ نہ جاوے''

وہ دور اب نہیں رہا جب سردار اور خان سیاسی اور سماجی تعلقات کا تعین کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں کوئی خوددار بلوچ نہ پیسہ قبول کرے گا اور نہ ہی کسی ایسے شخص کو قبول کرے گا جو ذاتی مفادات کی خاطر اپنے آپ کو رہن کرنے کے لیے تیار ہو، ان بے پناہ قربانیوں کے بدلے جو انہوں نے اپنے مادرِ وطن کے لیے دی ہیں۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 5 جولائی 2015

http://dailytimes.com.pk/opinion/05-Jul-2015/can-t-buy-me-love

چند سوالوں کے جواب

بلوچستان توجہ کا مرکز ہے لیکن بلوچ اور ان کی خواہشات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ چین، پاکستان اقتصادی راہداری (سی پی ای سی/سی پیک) چین، پاکستان اور فطری طور پر باقی دنیا کی دلچسپی کا مرکز ہے جیسا کہ سب اسے اسٹریٹجک اور اقتصادی فوائد اور نقصانات کے مطابق دیکھ رہے ہیں جو ان کے لیے اس سے وابستہ ہیں۔ دوسروں کے لیے یہ کسی بھی طرح کی اہمیت کا حامل ہو، بلوچ کے لیے یہ نہایت اہم ہے جن کی زندگی یہ 'ترقی' کے نام پر تباہ کر دے گی۔ سی پیک چین کے لیے اسٹریٹجک حوالے سے اور پاکستان کے لیے بطور اس منصوبے کے تکمیل کنندہ کے نہایت اہم ہے لیکن ان کے خیالات بلوچ سے مختلف ہیں جنہیں عام طور پر اس کی راہ میں حائل رکاوٹ کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

چین اس منصوبے پر اپنی رقم اور رتبے کو خطرے میں ڈال رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ جاننا چاہتا ہے کہ بلوچ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ حال ہی میں مجھ سے اس سلسلے میں کچھ سوالات پوچھے گئے۔ ان کے جواب مندرجہ ذیل ہیں:

سی پیک کے بارے میں بلوچ کی رائے کیا ہے؟

بلوچ سی پیک کو کسی امید افزا شے کے طور پر نہیں دیکھتے کیونکہ وہ اسے ایک ایسے آلے کے طور پر دیکھتے ہیں جو ترقی کے بہانے بلوچوں کو ان کے حقوق سے محروم کرے گا۔ بلوچ عوام کو اس بات کا ادراک ہے کہ سی پیک بلوچستان میں باہر کے لوگوں کی بے تحاشا آمد کے سبب ان کی اکثریت کو خطرے میں ڈال دے گی اور یہ ان کی تمام سیاسی، اقتصادی اور سماجی حقوق کے لیے موت کی گھنٹی ثابت ہوگی، جن کے لیے انہوں نے جدوجہد کی ہے اور بہت قربانیاں دی ہیں۔

بلوچ کے خدشات بے بنیاد نہیں ہیں۔ صدر شی ین پنگ کی طرف سے توانائی کوریڈور کے منصوبوں کے لیے 46 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کے وعدے کے بعد یہ بلوچ کی زندگی اور بلوچ حقوق کے لیے اتنے بڑے سنگین خطرے کے طور پر مجسم ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ اس کی وجہ سرمایہ کاروں کو ان کے کامل منافع کی ضمانت دینا تھا جس کے لیے پاکستانی اسٹابلشمنٹ نے بلوچ کے خلاف شدید کریک ڈاؤن کا وعدہ کیا ہے جو اپنے وسائل کے استحصال کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

ان کے خلاف اپنے کریک ڈاؤن کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے پاکستانی فوج نے اپنی فوج کی نو بٹالینوں اور سویلین فورسز کی چھ بٹالینوں پر مشتمل ایک اسپیشل سیکورٹی ڈویژن (ایس ایس ڈی) کے قیام کا اعلان کیا ہے اور یہ کہ فوج اپنے آپریشن ضربِ عضب (شمالی وزیرستان میں جو فوجی آپریشن جاری ہے) کی بلوچستان تک توسیع کر سکتا ہے۔ یہ اقدامات بلوچستان میں جبر میں شدت آنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پہلے سے ہی مشکے، آواران اور دیگر مقامات پر انتہائی نوعیت کے تشدد کے واقعات ہوئے ہیں۔ بلوچ عوام سی پیک کو اپنے مفادات اور مستقبل کے خلاف نہایت ضرر رساں، نقصان دہ اور منحوس سمجھتے ہیں۔

بلوچ عوام سی پیک اور خاص طور پر گوادر کی ترقی سے کیا چاہتے ہیں؟

وہاں پر بلوچ عوام ہیں اور وہاں پر بلوچ لوگ ہیں؛ ڈاکٹر عبدالمالک جیسے اور ان کی طرح کے لوگ صرف سی پیک کی تلچھٹ میں سے ایک حصہ چاہتے ہیں جو کہ بلوچ کا حصہ ہوگا، اس کثیر منافع میں سے جس کی چین اور پاکستان توقع کر رہے ہیں۔ اور پھر وہاں پر بلوچ عوام ہیں جنہوں نے 27 مارچ 1948ء کو پاکستان کی طرف سے بلوچستان کے غیر قانونی الحاق کے خلاف مزاحمت کی ہے اور تب سے ترقی اور بہتری کے نام پر اپنے حقوق پر تجاوز اور بے جا مداخلت کے خلاف مزاحمت کی ہے۔

بلوچ عوام نے سی پیک سے پہلے گوادر کی نام نہاد ترقی کی مخالفت کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ

باہر کے لوگ اسے ان کے لیے دلدل بنا دیں گے۔ انہوں نے وہاں زمینوں پر قبضے کی شروعات دیکھی اور انہیں ڈر تھا کہ اس سے وہاں کی آبادیاتی خصوصیات کا توازن مکمل طور پر بگڑ جائے گا اور انہیں بے دست و پا کر دے گا۔ گوادر کے حوالے سے بلوچ نے اپنی ناراضی کو محض الفاظ تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے عملی طور پر اس کے خلاف مزاحمت کی ہے اور یہ عمل خود گوادر کی ترقی پر ان کے مؤقف کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے۔

چینیوں کی جانب بلوچ عوام کے احساسات کیا ہیں؟

بلوچ عوام فطری طور پر ان سب کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو بلوچ عوام کے مقابلے میں پاکستان کی یا تو فوجی یا اقتصادی حوالے مدد کرتے ہیں؛ یہ بدگمانی اور نفرت چین اور امریکہ دونوں کی جانب بلوچستان میں ان کے کردار کے حوالے سے پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ چین بلوچستان میں تیزی سے سرگرم ایک سرمایہ کار بن چکا ہے، اس کے خلاف یہ نفرت بڑھی ہے اور ترقی کے نام پر پاکستان کی طرف سے جن مظالم کا ارتکاب کیا جا رہا ہے، لوگ انہیں سی پیک کے سبب چین سے منسوب کر رہے ہیں۔

سینڈک کے تانبے اور سونے کی کانوں میں چینیوں کے ملوث ہونے کو بھی ہمیشہ عداوت کی نظر سے دیکھا گیا ہے چونکہ اسے بلوچ عوام کو ان کے وسائل سے محروم کرنے اور اس کے بدلے انہیں کچھ بھی نہ ملنے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ سینڈک اور اس کے اردگرد بسنے والے مقامی لوگوں کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ کان کنی سے پیدا ہونے والے ماحولیاتی خطرات کے خوف نے بلوچ کے دل میں چین کے لیے ذرّہ بھر بھی محبت پیدا نہیں کی ہے۔

بلوچ عوام پاکستانی حکومت کو اپنے خدشات اور گزارشات کس طرح سے پہنچا رہے ہیں؟

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ وہاں پر بلوچ عوام ہیں اور وہاں پر بلوچ لوگ ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمالک جیسے لوگ پاکستانی حکومت کی طرف سے کی گئی کسی بھی ایسی کارروائی پر سوال نہیں اٹھاتے ہیں جو بلوچ مفادات کے لیے نقصان دہ ہوں کیونکہ انہیں اپنے ذاتی مفادات اور فوائد کی

دیکھ بھال کرنا ہوتی ہے۔ وہ یقیناً منفی تبصرے کرتے رہتے ہیں جیسا کہ عبدالمالک نے سی پیک کے راستے کے بارے میں کیا تھا لیکن یہ محض سیاسی مفادات کے لیے دکھاوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بے اختیار اور بے اثر ہیں کیوں کہ بلوچستان میں فیصلہ سازی کے عمل میں ان کا کوئی کردار نہیں ہے۔

دیگر لوگ جو ترقی کے نام پر بلوچ وسائل کے استحصال کی مکمل طور پر مخالفت کرتے ہیں انہیں اپنے خیالات تک پیش کرنے کی اجازت نہیں ہے اور وہ کارکن جو ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں غائب کر دیے جاتے ہیں؛ ہزاروں لاپتہ ہو چکے ہیں اور ان میں سے تقریباً 3000 ہلاک کر کے پھینک دیے گئے ہیں۔ بلوچ حقوق کے مسائل کو سامنے لانے والی تمام ویب سائٹس پر پابندی عائد ہے۔ بلوچ عوام کی حالتِ زار کو اجاگر کرنے کے لیے لاہور، کراچی وغیرہ میں سیمیناروں کے اہتمام کو سرکاری طور پر منسوخ کر دیا جاتا ہے تو پھر واحد راستہ اس کے خلاف عملی مزاحمت کا رہ جاتا اور یہی وہ کر رہے ہیں۔

گوادر چینیوں کے لیے بہت اہم ہے۔ یہ بلوچستان کے عوام کے لیے کس قدر اہم ہے؟

گوادر کسی کے لیے اتنا اہم نہیں ہو سکتا جتنا کہ یہ بلوچ عوام کے لیے ہے۔ چین کے گوادر میں اسٹریٹجک اور اقتصادی مفادات تو ہو سکتے ہیں لیکن بلوچ کے لیے یہ ان کا مادرِ وطن ہے۔ اس کے علاوہ، وہ محسوس کرتے اور سمجھتے ہیں کہ گوادر لاینحل طور پر ان کے مستقبل کی خوشحالی سے منسلک ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ماضی میں اس پر تجاوزات کے خلاف مزاحمت کی ہے اور اب بھی مزاحمت کر رہے ہیں۔ گوادر کی زمینوں پر قبضہ اس وقت شروع ہوا جب سال 2000ء میں اس کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی شروع کی گئی اور یہ اس قدر بے قابو تھی کہ لوگوں کو زمین خریدنے کے لیے مدعو کرنے کے بل بورڈز لاہور میں دیکھے جا سکتے تھے۔ تاہم، یہ بلوچ عوام کی طرف سے کی جانے والی مزاحمت تھی جس نے بالآخر اسے روکا۔ گوادر میں زمینوں پر اس قبضے نے بلوچ کو بلوچستان میں سی پیک کے راستے میں پیدا ہونے والے ان حالات کی بابت بیدار کیا جس سے ان

کے لیے وہ سنگین نتائج برآمد ہوتے جو انہیں ایک معمولی اقلیت میں تبدیل کر کے رکھ دیتے۔ بلوچ عوام چاہتے ہیں ہر کوئی یہ بات جان لے کہ وہ بہ آسانی اپنے مستقبل یعنی گوادر سے دستبردار نہیں ہوں گے، کسی کے لیے بھی نہیں، نہ تو پیسے سے اور نہ ہی وحشیانہ طاقت کے استعمال سے اور ان دونوں کا پاکستان کی طرف سے بے دریغ استعمال کیا جا رہا تا کہ وہ اس سے دستبردار ہو جائیں۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 12 جولائی 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/

12-Jul-2015/a-few-questions-answered

بدبودار کنواں

حال ہی میں ایک دوست کراچی گیا اور اسے پہلے کی نسبت زیادہ پرامن دیکھنے پر اس کی تعریف کی۔ تاہم میں نے ان سے کہا کہ یہ ظاہری امن عارضی ہے اور یہ کہ کراچی اس سے بھی زیادہ خطرناک اور شیطانی بن جائے گا۔ اسی سبب تمام جگہیں مزید خطرناک اور شیطانی بن جائیں گی کیونکہ جو سخت اور ظالمانہ اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں یہ نہ اس مسئلے کی نشاندہی کر رہے ہیں اور نہ ہی ان حالات کو تبدیل کر رہے ہیں جو اس گہری سڑاند کے ذمہ دار ہیں جو کہ اس معاشرے کی انتڑیوں تک کو نگلتی جا رہی ہیں جس نے اب اپنے آپ کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور یہ مزید افراتفری، تشدد، عدم برداشت، جرائم، بدعنوانی، نفرت اور بے حسی کی دلدل کی عمیق گہرائیوں میں دھنستی چلی جا رہی ہے۔ جن طاقتوں سے اسے ٹھیک کرنے کی توقع کی جاتی ہے وہ دعوائے اتقا کے تکبر میں مبتلا ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گویا وہ برحق و برگزیدہ ہیں اور اس بے خبری کے عالم میں بہ سوئے تباہی گامزن ہیں جو کہ اس تکبر کا فطری نتیجہ ہے۔ جنہیں حالات میں بہتری لانی ہے یہ وہی لوگ ہیں جن کے مفادات اپنے مادی فوائد کے لیے حالات کو اسی طرح رکھنے میں مضمر ہیں۔

وضاحت کرنے کے لیے میں نے انہیں بدبودار کنویں کی حکایت سنائی۔ ایک بلی گاؤں کے کنویں میں جا گری اور مر گئی۔ دیہاتی پانی کو پاک کرنے کے طریقے جاننے کے لیے ایک دانا کے پاس گئے۔ اس نے انہیں اسے حلال (صاف) کرنے کے لیے 100 بالٹی بھر پانی نکال بہانے کے لیے کہا۔ اس کے باوجود بدبو برقرار رہی تو اس نے مزید 100 بالٹی بھر پانی نکال بہانے کا مشورہ دیا اور پانی نکال بہایا گیا مگر پھر بھی پانی کی بدبو ساتویں آسمان پر تھی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا کہ آیا انہوں نے وہ مردہ بلی نکالی تھی تو انہوں نے جواب نفی میں دیا۔ اس نے کہا جب تک وہ بلی وہاں رہے گی پانی نکال بہانا لاحاصل ہے۔ یہاں پر بھی معاملہ بالکل ویسا ہی ہے، جیسا کہ

ماورائے عدالت قتل کر کے بھری بالٹیاں نکال بہائی جارہی ہیں لیکن بلی، ایک مسخ شدہ نظام، اپنی جگہ موجود ہے، تو لہٰذا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلے گا۔ ماورائے عدالت قتل بظاہر امن لے آیا ہے لیکن افراتفری اور تشدد کے بنیادی اسباب محکم طور پر اپنی جگہ موجود ہیں۔ بدبودار کنویں سے بدبو آرہی ہے اور ہمیشہ آتی رہے گی۔

مقتدرہ (اسٹابلشمنٹ) کا تمام اقسام کے مسائل کو حل کرنے کا طریقہء انتخاب فوج اور پولیس کے ہاتھوں ماورائے عدالت قتل، پھانسیاں، بمباری، لوگوں کی بے گھری اور جعلی مقابلے کروانا ہے۔ اگرچہ سزا سے مکمل استثنیٰ اور چھٹکارا جو اسے حاصل ہے، اس تعداد پر کوئی روک ٹوک نہیں جتنی کہ یہ بلاخوف وخطر مار سکتا ہے، جیسا کہ 1971ء واقعات اور چین پاکستان اقتصادی راہداری (سی پی ای سی/سی پیک) کی راہ میں کسی بھی ممکنہ رکاوٹ کو صاف کرنے کے لیے بلوچستان میں فوجی کارروائیاں ثابت کرتی ہیں، وہ سب کو نہیں مار سکتے، خاص طور پر جب وہاں مارے گئے لوگوں کی جگہ لینے کے لیے دوسرے ہمیشہ موجود ہوں۔ لہٰذا یہ اقدامات نہ کراچی میں امن لائیں گے اور نہ ہی بلوچستان یا وزیرستان اور فاٹا میں کیونکہ تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے زیادہ جابرانہ حکومتیں اور سلطنتیں بھی خود کو طاقت کے ذریعے برقرار رکھنے کے قابل نہیں رہی ہیں۔

'اسٹابلشمنٹ' کی اصطلاح وضاحت طلب ہے۔ ہیرالڈ مونوزر پورٹ نے اسٹابلشمنٹ کی وضاحت اس طرح سے کی ہے: ''پاکستان میں اسٹابلشمنٹ کی اصطلاح کو عموماً ان لوگوں سے منسوب کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو فی الحقیقت طاقت واختیارات کا استعمال کرتے ہیں؛ اس میں فوجی ہائی کمان اور انٹیلی جنس ایجنسیاں، سیاسی جماعتوں کی اعلیٰ قیادت کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ اتحاد میں کام کرنے والی بیوروکریسی اور کاروباری افراد کے اعلیٰ درجے کے ارکان شامل ہیں۔ فوجی ہائی کمان اور انٹیلی جنس ایجنسیاں اس کی اساس کی تشکیل کرتے ہیں اور اس کے سب سے مستقل اور بااثر جزوِ ترکیبی ہیں۔'' سیاست دان، بیوروکریسی، عدلیہ اور، بے شک، میڈیا اسٹابلشمنٹ کا لازمی جزو ہیں۔

حال ہی میں جاری کردہ پاکستان انسانی حقوق کمیشن (ایچ آر سی پی) کے موجودہ سال کے

اعداد وشمار یہی دکھاتے ہیں کہ پہلے چھ ماہ میں کراچی میں 255 مشتبہ افراد پولیس مقابلوں میں مارے گئے ہیں جس سے 2014ء کے دوران ہلاکتوں کے تناسب میں 64 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے 217 افراد پولیس مقابلوں میں مارے گئے ہیں جب کہ 38 نیم فوجی اہلکاروں کے ساتھ مقابلوں میں۔ ستمبر 2013ء میں جب سے کراچی میں سکیورٹی آپریشن شروع ہوا ہے، ہلاکتیں بڑھی ہیں۔ سرکاری اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ 2014ء میں کراچی میں پولیس اور رینجرز کے ہاتھوں 925 مشتبہ افراد ماورائے عدالت ہلاک ہوئے۔ لاہور میں دسمبر 2014ء کے بعد سے 100 مقابلے ہوئے ہیں۔ مارچ میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل (ڈی آئی جی) حیدرآباد پولیس ثنااللہ عباسی نے کہا کہ ماورائے عدالت قتل کو باضابطہ طور پر جائز قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن جرائم کے خاتمے اور سڑکوں کو زیادہ محفوظ بنانے کے لیے معاشرے کو پولیس کے اس 'طریقہ کار' کو قبول کرنا پڑے گا۔

لہٰذا، ذرا غور وفکر کریں: اگر یہ ماورائے عدالت ہلاکتیں (پڑھئے قتل) عوام کی نظروں کے سامنے سزا سے مکمل استثنیٰ کے ساتھ ہورہی ہوں تو پھر تصور کریں کہ بلوچستان اور وزیرستان میں کیا صورتحال ہوگی جہاں میڈیا پر پابندی لگی ہوئی ہے۔ سپریم کورٹ نے اگست 2013ء میں کہا تھا کہ اس کے پاس لاپتہ افراد کے مقدمات کے حوالے سے فرنٹیئر کور (ایف سی) کے خلاف کافی ثبوت موجود ہیں۔ شمالی وزیرستان سے دس لاکھ افراد بے گھر ہوئے ہیں اور کیمپوں میں پژمردہ زندگی گزار رہے ہیں اور جب وہ احتجاج کرتے ہیں تو فوج کی طرف سے ان پر فائرنگ کی جاتی ہے۔ جب نواب اکبر خان بگٹی قتل ہوئے تو تقریباً 178,000 بگٹی بے گھر ہوئے اور حالانکہ سپریم کورٹ نے ان کی واپسی کا حکم تو دیا تھا مگر مارچ 2014ء میں ایف سی کی طرف سے انہیں واپس لوٹنے سے روکا گیا۔

ماورائے عدالت قتل اور فوجی کارروائیاں حقیقی مسائل حل نہیں کرتے۔ لوگوں کے لیے ایک معقول زندگی بسر کرنے کی خاطر بڑھتی ہوئی آبادی کے موجودہ وسائل پر دباؤ کی وجہ سے دستیاب مواقع گھٹتے جارہے ہیں اور نئے مواقع پیدا کرنا نہ ہونے برابر ہے۔ فرض کریں کہ اگر ترقی چار گنا

بھی ہوجائے تو تب بھی یہ ناکافی رہے گی اور جرائم پیشہ، مذہبی مافیا اور عام طور پر لوگ ان محدود دستیاب وسائل پر لڑتے رہیں گے۔ خواہ بہت سارے لوگ آج مار دیے جائیں لیکن وہاں ہمیشہ دیگر لوگ اسی راستے پر چلنا جاری رکھیں گے کیوں کہ بلی اب بھی کنویں میں پڑی ہوئی ہے۔ ان مسائل کے بنیادی اسباب سے نمٹنے کے لیے اساسی طور پر کچھ بھی نہیں کیا جا رہا ہے۔

بلوچ عوام 27 مارچ 1948ء کے بعد سے اس کے حاصل کنندگان ہیں اور انہیں غدار، علیحدگی پسند، غیر ملکی ایجنٹ، ترقی مخالف جیسی مختلف قسم کی لاٹھیوں کے ساتھ پیٹا گیا ہے۔ اسٹابلشمنٹ، جو کہ اپنی طاقت اور جہالت سے اندھی ہے، نوشتہ دیوار پر توجہ نہیں دے رہی ہے اور ان لوگوں کو کچلنے کے لیے طاقت کا وحشیانہ استعمال جاری رکھے ہوئے ہے جو اپنے حقوق کو پامال کرنے اور اپنے وسائل کا استحصال کرنے کی اجازت دینے سے انکاری ہیں۔

بلوچستان، خاص طور پر آواران، مشکے کے علاقے اس وقت سب کے لیے ممنوعہ ہیں، جہاں سے روزانہ فوجی کارروائیوں کی رپورٹیں آ رہی ہے۔ سی پیک کے منافع بخش سودے نے ہر اس چیز کو نیست و نابود کرنے کے لیے اسٹابلشمنٹ کی حوصلہ افزائی کی ہے جو ان کے چینی دوستوں کے لیے مسائل پیدا کر سکتی ہو۔ 30 جون کے مشکے آپریشن میں ڈاکٹر اللہ نذر کے بھتیجے سلیمان بلوچ (عرف شیہک بلوچ) نے زخمی ہونے کے بعد اپنے خاندان اور دوستوں کے لیے ایک پیغام ریکارڈ کروایا۔ اگرچہ ان کے لیے موت یقینی تھی، اپنے دوستوں کو اپنی جدوجہد ترک نہ کرنے کے لیے کہا۔ مرنے کے بعد ان کی لاش کو مسخ کیا گیا۔ ان کے پیغام کی ویڈیو بہت جلد دنیا بھر میں پھیل گئی اور اسے بلوچ مخالف سائبر ہیکرز کی طرف سے ہٹا دیا گیا۔ یہاں تک کہ اگر ہزاروں کی تعداد میں بھی لوگ مار دیے جائیں، مسئلہ کہیں نہیں جائے گا جیسا کہ بلی کنویں میں ہی رہے گی۔ مزید برآں، وہ لوگ جن کے درمیان شیہک جیسے موجود ہوں گے انہیں بہ آسانی دبایا نہیں جا سکتا۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 26 جولائی 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/26-Jul-2015/the-stinking-well

ویران کن وبا

مشہور ببر شیر سیسل جو زمبابوے کے ہوانگ نیشنل پارک میں رہتا تھا، جولائی کے اوائل میں مارا گیا۔ اسے بہلا پھسلا کر پارک سے باہر لایا گیا، اسے تھیو برونکہورسٹ نامی ایک شکاری اور مینیسوٹا سے تعلق رکھنے والے ایک مقامی کسان آنیسٹ ٹریمور انڈلووو کی مدد سے ایک امریکی دندان ساز والٹر جیمز پامر نے آڑی کمان کے ساتھ زخمی کر دیا۔ 40 گھنٹوں کی کھوج کے بعد پامر نے آخر کار اسے مار ڈالا۔ پامر نے اسے مارنے کے لیے تقریباً پچاس ہزار امریکی ڈالر خرچ کیے۔ جب یہ خبر پھیلی تو دنیا اس کے خلاف یک زبان ہو کر کھڑی ہوگئی اور زمبابوے کے صدر موگابے کے نام ایک درخواست دائر کی گئی جس میں پامر کو سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا، چند گھنٹوں کے اندر اندر اس پر 164,500 سے زائد افراد نے دستخط کیے۔ افسوس کی بات ہے کہ یہاں حتیٰ کہ جب انسان مارے جائیں تو تب بھی اس کے خلاف کوئی کسی کو نہیں اکساتا۔

اس زیادتی پر ترقی یافتہ دنیا کے ردِعمل کو غیر حقیقی اہمیت کا حامل نہیں گردانا جا سکتا کیونکہ وہاں پر لوگ اکثر ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے عراق جنگ کے خلاف فروری 2003ء میں احتجاج کیا اور اپنی مخالفت کے اظہار میں لاکھوں لوگوں نے مارچ کیا، اگرچہ ان مظاہروں کو اُن لوگوں کی طرف سے نظر انداز کیا گیا جنہیں اس جنگ سے مادی فوائد حاصل ہو رہے تھے۔

پاکستان پر بلوچ سیاسی کارکنوں کو قتل کر کے پھینکنے کا الزام ہے اور اب یہ اسی حکمت عملی کے ساتھ سندھ میں مسائل حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کے سبب بلوچ عوام اس سے برگشتہ ہیں۔ 80 سالہ عطا محمد بھمبرو صاحب، جو اپنی 40 کتابوں کے کریڈٹ کے ساتھ سندھ کے ایک ممتاز مصنف اور مؤرخ ہیں، کے 40 سالہ فرزند داہر ڈہیسر عرف راجہ داہر کو 4 جون 2015ء کو ضلع

خیر پور کے گاؤں بچل بھمبرو سے اغوا کیا گیا۔ اغوا کار 50 سے زائد گاڑیوں میں آئے تھے۔ بھمبرو صاحب نے اس غیر قانونی گرفتاری کو رپورٹ تو کیا لیکن پولیس نے اس کو رجسٹر کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد انہوں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان کا بیٹا، بے شک، ایک سیاسی کارکن ہے دہشتگرد نہیں۔

راجہ داہر مہران یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی سے ماسٹر کی ڈگری کے ساتھ ایک پیشہ ور ماہر ارضیات تھے اور اس کے علاوہ سندھی قوم پرست جماعت جیے سندھ متحدہ محاذ (جسمم) کے جوائنٹ سیکرٹری بھی تھے۔ انہوں نے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے لانگ مارچ کی بہت حمایت و معاونت کی جب یہ ماما عبدالقدیر کی قیادت میں اسلام آباد کی جانب پیدل چلتے ہوئے سندھ سے گزرا تھا۔ جسمم اس وقت پاکستانی اسٹابلشمنٹ کی طرف سے کیے جانے والے سفاکانہ کریک ڈاؤن کا ہدف ہے اور اس کے 40 اراکین کی لاشیں ان کی غیر قانونی حراست کے بعد مل چکی ہیں۔

کامریڈ حسین بخش تھیبو، ایک آزمودہ کار سندھی قوم پرست، نے 26 جون کو کراچی پریس کلب کے باہر اس غیر قانونی اغوا کے خلاف احتجاج کی کال دی تھی۔ اس کے ایک ماہ بعد، 26 جولائی کو راجہ داہر لاپتہ نہیں رہے جیسا کہ ان کی لاش ان کی کھوپڑی میں ماری گئی دو گولیوں کے ساتھ نوری آباد کے قریب پائی گئی؛ پولیس نے ان کی انگلیوں کے نشان نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) کو بھیجیں جس سے ان کی شناخت کا انکشاف ہوا۔ انصاف اب اسٹابلشمنٹ کی حکمرانی کا حصہ نہیں رہا۔ وہ ان افراد کے قتل کا ارتکاب کرتے ہیں کیونکہ انہیں اس سے بریت حاصل ہے۔

اسٹیبلشمنٹ کو حاصل سزا سے استثنیٰ کے ساتھ راجہ داہر نہ پہلے شخص ہیں اور نہ ہی وہ آخری ہوں گے۔ شہید سرائے قربان خہاور، جو کہ جسمم کے سینئر نائب چیئرمین تھے اور سندھ کے حقوق کا مطالبہ کیا کرتے تھے، کو قتل کر دیا گیا۔ سندھی قوم کے خلاف کی جانے والی ناانصافیوں اور ان کے وسائل کی لوٹ مار کے خلاف آواز اٹھانے پر انہیں بارہا دھمکیاں موصول ہوئیں مگر وہ مرعوب نہیں

ہوئے۔ 21 اپریل 2011ء کو وہ پارٹی کے تین ارکان، شہید روپلو چولیانی، نور اللہ تنیو اور نادر بگٹی کے ہمراہ معروف سندھی قوم پرست سائیں جی ایم سید کی برسی کے پروگرام کے حوالے سے سندھ کے مختلف شہروں میں منعقد کیے جانے والے کارنر اجلاسوں میں شرکت کے لیے حیدرآباد جا رہے تھے۔ ایک ڈبل کیبن سفید گاڑی ان کا پیچھا کرتی رہی اور جب وہ کھپرو میں بکھوری موری پہنچے تو اچانک ایک اور کار نے سامنے آ کر انہیں روکا اور مسلح افراد نے ان پر فائرنگ کر دی۔ پھر انہوں نے گاڑی پر کچھ کیمیکلز چھڑکے تو روپلو چولیانی اور نادر بگٹی کے ساتھ سرئی قربان خہاور گاڑی میں زندہ جل گئے۔ معجزانہ طور پر نور اللہ تنیو کو گاؤں والوں زندہ نکال لیا جنہوں نے یہ سانحہ دیکھا تھا؛ وہ پولیس کو اپنا بیان ریکارڈ کروانے کے بعد انتقال کر گئے۔

جسمم کے سیکرٹری جنرل مظفر بھٹو 25 فروری 2011ء کو لاپتہ ہوئے۔ ان کی بیوی صائمہ بھٹو نے ان کی بازیابی کے لیے بین الاقوامی برادری اور انسانی حقوق کی تنظیموں سے اپیل کی اور سندھ ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی جس میں انہوں نے ان کی غیر قانونی حراست سے رہائی کے لیے درخواست کی تھی جو کہ بے نتیجہ رہی۔ اس کے بعد 22 مئی 2012ء کو ان کے 42 سالہ شوہر کی لاش حیدرآباد کے قریب پھینک دی گئی۔ جیے سندھ قومی محاذ (جسقم) کے مرکزی رہنما اور جسقم کے مرحوم سابق چیئرمین بشیر خان قریشی کے بھائی مقصود احمد قریشی کو پارٹی کارکن سلمان ودھو کے ہمراہ 21 مارچ 2014ء کو نوشیرو فیروز کے قریب سرائے قربان خہاور جیسے انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ایک روز قبل لاپتہ ہوئے تھے اور اس منحوس دن دیہاتیوں نے ان کی گاڑی کو آگ کی لپیٹ میں دیکھا؛ دونوں کو گولی مار دی گئی تھی۔

ریاست کا ان لوگوں کے خلاف مظالم ڈھانا جو ان کے نقطہءنظر اور من گھڑت نظریے سے اتفاق نہیں کرتے کہ گویا پاکستان کی جغرافیائی حدود کے اندر مقیم افراد وہ قوم ہیں جو اس عدم تحفظ کا منطقی نتیجہ ہے، جسے اسٹابلشمنٹ محسوس کرتی ہے جیسا کہ اسے ڈر ہے کہ لوگوں کی طرف سے ان کے سرکاری نظریے کے خلاف سرکشی ان کی طاقت پر گرفت کو خطرے میں ڈال دے گی جسے وہ اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا ایک تحفہ سمجھتے ہیں۔ اس جہالت کے سبب ان کا ماننا ہے کہ وہ روئے

زمین کے برگزیدوں میں سے ہیں اور اپنی طاقت کا دفاع کرنے کی کوشش میں وہ غلیظ ترین حربے استعمال کرتے ہیں۔ پرسی بیشے شیلی نے کہا تھا کہ ''طاقت، ایک اجاڑ دینے والی ویران کن وبا جیسی ہے، جس چیز کو یہ چھوتی ہے آلودہ کر دیتی ہے۔'' جو طاقت لوگوں کے لیے زہر قاتل ہو یقیناً ایک ''ویران کن وبا'' ہے۔

اس ویران کن وبا کو حوصلہ اس امر واقع سے ملتا ہے کہ یہاں لوگوں کی اکثریت اس کے حقیقی چہرے کو دیکھنے سے انکاری ہے اور مختلف حیلوں بہانوں کے تحت اُس عمل کی حمایت نہ کرنے کے لیے خود کو تسلیاں دیتے ہیں جو کہ صحیح اور برحق ہے یا پھر اس عمل میں حصہ نہیں لیتے جس کا تعلق زندوں اور زندگی سے ہو۔ جس روز میں تھیبو صاحب کی طرف سے کال کیے گئے احتجاج میں شرکت کرنے جا رہا تھا تو شاہراہ پر میں نے کئی بسیں چھت تک کھچا کھچ بھری ہوئی دیکھیں جو لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں شاہ نورانی کے سالانہ عرس کے لیے 'لاہوت' لے جا رہی تھیں جبکہ افسوس کی بات ہے کہ احتجاج میں بہت کم لوگ آئے۔

میں نے عقیدت مندوں کو قلندر کے عرس اور شاہ بھٹائی کے عرس کے لیے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ اپنے خاندانوں کے ہمراہ بڑی تعداد میں آتے ہیں حتیٰ کہ ننھے بچوں کے ساتھ سفر کی مشکلات جھیلتے ہیں اور بڑی خوشی سے مزاروں پر رہتے ہیں؛ وہ قابلِ احترام مُردوں کو تو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں مگر زندوں کے مسائل سے غافل ہیں۔ جب تک کہ یہاں لوگ زندوں کی قیمت پر مردوں کے لیے جیتے رہیں گے، یہ اجاڑ دینے والی ویران کن وبا، جس سے سب متاثر ہیں، ناقابلِ تسخیر اور مہلک رہے گی۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 2 اگست 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/02-Aug-2015/desolating-pestilence

اکّڑ ہو یا بکّڑ دونوں ایک

مورخہ 3 اگست کے سینیٹ اجلاس کے دوران پختونخوا ملی عوامی پارٹی کے سینیٹر عثمان کاکڑ نے فرنٹیئر کور (ایف سی) اور ہرنائی میں کوئلے کی کانوں کے لیز مالکان کے درمیان دستخط ہونے والے ایک معاہدے اور مؤخر الذکر پر ایف سی کی طرف سے ٹیکس کے نفاذ کی ایک تحریک پر بحث شروع کی۔ انہوں نے ایف سی پر الزام لگایا کہ ''وہ حکومتِ بلوچستان کے معاملات میں بے جا مداخلت کر کے صوبائی خودمختاری میں دخل انداز ہو رہی ہے'' اور انہوں نے مزید کہا کہ اگرچہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عبدالمالک نے اس معاہدے کے ''غیر قانونی'' ہونے کا اعلان تو کیا تھا لیکن ایف سی اب بھی تحفظ کی رقم کے طور پر فی ٹن کوئلے پر 220 روپے وصول کر رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کے فرحت اللہ بابر نے کہا کہ ایف سی صوبائی حکومت کی ہدایات کی نافرمانی کر رہی ہے اور ''ماورائے آئین اقدامات'' اٹھا رہی ہے۔ انہوں نے ان ایف سی افسران کے خلاف کارروائی کا بھی مطالبہ کیا جنہیں عدالتوں میں لاپتہ افراد کے رشتہ داروں کی طرف سے نامزد کیا گیا تھا۔ داخلہ کے وزیر مملکت بلیغ الرحمان نے کہا کہ بلوچستان حکومت نے معاہدے کے بارے میں وفاقی حکومت سے کوئی باضابطہ شکایت نہیں کی ہے اور صوبائی محکمہ کانکنی کے حکام معاہدے پر دستخط کی تقریب میں موجود تھے۔

ایسا لگتا ہے کہ بلیغ الرحمٰن صاحب کو یا تو اس بابت بتایا نہیں گیا یا پھر وہ جان بوجھ کر احتیاط برت رہے ہیں کیوں کہ 15 جنوری کو شائع ہونے والی ایک نیوز رپورٹ میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ بلوچستان حکومت نے صوبے کے ضلع ہرنائی میں سیکورٹی کی فراہمی کے لیے کوئلے کی کانوں کے مالکان اور ایف سی کے درمیان دستخط شدہ معاہدوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ ضلع ہرنائی میں کوئلے کی تقریباً 250 کانیں ہیں۔ ان معاہدوں کے تحت تحفظ کی رقم کے طور پر کوئلے کے فی ٹن پر ایف

سی کو 220 روپے کی ادائیگی کی جارہی ہے۔حکومت نے کان مالکان اور سیکورٹی فورسز کے درمیان سیکورٹی فراہم کرنے کے لیے ان معاہدوں کا نوٹس لیا تھا چونکہ سیکورٹی فورسز اور کوئلے کی کانوں کے مالکان کے درمیان کیے گئے یہ براہِ راست معاہدے تحفظات پیدا کر رہے تھے۔ بلوچستان حکومت کی پریس ریلیز میں یہ کہا گیا تھا کہ ''اس طرح کے معاہدوں کو فوری طور پر معطل کر دیا جائے گا۔'' یہ لیجیے جناب بلیغ الرحمٰن صاحب۔

چار ماہ قبل بلوچستان اسمبلی میں قائد حزبِ اختلاف مولانا عبدالواسع نے اس منسوخی کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ضلع ہرنائی کے شاہرغ اور خوست کے علاقوں میں کوئلے کی کانوں کے مالکان اور ٹھیکیداروں کے درمیان معاہدے کی مخالفت علاقے کے لوگوں کے معاشی قتل کے مترادف ہے۔انہوں نے یہ جاننے کا مطالبہ کیا کہ ہرنائی میں کان مالکان اور ایف سی کے درمیان معاہدوں کی مخالفت کیونکر کی جارہی ہے جب کہ ایف سی نے چمالنگ، دکی اور دیگر علاقوں میں اسی طرح کے معاہدے کر رکھے ہیں جو کہ نافذ العمل ہیں۔انہوں نے خبردار کیا کہ اگر ایف سی کو ہرنائی، شاہرغ اور خوست میں کوئلے کی کانوں سے ہٹا دیا گیا تو سب لوگ کوئٹہ اور بلوچستان بھر سے ایف سی کو ہٹانے کا مطالبہ کریں گے۔بعض مالکان اور ٹھیکیداروں کا کہنا ہے کہ انہوں نے رضا کارانہ طور پر ایف سی کے ساتھ سیکورٹی معاہدے کیے ہیں چونکہ ضلعی انتظامیہ سیکورٹی فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے اور خیال ظاہر کیا کہ یہ بھی چمالنگ اور دکی طرز کے معاہدے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہرنائی میں واقع واریزئی زرقون کوئلے کی کانوں کے منصوبے سیکورٹی کی وجہ سے بند کر دیے گئے تھے، ایف سی کے تحفظ کے تحت فروری میں دوبارہ شروع کیے گئے۔

مشکلات میں گھرے مالکان اور ٹھیکیداران کی طرف سے کیا جانے والا یہ دعویٰ کہ فی ٹن کوئلے پر 220 روپے کی قیمت پر تحفظ کی رقم کی ادائیگی کوئلے کی بلا رکاوٹ کانکنی اور مارکیٹنگ کے لیے ان کے اور ایف سی کے درمیان ایک رضامندانہ معاہدہ ہے، جو کہ ایک انتہائی حیرت انگیز امر ہے کیونکہ اسکی افواج کو حفاظت کرنے کے لیے ریاست کی طرف سے تنخواہ دی جاتی ہے۔تحفظ کی رقم کے طور پر اضافی کمائی دراصل 'بھتہ خوری' کے بدصورت لفظ کے لیے محض ایک زیادہ قابلِ

احترام نام ہے جو دوسروں پر قابلِ اطلاق ہے مگر مقدس گایوں پر نہیں۔

آئیں اس معاملے کے کچھ اور پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں۔تخمینوں کے مطابق بلوچستان میں اعلیٰ معیار کے کوئلے کے 217 ملین ٹن کے متوقع ذخائر موجود ہیں جن میں سے 76 صرف ضلع ہرنائی میں ہیں۔ ہرنائی اور زرکون کوئلے کی کانوں میں کوئلے کی یومیہ پیداوار 4000 سے 5000 ٹن ہوسکتی ہے۔صرف یہی ایف سی کو کم از کم دس لاکھ روپے یومیہ اضافی آمدنی دے گی اور اس کا مطلب ہے کہ یہ 365 ملین روپے سالانہ ہڑپ لیتی ہے، یہ بری چیز نہیں ہے جب حب الوطنی کے لیے بھی آپ کی تعریف کی جاتی ہو اور خدمات کی انجام دہی کے لیے سینے ٹھوکنے کی رسم کا بھی باضابطہ مظاہرہ ہوتا ہو۔سال 2013-2014ء میں صرف شاہرغ خوست ہرنائی کوئلہ فیلڈ کی پیداوار 188,389 ٹن تھی جس کے لیے تحفظ کی رقم 41,445,580 روپے ہوگی۔ چمالنگ اور کوئلے کی دیگر فیلڈز سے کتنا پیسہ آتا ہے اس کے بارے میں صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے، کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ تحفظ کی کتنی رقم فی ٹن محصول ہوتی ہے اور وہاں کی پیداوار کتنی ہے۔تاہم، اگر یہ رقم ہرنائی اور زرقون کوئلے کی کانوں کے آس پاس بھی ہو، یہ زیادہ بھی ہوسکتی ہے، تو تب بھی اعلیٰ افسران کو اپنی تجوری میں آنے والی رقم سے کافی خوش ہونا چاہیے۔

ستمبر 2013ء کی ایک رپورٹ میں جہاں کیانی کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا گیا: ''فوج چمالنگ، موسیٰ خیل اور دکی میں کوئلے کی کانوں، کسّاہل ماربل منصوبے اور پنجگور میں کھجوروں کی کاشت کاری کے ترقیاتی سرگرمیوں میں حصہ لے رہی ہے۔'' اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ہر کڑھائی میں ان کی ایک انگلی ہے اور قدرتی طور پر زیادہ تر منصوبوں کو تحفظ کی ضرورت ہے، اور تحفظ ایک قیمت پر ملتی ہے۔کسّاہل ماربل پراجیکٹ کا افتتاح خود جنرل کیانی نے کیا تھا اور اس میں بھی، زرقون واریزئی کوئلے کی کانوں کے منصوبے کی طرح، فوج نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

جو چیز آپ کے لیے جتنی اچھی ہو اسے سب کے لیے بھی یکساں طور پر اچھا ہونا چاہیے لیکن یہاں معاملہ مختلف ہے: دیگر تمام لوگ جو کراچی یا دوسری جگہوں میں تحفظ کی رقم کا مطالبہ کرتے

ہیں انہیں شیطان قرار دیا جاتا ہے اور ان کے لیے ریاست کے پاس رتی بھی برداشت نہیں مگر جب خود ریاستی ادارے تحفظ کے لیے پیسے وصول کریں تو یہ اچانک قابلِ احترام اور حلال بن جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خیبر پختونخوا میں 2010ء کے سیلاب کے دوران فوج نے اپنے 30 ہیلی کاپٹروں کے 1,000 سے زائد چکروں کے کرایوں کی مد میں خیبر پختونخوا حکومت کو 20 ملین روپے کا بل بھیجا جنہوں نے زیرِ آب علاقوں میں 28 جولائی، جس دن سیلاب سب سے پہلے سوات اور مالاکنڈ ڈویژن میں داخل ہوا تھا، تا 4 اگست چکر لگائے۔ ریسکیو آپریشن میں استعمال کیے گئے آٹھ امریکی چنوک ہیلی کاپٹروں کے کرایے بھی ادا کیے گئے۔ سینیٹ کو یہ بتایا گیا کہ 2011ء کے بعد سے 513 ارب روپے 'سویلین ٹوکرے' سے مسلح افواج کے ریٹائرڈ اہلکاروں کو پنشن کی مد میں ادا کیے گئے ہیں اور سال 2000ء سے معاملہ یہی رہا ہے۔ ریسکیو بھی ایک قیمت پر ملتی ہے۔

سعدی شیرازی کی ایک تمثیل بتاتی ہے کہ ایک چرواہے نے بھیڑ کے ایک بچے کو ایک بھیڑیے کے چنگل سے بچا لیا تھا اور وہ ایک نجات دہندہ تصور کیا جاتا تھا لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہ اسے ذبح کرنے کے لیے آیا تو تب بھیڑ کو یہ احساس ہوا کہ اسے کیونکر بچایا گیا تھا۔ یہاں لوگ ہمیشہ یا تو اکّڑ یا پھر بکّڑ کے رحم و کرم پر رہتے ہیں جیسا کہ انہیں چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے جان بخشی کے لیے ان میں سے کسی ایک کو ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ لوگ وہاں کیسے کسی اچھے مستقبل کی امید کر سکتے ہیں جہاں انہیں ایک ایسا منظر نامے کا سامنا ہو جس میں انہیں یا تو اکّڑ یا پھر بکّڑ کی اطاعت اختیار کرنی پڑے؟

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 9 اگست 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/09

-Aug-2015/either-tweedledum-or-tweedledee

آپ جو ہونے دیں گے، وہ جاری رہے گی!

عطاالرحمان نامی ایک شخص، جسے خبروں میں ایک مقامی بزرگ کہا گیا ہے، نے معدومیت کے خطرے سے دوچار پرندے تلور (چرز) کی عرب حکمرانوں کے ہاتھوں سالانہ سیر سپاٹوں کے دوران بلوچستان (جہاں یہ پرندے اپنی ہجرت کے دوران قیام کرتے ہیں) میں نسل کشی پر پابندی لگانے کے حوالے سے دائر درخواست پر سپریم کورٹ میں جو دلیل پیش کی ہے، اگر کم سے کم بھی کہا جائے تو، وہ چونکا دینے والی تھی۔ انہوں نے کہا: ''یہاں پرندوں کے شکار کے لیے آنے والے معززین نے نہ صرف بعض منصوبے قائم کیے ہیں بلکہ موسم کے وقت 50 پرندوں کے شکار پر ایک کروڑ روپے بھی ادا کر رہے ہیں۔ شکار کے ہر موسم میں بلوچستان تقریباً دو ارب روپے کماتا ہے۔'' سپریم کورٹ کی طرف سے انہیں ایک مدعی کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بلوچستان کی غیر فطری بزدل حکومت، جس کی قیادت روز بروز بڑھتی ہوئی شرائط کے زیرِ اطاعت ڈاکٹر مالک کر رہے ہیں، بھی یہی چاہتی ہے کہ یہ قتلِ عام جاری رہے کیونکہ انہیں ان شیوخ کی طرف سے بخشش اور استعمال شدہ گاڑیاں ملتی ہیں۔ 2014ء میں ایک سعودی شہزادے نے چاغی میں 21 روزہ شکار سفاری کے دوران 2100 سے زائد تلور شکار کیے۔ اس نے کتنا پیسہ دیا؟

عطاالرحمان درخواست میں فرماتے ہیں کہ شکار پر پابندی لگانے سے فلاح و بہبود کے منصوبوں کی ایک بہت بڑی تعداد بند ہو سکتی ہیں جن کا مقصد مقامی لوگوں کی زندگیوں کو بہتر بنانا ہے۔ ان میں 26 ہسپتال، مراکزِ صحت اور ڈسپنسریاں، 26 ہاؤسنگ منصوبے، 22 اسکول اور کالج، 32 پانی کی فراہمی کے منصوبے، 41 ٹیوب ویلز، کھلے کنویں، پن چکّیاں، حوض اور نہریں، 43

مساجد، ماحولیات اور جنگلی حیات کے تحفظ کے 16 منصوبے، چار اسلامی ثقافتی مراکز اور قصبوں اور دیہاتوں کو بجلی فراہم کرنے کے پانچ منصوبے شامل ہیں۔ کیا یہ منصوبے اسلام آباد سے بلوچستان پر حکومت کرنے والوں کی ذمہ داری نہیں ہے؟ مبینہ طور پر ان کے دو ارب روپے خرچ کرنے سے اگر یہ ذمہ داری خلیجی شیوخ کی ہے تو پھر کیوں نہ اسے سب سے بڑی بولی لگانے والے کو لیز پر دے دیا جائے؟ کچھ لوگ اپنی آتما کوڑیوں کے عوض بیچنے کو تیار ہیں اور ہم یہی ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ انسانی گوشت شہوت انگیز نہیں ہے وگرنہ، کسی بھاری قیمت پر، اس کی بھی اجازت دی گئی ہوتی۔

عطاالرحمان صاحب یہ بات سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ خلیجی شیوخ کی طرف سے دیا جانے والا صدقے کا یہ تمسخر آمیز خاکہ اور اسلام آباد کے رحم و کرم پر رہنے کی آمادگی کوئی ایسی شے نہیں ہے کہ جس سے بلوچستان کے عوام کی کایا پلٹ جائے گی۔ اس سے وہ ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار رہ کر، بھیک مانگ کر اپنی تمام تر خودداری کھو دیں گے اور کبھی بھی اپنے آپ کو اقتصادی طور پر محکم نہیں دیکھ پائیں گے۔ وہ جتنا زیادہ اس توہین آمیز صدقے کے متقاضی ہوں گے، خلیجی شیوخ اور اسلام آباد اتنے ہی زیادہ مغرور اور کٹھور بن جائیں گے۔ کیا اس رقم کی آمد اس لائق ہے کہ ہم اپنے وقار اور اپنی زمین اور اس کے نباتات و حیوانات اور اپنے حقوق سے دستبردار ہو جائیں؟ کوئی اور چیز انسانوں کی وقعت کو اتنی تحقیر آمیز بنا کر نہیں گراتی جتنا کہ بلا چوں چرا کی قبولیت گرا دیتی ہے۔

یہاں ایک اور پہلو بھی ہے: خلیجی حکمران سزا سے استثنٰی کے ساتھ عوام کے حقوق کی خلاف ورزی ان کی شکار گاہوں پر شب خون مار کر کرتے ہیں اور حکومت مالیاتی فوائد کے لیے اسے نظرانداز کر دیتی ہے۔ مارچ 2013ء میں خاران کے نواب کے قانونی ورثا نے متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ خلیفہ بن زید کو خاران اور واشک اضلاع میں شکار والے علاقوں کی الاٹمنٹ کے خلاف بلوچستان ہائی کورٹ میں ایک آئینی درخواست دائر کی تھی۔ اس فریقی مقدمے میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ ایک وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی ان کی زرعی زمینوں، جنگلات، پانی کی

نہروں، چشموں، باغات اور چراگاہوں کی مشاورت یا اجازت کے بغیر شکار کے لیے غیر قانونی الاٹمنٹ کی گئی ہے اور اس میں مزید کہا گیا ہے کہ ہر سال متحدہ عرب امارات کے صدر کا عملہ شکار کے لیے پوسٹیں قائم کرتے ہیں اور علاقے میں گشت کرتے ہیں اور یہاں تک کہ مالکان، کرایہ داروں اور چرواہوں کو ان کی زمینوں، فصلوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی علاقے میں داخل ہونے نہیں دیتے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس درخواست کا کیا ہوا لیکن اگر بااثر نوشیروانی خاندان خلیجی حکمرانوں کے رویوں اور اعمال سے اپنے حقوق کی پامالی اور خلاف ورزی محسوس کر رہا ہے تو پھر کم تر درجے کے انسانوں کا کیا حشر ہوتا ہوگا؟

اس کے علاوہ، خطرے سے دوچار تلور کی ہجرت کے راستوں اور علاقوں میں شیوخ کے جو غول وارد ہوتے ہیں ان پر شکار کے مقاصد کے لیے لائے جانے والے تمام سامان اور درآمدات کو ٹیکس کی چھوٹ دی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو تلچھٹ وہ تقسیم کرتے ہیں، وہ ان کے لائے گئے سامان اور درآمدات کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہیں جس کے لیے انہیں ٹیکس کی ادائیگی کرنی پڑتی ہوگی۔ تاہم، یہ شیوخ اس پیسے سے کہ جسے وہ سیاست دانوں، حکام اور نام نہاد بزرگوں کو خریدنے اور جھکانے کے لیے خرچ کر سکتے ہیں، اس کے عوض وہ صرف انہی مراعات پر اکتفا نہیں کرتے۔ نومبر 2010ء میں یہ بات سامنے آئی کہ وزیراعظم کے دفتر کی ہدایات پر صوبائی محکمہ محصولات نے عرب شہزادوں کو شکار کرنے کے لیے ضلع لسبیلہ میں 70,000 ہیکٹر زمین کی فروخت کے لیے ایک سمری تیار کی تھی۔ وہ شکار کرنے کے مقاصد کے لیے کبھی کبھار آتے تھے اور وہ اس قیمتی زمین پر خصوصی کنٹرول چاہتے تھے تاکہ وہ وہاں پر اپنی نجی عمارتیں اور ہوائی اڈہ قائم کر سکیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلے اس زمین کا مطالبہ ملک کے ایک وفاقی سیکورٹی ادارے (پڑھئے فوج) کے لیے کیا گیا تھا لیکن لوگوں کی مخالفت کی سبب اسے منسوخ کر دیا گیا۔ زمین کے حصول کی خواہش صرف خلیجی شیوخ تک محدود نہیں ہے جیسا کہ مارچ 2007ء میں بلوچستان اسمبلی نے بلوچستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے اس وقت کے وزیر عبدالرحیم بازئی کی طرف سے پیش کی گئی ایک

قرارداد متفقہ طور پر منظور کی تھی جس میں وفاقی حکومت پر زور دیا گیا تھا کہ وہ فوج اور فضائیہ کی انتظامیہ کو صوبائی دارالحکومت کے مضافات میں واقع بازئی قبیلے کی زمین پر قبضہ کرنے سے روکے۔ انہوں نے کہا کہ فضائیہ کے حکام کوئٹہ کے قریب واقع اغبرگ علاقے میں بازئی قبیلے سے تعلق رکھنے والی ہزاروں ایکڑ زمین پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ فضائیہ نہ صرف مقامی لوگوں کی زمین پر قبضہ کر رہی ہے بلکہ زمینوں کے مالکان کو بلا جواز یا وارنٹ کے بغیر گرفتار بھی کیا جا رہا ہے۔

تو لہٰذا جب آپ صرف اپنے حصے میں گرنے والی تلچھٹ کو دیکھتے ہیں اور معمولی منصوبوں اور حقیر بخشش کے عوض اپنے بنیادی حقوق سے دستبرداری کے نتائج کو نظر انداز کرتے ہیں تو آپ اپنے وقار اور حقوق پر حملے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ یہ مداخلت کاریاں وقت کے ساتھ ساتھ اور زیادہ شدید ہو جاتی ہیں کیونکہ آپ جو کرنے کی اجازت دیں گے، وہ جاری رہیں گی۔ بقول فریڈرک نطشے کہ: ''کوئی قیمت اتنی بڑی نہیں ہے جسے اپنے آپ کا مالک خود بننے کے استحقاق کے لیے ادا کیا جائے۔'' عزت کی زندگی کے لیے کوئی بھی قیمت بڑی نہیں ہے لیکن یہ قربانی کی متقاضی ہے۔ بلوچ نے بہت قربانیاں دی ہیں اور اس وقت بھی آواران میں بڑے پیمانے پر کیے جانے والے وحشیانہ آپریشن کے نتائج بھگت رہے ہیں۔ تاہم، وہ اپنی عظمت اور اپنی زمین اور وسائل پر اپنے حقوق پر سمجھوتہ کرنے اور سرخم تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔

عظمت قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے اور ایک بھاری قیمت کی ادائیگی پر ملتی ہے۔ وہ لوگ جو ناانصافیوں اور اپنے حقوق پر یلغار کی اجازت نہیں دیتے صرف وہی اپنی قسمت کے مالک کے طور پر فخر سے جیتے اور مرتے ہیں۔ ولیم ارنسٹ ہینلی کی ''اِنوکٹس'' کے یہ سطور پوری بات کہہ رہے ہیں:

اِس مقامِ قہر و مہر کے اُس پار
نہیں کچھ اور فقط پھیلی ہوئی ہے ہیبتِ تاریکی
مگر برسوں کی صعوبت کے بعد بھی

مجھے پائے گی، ہاں، مجھے بے خوف پائے گی
خواہ کتنی ہی مصائب بھری ہو گزرگاہ
خواہ کتنی ہی طویل ہو طومارِ سزا
میں اپنے مقدر کا خود آقا
میں خود اپنی آتما کا ناخدا

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 16 اگست 2015
http://www.dailytimes.com.pk/opinion/16-Aug-2015/what-you-allow-is-what-will-continue

سرخ لکیریں عبور کرنا

میں نے حال ہی میں ڈاکٹر علی الغامدی نامی ایک شخص، جو کہ ایک سابق سعودی سفارت کار رہے ہیں اور جنوب مشرقی ایشیا کے امور پہ مہارت رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، کی طرف سے اپریل 2014ء میں 'سعودی گزٹ' کے لیے لکھا گیا ایک مضمون بعنوان 'بلوچستان اور اتحادِ پاکستان' پڑھا۔ اس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر سابق سعودی سفارتکار کو بلوچستان میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ اس نظریے کو تقویت دینے کے لیے لکھا گیا تھا کہ مذہب قومیت کی بنیاد ہوتی ہے جو کہ معتبر اور قابلِ قبول لگتی ہے۔

وہ، پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بنایا گیا تھا، کا منتر دہرانے کے بعد، نوحہ کناں ہوتے ہیں کہ کچھ اندرونی اور بیرونی طاقتیں اس نئی ہستی کے قیام پر مطمئن یا قائل نہ تھیں اور انہوں نے اس کی تخلیق سے متعلق کچھ مسائل کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور مبالغہ آرائی شروع کردی۔ انہیں ایسا لگتا ہے کہ کچھ لوگوں میں مذہبی عقیدے اور قومی جذبات کا فقدان تھا جس پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی اور کچھ لوگوں کو علاقائی جذبات عزیز تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہی مسائل بنگلہ دیش کے قیام کا باعث بنے۔ سعودی اور پاکستانی اشرافیہ لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ مذہب کے لیے اپنی صدیوں پرانی ثقافتیں اور تاریخ ترک کردیں۔

اور پھر وہ بلوچ لبریشن آرمی (بی ایل اے) پر الزام لگاتے ہیں کہ اس نے نہ صرف اندرونی طور پر تخریبی کارروائیوں میں ملوث ہونے سے بلکہ بیرونی طاقتوں، خاص طور پر امریکہ، کے ساتھ روابط قائم کرکے پاکستان کے قومی اتحاد کو خطرے میں ڈال کر ''سرخ لکیر عبور'' کی ہے۔ وہ خان کلات آغا سلیمان داؤد کو بی ایل اے کا قبائلی سربراہ قرار دے کر اپنی جہالت

ظاہر کرتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ایک ہمسایہ ملک، جس کی وضاحت انہوں نے نہیں کی، نے بین الاقوامی عدالت انصاف/ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس (آئی سی جے) میں اپیل کے لیے دو ملین ڈالر کی لاگت برداشت کرنے پر اتفاق کیا تھا لیکن جب اسے عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا تو انہوں نے امریکی کانگریس ارکان سے رجوع کیا اور تین کانگریس ارکان نے امریکی کانگریس میں ایک بل پیش کیا جس میں کہا گیا کہ: ''اس وقت بلوچستان پاکستان، ایران اور افغانستان کے درمیان منقسم ہے جس کے پاس اپنی خودمختاری کے کوئی حقوق نہیں ہیں۔ اور یہ کہ پاکستان میں انہیں تشدد، ماورائے عدالت قتل اور جبری نقل مکانی کا نشانہ بنایا جاتا ہے جہاں بلوچ حقِ خودارادیت کا مطالبہ کررہے ہیں۔ اور پھر آزاد بلوچستان سے خود کو دور رکھنے پر امریکی حکومت کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ انہیں 1990ء تا 1991ء میں خلیج جنگ کے دوران سعودی عرب میں فوج بھیجنے کے لیے ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

امریکہ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ کوئٹہ میں قونصل خانے کے لیے امریکی درخواست پر خوف کا اظہار کرتے ہیں کہ جس کا ہدف ان تنظیموں کی سرگرمیوں کو سہولت فراہم کرنا ہے جو پاکستان میں بدامنی پیدا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کو پناہ دینے کے لیے پاکستان سے انتقام لینے کی خاطر کیا جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ ٹی پارٹی (ریپبلکن پارٹی) کے کانگریس ارکان آزاد بلوچستان کے لیے کام کررہے ہیں۔ وہ بھارت پر باغیوں کی مالی معاونت کا الزام لگاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ پیسے قبائلی رہنماؤں کی جیب میں جاتے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ اگر ریپبلکن پارٹی امریکی انتخابات جیت جاتی ہے تو بلوچستان میں تشدد میں اضافہ ہوگا۔

اور پھر وہ اپنے چھ پوائنٹس کے ساتھ بلوچستان کے مسئلے کو حل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اول وہ یہ چاہتے ہیں کہ ''بلوچستان میں صورتحال سے نمٹنے کے لیے اٹھائے جانے والے سیاسی

اقدامات، جیسا کہ وہاں کی شورش کو کم کرنے کے لیے انتخابات کا انعقاد اور منتخب حکومت کی تشکیل'' کو میڈیا اجاگر کرے۔ دوم، وہ چاہتے ہیں کہ غیر ملکی مداخلت ختم ہو خواہ وہ امریکی کانگریس ارکان کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ یہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ وہ بحرین میں شیعوں پر ظلم و جبر ڈھانے کے لیے سعودی مداخلت بھول جاتے ہیں۔

سوئم، وہ چاہتے ہیں کہ میڈیا ٹی پارٹی اراکین کی جانب سے بلوچستان میں انسانی حقوق کا دفاع کرنے کے بہانے کی جانے والی منافقت کو بے نقاب کرے۔ چہارم، ان کا کہنا ہے کہ آزادی کا مطالبہ کرنے والے ایک چھوٹا سا گروہ ہیں جنہیں لوگوں کی حمایت حاصل نہیں ہے اور وہ مدد کے لیے بیرونی طاقتوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ پنجم، وہ وثوق کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''بلوچستان کے عوام محبّ وطن ہیں اور وہ امن، انصاف اور جمہوریت کا بول بالا چاہتے ہیں۔'' انہیں معلوم نہیں ہے کہ 27 مارچ 1948ء کے جبری الحاق کے بعد سے بلوچ لڑتے آرہے ہیں۔ ششم، وہ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ پاکستان، بیرونِ ملک رہنے والے کسی بھی مہم جو گروہ کو یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ قوم کے تحفظ اور سلامتی کو کمزور کرے یا ملک کے کسی حصے کو علیحدہ کرے۔

وہ پاکستانی حکومت کے ایک نمائندے کا کردار نبھا رہے ہیں اور بلوچوں کے اغوا اور قتل پر اندھے ہیں۔ انہیں بلوچ کے خلاف پاکستانی اسٹابلشمنٹ کی طرف سے ڈھائے جانے والی مظالم کی عبور کی گئی وہ سرخ لکیریں نظر نہیں آتیں اور نہ ہی انہیں وہ خون دکھائی دیتا ہے جو بہایا گیا ہے۔ بلوچستان میں سعودی دلچسپی بلوچ کے لیے کوئی نیک شگون نہیں ہے کیوں کہ اس کے مقاصد مذموم ہیں۔ بلوچستان میں میرانی ڈیم تعمیر کیا گیا ہے تاکہ اس سے جو زمین سیراب ہوگی، اسے چند خلیجی ممالک کو فروخت کیا جائے۔

سعودی عرب، بشمول متحدہ عرب امارات کے، افریقہ میں زمین کے سب سے بڑی خریداروں میں سے ایک ہے۔ 29 اپریل 2009ء کو اس وقت کے وفاقی وزیر برائے سرمایہ کاری

وقار احمد خان نے انکشاف کیا تھا کہ وہاں ''دس لاکھ ایکڑ زرعی زمینیں ہیں، جن کی حفاظت ایک اسپیشل سیکورٹی فورس کر رہی ہے، ان ممالک کو لیز پر دینے یا فروخت کرنے کے لیے جو اپنی خوراک کی فراہمی کو محفوظ بنانا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے مزید کہا کہ ''پاکستان کی حکومت اس وقت سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بحرین اور دیگر عرب ریاستوں کے ساتھ اس پر بات چیت کر رہی ہے۔'' پھر انہوں نے مزید یہ بھی کہا کہ حکومت میں تبدیلی آنے سے سرمایہ کاروں کو بچانے کے لیے پارلیمنٹ قانون سازی کے ذریعے انہیں تحفظ فراہم کرے گی۔ اور پھر پر معنی انداز میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''یہ (وزارت) ایک لاکھ افراد پر مشتمل ایک نئی سیکورٹی فورس کی خدمات حاصل کرے گی جسے ملک کے صوبوں میں تقسیم کیا جائے گا تاکہ یہ سرمایہ کاری کے ماحول کو مستحکم بنانے میں مدد دے'' اور ''ان لوگوں کو تنخواہوں اور تربیت پر دو ارب روپے لاگت آئے گی جن کا تعلق مقامی قصبوں، شہروں اور صوبوں سے ہوگا۔'' انہوں نے کہا کہ یہ رقم عطیہ دہندگان سے طلب کی جا رہی ہے۔ نومبر 2010ء میں بلوچستان کے ریونیو ڈیپارٹمنٹ نے عرب شہزادوں کے شکار اور نجی عمارتوں اور ایئرپورٹ کی تعمیر کے لیے لسبیلہ ڈسٹرکٹ میں 70,000 ہیکٹر زمین کی فروخت کے حوالے سے ایک سمری تیار کی تھی۔ مقامی لوگوں کی مخالفت کے سبب یہ منصوبہ دبا دیا گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سندھ فی مربع کلومیٹر 216 افراد کی آبادی کے ساتھ 140914 مربع کلومیٹر ہے اور بہت زرخیز ہے، جب کہ بلوچستان صرف 18.9 افراد فی مربع کلومیٹر کی آبادی کی گنجائی کے ساتھ 347190 مربع کلومیٹر ہے۔ خیبر پختونخوا 238.1 افراد کی آبادی کی گنجائی کے ساتھ 74521 مربع کلومیٹر ہے اور پنجاب 358.5 افراد کی آبادی کی گنجائی کے ساتھ 205345 مربع کلومیٹر ہے۔ پنجاب کے وزیر زراعت نے کچھ عرصہ قبل اس بات کی تصدیق کی تھی کہ چولستان میں 600,000 ایکڑ کی جو پیشکش کی گئی تھی اسے کھارے پانی کی وجہ سے مسترد کر دیا گیا۔ یہ عوامل بلوچستان اور سندھ کو خلیجی ریاستوں کی حصول زمین کی بھوک مٹانے کے لیے موزوں ترین جگہ بناتے ہیں۔ ایسا کوئی بھی معاہدہ حکمرانوں کے لیے فوری پیسہ بنائے گا لیکن بیک وقت

بلوچستان کی موجودہ سیاسی، اقتصادی، سماجی اور آبادیاتی توازن کو بگاڑ دے گا اور بلوچ حقوق کو بھی مزید خطرے میں ڈال دے گا۔ بلوچ اپنی سرزمین اور حقوق غصب کرنے پر شدید متنفر ہیں، خواہ وہ پاکستان کی طرف سے کیے جائیں یا ان کے چینی اور سعودی دوستوں کی طرف سے، اور جو بھی ان سرخ لکیروں کو عبور کرے گا، اس کے خلاف وہ مزاحمت کریں گے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 23 اگست 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/

23-Aug-2015/crossing-the-red-lines

''تکبر نے امن کے مواقع گنوا دیے''

انٹرویو: اطہر نقوی

'دی نیوز آن سنڈے' کی طرف سے کیے گئے اس انٹرویو میں بلوچ دانشور و تجزیہ نگار میر محمد علی ٹالپر نے بلوچستان میں شورش کی صورتحال اور امن کے لیے حکومتی منصوبوں کے بارے میں بات کی ہے۔

دی نیوز آن سنڈے: حکومت کے اس دعوے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ 14 اگست کو سیکڑوں بلوچ باغیوں نے ہتھیار ڈالے ہیں؟ ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ کی ہلاکت کے بارے میں متضاد اطلاعات تھیں۔ بلوچستان میں آج بغاوت کی صورتحال کیا ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: حکومت نے ہمیشہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہاں صرف مٹھی بھر گمراہ بلوچ ہیں جو غیر ملکی ہاتھوں کی ایما پر ترقی کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔ لیکن جون کے بعد سے، اگر پریس کی رپورٹوں کو دیکھا جائے تو، ان ہتھیار ڈالنے والوں کی تعداد کم از کم 800 ہے تو پھر اب تک حملے کیوں جاری ہیں؟

تازہ ترین ڈرامہ 17 اگست کو رچایا گیا تھا، جس میں دعویٰ کیا گیا کہ براہمدغ کے دست راست نے 23 دیگر افراد کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ یہ ''ہتھیار ڈالنے والے کرایے کے ہجوم'' ہیں، جو کہ بے معنی ہیں۔

ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ کے حوالے سے رپورٹیں محض یہ ظاہر کرتی ہیں کہ عوام کی نظروں سے دور

آواران میں بڑے پیمانے پر مسلسل ایک فوجی آپریشن کیا جارہا ہے اور انہیں مارنے کے لیے تلاش کیا جارہا ہے کیونکہ وہ بلوچ مزاحمت کی علامت ہیں۔ انہیں سی پیک (چائنا پاکستان اقتصادی راہداری) کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے لیکن حکومت کو اس بات کا ادراک نہیں ہے کہ مچھلی سمندر میں زندہ رہتی ہے اور بلوچستان کے عوام ان لوگوں کے لیے سمندر ہیں جو ترقی کے جعلی لبادے کی آڑ میں ان کے وسائل کے استحصال اور زمین پر قبضے کی مخالفت کرتے ہیں۔

بلوچستان میں شورش یقینی طور پر فعال اور حکومت کے لیے کافی پریشان کن ہے کہ، کوئٹہ کنٹونمنٹ اور متعدد بحری اڈوں سمیت وہاں پہلے سے افواج کی موجودگی کے علاوہ، اس نے اعلان کیا ہے کہ یہ چینی اہلکاروں کی حفاظت کے لیے فوج کی نو بٹالین اور سویلین فورسز کی چھ بٹالین پر مشتمل ایک اسپیشل سیکورٹی ڈویژن (ایس ایس ڈی) قائم کرے گی اور مزید یہ کہ وہ آپریشن ضربِ عضب کی بلوچستان تک توسیع کر سکتے ہیں۔ آواران میں جاری آپریشن بلوچستان کی صورتحال کے بارے میں جلدوں پر مشتمل داستان بیان کرتے ہیں۔

دی نیوز آن سنڈے: گزشتہ ہفتے بلوچستان کے سینئر پارلیمانی لیڈر نواب ثنااللہ زہری نے لندن میں ازخود جلاوطن بلوچ رہنما خان کلات آغا سلیمان داؤد احمد زئی سے ملاقات کی ہے تاکہ ان سے واپس آنے اور بلوچستان میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے درخواست کریں۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: یہاں پر اہم سوال یہ ہے جیسا کہ سٹالن نے پوچھا، ''پوپ کے پاس کتنے ڈویژن ہیں؟'' خان قلات کے پاس کوئی ڈویژن نہیں ہیں اور نہ ہی وہ پوپ ہیں۔ ان کو اب وہ اثر رسوخ حاصل نہیں رہا جو ان کے بزرگوں کو حاصل تھا، لہٰذا ان کی واپسی سے بلوچستان میں شورش کی صورتحال تبدیل نہیں ہوگی، اگرچہ وہ بھی ایک منافع بخش ہتھیار ڈالنے والے ہجوم کرایے پر لینے کا بندوبست کر سکتے ہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان کی واپسی نے کسی تبدیلی کو جنم دیا ہے۔

دی نیوز آن سنڈے: ڈاکٹر عبدالمالک کی صوبائی حکومت کی اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے کس طرح کی منصوبہ بندی ہے؟ یہ کس طرح سے وزیراعظم کے 'پرامن بلوچستان پروگرام' سے یا پیپلز پارٹی کے 'آغاز حقوق بلوچستان پیکیج' سے مختلف ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: ڈاکٹر مالک کی صوبائی حکومت کے پاس اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے قطعاً کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ یہ اپنی عمومی (ارادی ابہام گوئی سے) پالیسی کے لیے راولپنڈی اور اسلام آباد سے احکامات لیتے ہیں اور ان کی روزمرّہ کی حکومت انہی کی خواہشات کے ساتھ مشروط ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر مالک انتخابات میں کل 4000 ووٹ لے کر اپنی کامیابی کے ساتھ بلوچ عوام کی نمائندگی نہیں کرتے۔

پیپلز پارٹی کا آغازِ حقوق بلوچستان پیکیج خالصتاً ایک ناکامی تھی؛ ہوسکتا ہے اس نے چند اعداد و شمار کو فائدہ پہنچایا ہو مگر وہاں کے لوگوں کو نہیں۔ فروری 2013ء میں ایک 10 رکنی خصوصی کابینہ کمیٹی نے کہا کہ فنڈز کی بے مثال تخصیص کے باوجود مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے۔

دو 'شریفوں' کا 'پرامن بلوچستان پروگرام' کوئی ترقیاتی پروگرام نہیں ہے بلکہ لوگوں کو 'شانت' کرنے کا پروگرام ہے جو کہ سی پیک پر کام کرنے والے چینیوں کی سیکورٹی کو یقینی بنانے کے لیے فقط طاقت کے وحشیانہ استعمال پر مبنی ہے۔ یہ اسی شانت کرنے والے منصوبے کی پیروی میں کیا جارہا ہے جس کے تحت ایس ایس ڈی کی تشکیل لازمی بن گئی ہے، باوجود اس کے کہ 50000 سے زائد ایف سی (فرنٹیئر کور) اہلکار پہلے ہی سے وہاں موجود ہیں۔

دی نیوز آن سنڈے: بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ حکومت کو ناراض بلوچوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے دروازہ کھول دینا چاہیے اگر وہ سی پیک کے بارے میں سنجیدہ ہے اور یہاں تک کہ اگر ایران پاکستان گیس پائپ لائن کے بارے میں بھی۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں اور کیا وہاں مذاکرات کے لیے اب بھی گنجائش موجود ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: ماضی میں امن کے مواقع ملے تھے لیکن تکبر اور جہالت

سے انہیں گنوا دیا گیا؛ ان میں سب سے بہترین موقع 1972ء تا 73ء کی عطا اللہ مینگل حکومت تھی۔ ستمبر 2008ء میں بلوچ عسکریت پسند گروہوں نے یک طرفہ جنگ بندی کی لیکن اس کا کوئی جواب نہیں ملا اور جنوری 2009ء میں انہوں نے جنگ بندی ختم کر دی۔

مسلسل کی جانے والی فوجی کارروائیوں اور منظّم جبری گمشدگیوں کی پالیسی کے باعث عوام اور لڑنے والے گروہ اب حکومت پر اعتماد نہیں کرتے۔ اعتماد کا فقدان بہت زیادہ ہے اور اس کے علاوہ اسٹابلشمنٹ مکمل طور پر ہٹ دھرم ہے کیوں کہ اس کا خیال ہے، جیسا کہ اس نے مشرقی پاکستان میں کیا، کہ وہ اتنے طاقت ور ہیں کہ وہ بلوچستان میں لوگوں کی خواہشات کو کچل دیں گے۔

دی نیوز آن سنڈے: صوبے میں ذرائع ابلاغ کی آزادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: جولائی 2012ء میں کوئٹہ میں 'بلوچستان میں میڈیا اور سول سوسائٹی' پر ایک ورکشاپ منعقد کی گئی تھی جس میں یہ انکشاف ہوا کہ وہاں میڈیا آزاد نہیں ہے اور پیشہ ورانہ ڈیوٹی پر معمور صحافیوں کو اکثر ہراساں ہونے کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور چار سال میں 22 صحافیوں کو قتل کیا گیا ہے۔

فروری 2014ء میں 'رپورٹرز ود آؤٹ بارڈرز' کی سالانہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 2013ء میں پاکستان میں سات نامہ نگار قتل ہوئے، ان میں سے چار کا تعلق بلوچستان سے تھا۔ گذشتہ سال اگست میں ارشاد مستوئی اور زیر تربیت رپورٹر عبدالرسول قتل ہوئے تھے اور تمام گزشتہ ہلاکتوں کی طرح ان کی گتھی بھی اب تک نہیں سلجھی ہے۔ وہاں کل 32 صحافی قتل ہوئے ہیں۔

ایف سی نے 2009ء میں کوئٹہ میں تین اخبارات ڈیلی آساپ، آزادی اور بلوچستان ایکسپریس کے دفاتر کا محاصرہ کیا اور ان پر چڑھائی کی۔ 'آساپ' کے دفاتر کے باہر تعینات ایف سی اہلکاروں نے بالآخر اسے اپنی اشاعت روکنے پر مجبور کر دیا۔

بلوچستان کا ذکر دوسری جگہوں پر بھی برداشت نہیں کیا جاتا؛ ایل یو ایم ایس (لمس) میں 'اَنسائیلنسنگ بلوچستان' کے عنوان سے ایک سیمینار، جہاں ماما قدیر بلوچ، فرزانہ مجید اور مجھے خطاب کرنا تھا، کو انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف سے جبراً منسوخ کروایا گیا۔ بلوچستان سے باہر کے صحافیوں اور کالم نگاروں کو بلوچستان پر لکھنے کے حوالے سے دباؤ کا سامنا ہے تو لہٰذا تصور کیا جا سکتا ہے کہ بلوچستان کے حالات کیسے ہیں۔ پی ٹی اے (پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن اتھارٹی) تمام بلوچ ویب سائٹس کو بلاک کر دیتی ہے جب کہ فرقہ وارانہ ویب سائٹس پنپ رہی ہیں۔

دی نیوز آن سنڈے: آپ بلوچستان کے معاملات میں دیگر ممالک کی مداخلت کے حکومتی دعوے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: 27 مارچ 1948ء کو جب پاکستان نے بلوچستان پر زبردستی قبضہ کیا تھا تو تب سے حکومت یہی بہتان لگا رہی ہے کہ وہاں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہے۔ ان الزامات کی شدت اسٹابلشمنٹ کے اس عدم تحفظ سے متعلق ہے، جسے وہ محسوس کرتی ہے؛ بلوچستان میں جو کچھ غلط ہو رہا ہے اس کے لیے حال ہی میں 'را' پر خصوصی زور کے ساتھ غیر ملکی طاقتوں پر الزام عائد کرنے کی ایک منظّم کوشش کی گئی تھی۔

بلوچستان میں شورش اور جدوجہد خالصتاً دیسی ہے؛ وہاں قندھار میں کوئی بھارتی قونصل خانے نہیں تھے جب 13 نومبر 1839ء کو خان کلات محراب خان برطانوی افواج سے لڑے تھے اور جب مریوں نے 1840ء میں سارتاف اور نفسک میں ان کو شکست دی تھی۔

حکومت کو لگتا ہے کہ غیر ملکی ہاتھ کے اس ہوا پر ڈھول پیٹنے سے وہ ان تمام لوگوں کو بدظن کرنے کے قابل ہو جائے گی جو بلوچ جدوجہد سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ یہ چیز انہیں ان بے پناہ مظالم کے ارتکاب کے لیے جواز بھی فراہم کرتی ہے جنہیں ہم بلوچستان میں لاپتہ افراد اور 'مارو اور پھینک دو' کی مکروہ پالیسی کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

دی نیوز آن سنڈے: آپ کیا مشورہ دیں گے کہ صوبے میں امن اور سیاسی استحکام

لانے کے لیے حکومت کا مستقبل میں کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟

میر محمد علی ٹالپر: ایک ایسی اسٹابلشمنٹ جس کی اختلافِ رائے کے خلاف مستقل پالیسی کی بنیاد وحشیانہ طاقت کا استعمال ہو، جیسا کہ 1948ء کے بعد سے ہم بلوچستان میں دیکھ چکے ہیں اور 1971ء میں مشرقی پاکستان میں دیکھا ہے، اس رویے کے ساتھ کوئی یہ توقع نہیں کرسکتا وہ امن کے لیے دی گئی تجاویز پر کان دھرے گی۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ بلوچ کے تحفظات کا احترام کرے گی کیوں کہ اس کی پالیسی کی (رد) رہنمائی یہ نقطہ نظر کر رہی ہے کہ اپنے حقوق کے بارے میں بات کرنے والے تمام بلوچ غیر ملکی پیسے پر کام کر رہے ہیں۔ میں ایسے اقدامات پر تجاویز دینے میں اپنا وقت برباد نہیں کروں گا جن پر کبھی بھی غور تک نہیں کیا جائے گا، انہیں عملی جامہ پہنانا تو دور کی بات ہے۔

بشکریہ: دی نیوز آن سنڈے، 23 اگست 2015

http://tns.thenews.com.pk/balochistan-mir-ali-talpur-windows-opportunities-peace-squandered-arrogance/

پلید تر باشد

خرم حسین صاحب نے حال ہی میں ایک انگریزی روزنامے میں 'خفیہ معیشت' کے عنوان سے شائع ہونے والے ایک مضمون میں چند اہم سوالات اٹھائے ہیں جو ایک نامسعود و ناپاک معاملے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس پر کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ وہ کہتے ہیں: ''اسٹیٹ بینک ملک بھر کے شہروں میں 16 کلیئرنگ ہاؤسز چلاتی ہے۔ یہ ہر ماہ اعداد و شمار جاری کرتی ہے کہ ان میں کتنے چیک کلیئرنگ کے لیے پیش کیے گئے اور ان ہاؤسز سے کتنے چیکوں پر کل کتنی رقم کلیئر کی گئی۔ اگر آپ اس کے اعداد و شمار کو لیں، جو کہ 1999ء تک جاتے ہیں، اور پھر پاکستان میں ہر شہر کے لیے اس کا نقشہ بنائیں تو آپ کو ایک نہایت ہی دلچسپ چیز نظر آئے گی۔ کراچی اور لاہور کے شہروں کو فی الحال اس تمثیلی فہرست سے ہٹا دیں کیوں کہ ایک حساب سے یہ طویل فاصلے والے رابطوں کے ساتھ عالمی شہر ہیں۔ یہاں صرف علاقائی شہروں کا موازنہ کریں اور آپ کو یہ چیز دیکھنے کو ملے گی۔

گیارہ ستمبر کے بعد، اس تمثیلی فہرست کے کل میں سے آدھے شہروں کی ان کلیئرنگ ہاؤسز کے ذریعے کلیئر کیے جانے والے پیسے کی کل رقم میں تیزی سے اضافے کا رجحان دکھائی دے گا۔ دوسرے نصف کے لیے خط یکساں طور پر استوار ہے۔ جن شہروں میں اضافے کا رجحان ظاہر ہوتا ہے ان میں فیصل آباد، ملتان، راولپنڈی اور کوئٹہ شامل ہیں جو کہ پشاور کی قیادت میں سبقت لے جانے میں ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔ سال 2011ء میں پشاور سے چیک کے ذریعے کلیئر کی گئی رقم 13 کھرب روپے سے تجاوز کر گئی! اسی سال کوئٹہ سے کلیئر کی گئی رقم 900 ارب روپے سے ذرا کم رہی، جس کا مطلب ہے کہ ان دونوں علاقائی شہروں کے درمیان صرف ایک

سال کے دوران ان کلیئرنگ ہاؤسز کے ذریعے تقریباً بیس کھرب روپے گزرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ ان اعداد و شمار کا موازنہ فیصل آباد کے دس کھرب روپے، راولپنڈی کے 14 کھرب روپے اور ملتان کے 826 ارب روپے کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن پشاور اور کوئٹہ اس فہرست پر کیا کر رہے ہیں؟ فیصل آباد اور ملتان علاقائی مراکز، پیداواری مراکز، زرعی پیداوار کی بڑی جگہیں ہیں۔ فیصل آباد دنیا میں سوت کی سب سے بڑی منڈیوں میں سے ایک ہے، جہاں لین دین کے لیے زیادہ تر بینکوں کا استعمال ہوتا ہے اور جہاں پانچ ارب ڈالر سے زائد کے برآمدات کی پیداوار ہوتی ہیں۔ لیکن پشاور اور کوئٹہ میں کوئی دیگر ملحقہ رجحان نہیں ہے، وہاں بلا شاخ کے بینکوں کی بینکاری نہیں ہوتی، رقم کی ٹیلی گرافک منتقلی نہیں ہوتی، بڑی مقدار میں بجلی کا استعمال نہیں ہوتا۔ وہاں صرف ایک واحد میخ ہے جو ملک کی زرعی اور صنعتی مراکز کی رفتار کے ساتھ کلیئرنگ ہاؤسز میں لین دین میں اضافہ دکھاتی ہے۔''

واضح سوال یہ ہے: کیا چیز کوئٹہ اور پشاور میں اس میخ کو اتنی تیزی سے چلا رہی ہے؟ وہ اقتصادی سرگرمی کہاں ہے جو ان دونوں شہروں کے کلیئرنگ ہاؤسز کے ذریعے اتنی بڑی اور قابلِ دید رقوم بھیج رہی ہے؟ اور یہ رقم شہر یا صوبے کے کسی بھی دیگر اقتصادی انڈکس پر اپنا کوئی نشان کیوں کر نہیں چھوڑ پا رہی ہے؟ وہ حتمی بات یوں بیان کرتے ہیں کہ ''یہ شہر ایک بہت بڑی خفیہ معیشت کی لپیٹ میں ہیں جہاں ایک بڑے پیمانے پر لین دین کی رقم مختصر دورانیے کے لیے سرکاری ریکارڈ پر ظاہر ہوتی ہے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔''

ڈنمارک کی حالت میں ضرور کوئی گہری سڑاند موجود ہے! وہاں ضرور کوئی نہ کوئی وجہ ہے جس پر چشم پوشی کی جا رہی ہے۔ یہ وہ خفیہ معیشت ہے جو کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچا رہی ہے اور ان کے مفادات کے لیے پنپ رہی ہے کیوں کہ بدامنی میں اَن گنت پیسہ آتا ہے جو بعض حلقوں کو اچھی طرح سے کھلائے پلائے رکھتا ہے، جیسا کہ ہم نے بلوچستان کے کوئلے کی کانوں کے تحفظ کے لیے لی جانے والی رقوم کے حوالے سے دیکھا۔ درحقیقت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل ہونے

والا غیر ریکارڈ شدہ پیسہ کلیئرنگ ہاؤسز کے لین دین کے مقابلے میں کم از کم پانچ گنا زیادہ ہے۔ کوئٹہ اور پشاور دونوں میں پیسے کی اتنی بڑی مقدار کیسے پیدا ہوتی ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے کسی کو راکٹ سائنس دان بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ افغانستان سے منشیات کے بہاؤ اور ہتھیاروں کی اسمگلنگ ہے جو ان لوگوں کو مالا مال بنانے کے لیے ذمہ دار ہے جن کے پاس پاکستان اور دنیا کے دیگر شہروں میں ان کی ترسیل کی سہولیات فراہم کرنے کے لیے اختیارات اور اثر و رسوخ ہے۔

لیکن ذرا ایک لمحہ رکیے؛ یہ صرف افغانستان نہیں ہے جو پوست اگاتا اور ہیروئن بناتا ہے۔ مارچ 2014ء میں بلوچستان اسمبلی نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ضلع قلعہ عبداللہ میں سیراب زمینوں کی ہزاروں ایکڑ رقبے پر پوست کی کاشت کا خاتمہ کیا جائے جو افغانستان کی سرحد سے ملحق ہے۔ پشتونخوا ملی عوامی پارٹی کے صوبائی وزیر ڈاکٹر حامد اچکزئی نے کہا کہ سزا سے استثنٰی کے ساتھ پوست کاشت کی جا رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ: ''قلعہ عبداللہ حشیش کھلے عام فروخت کے لیے بدنام ہے۔ ضلعے میں ہیروئن کی تقریباً 120 فیکٹریاں موجود ہیں۔'' انہوں نے مزید کہا کہ پولیس، فرنٹیئر کور (ایف سی)، انسداد منشیات فورس اور حتیٰ کہ پاکستان آرمی بھی قلعہ عبداللہ میں موجود ہیں لیکن پھر بھی یہ غیر قانونی کاروبار فروغ پا رہے ہیں۔ تو کیا اب بھی آپ کو وضاحت کے لیے کسی راکٹ سائنس ضرورت ہے؟

اقوام متحدہ کے دفتر برائے منشیات اور جرائم (یو این او ڈی سی) کی افغانستان میں منشیات کی تجارت پر 2009ء کی رپورٹ میں اندازے کے مطابق افغانستان کی ہیروئن کی سالانہ پیداوار کا تقریباً 40 فیصد اور افیون کا تقریباً 30 فیصد پاکستان کے ذریعے باقی دنیا کو جاتا ہے؛ یہ سرحد پار اسمگلنگ مقامی سطح پر 910 ملین ڈالر سے لے کر 1.2 بلین ڈالر کے درمیان کی مالیت کا حامل ہے۔ یو این او ڈی سی کی ایک اور رپورٹ کہتی ہے کہ 15 سال سے لے کر 64 سال کی عمر کے تقریباً 6.7 ملین پاکستانی، آبادی کا چھ فیصد، منشیات کا استعمال کرتے ہیں اور 4.1 ملین افراد اس پر انحصار کرتے ہیں۔ سندھ بری طرح متاثر ہے لیکن 2013ء کے اعداد و شمار کے مطابق 2.9 ملین

منشیات کے عادی افراد کے ساتھ پنجاب میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

منشیات ہلمند سے کراچی کیسے پہنچتی ہے، اس کی وضاحت کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں۔ رستے بھر مٹھیاں گرم کی جاتی ہیں تو لہٰذا اس میں کسی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد منشیات کی قیمتیں کیسے حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ وہ لوگ جو اس کی ترسیل میں سہولت بہم پہنچانے سے پیسے کمارہے ہیں، اتنے ہی برے ہیں جتنا کہ اس کی پیداوار کرنے والے، اس کی مارکیٹنگ کرنے والے اور بیچنے والے ہیں، مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ ان کا انتہائی احترام کیا جاتا ہے اور وہ 'نیکوکار' کی حیثیت سے اعلیٰ ترین رہائشی علاقوں میں قیام پذیر ہیں۔ یہاں پر کرپشن ادارہ جاتی ہے کیونکہ اس کے پیچھے ادارے ہیں۔

بلوچستان کے پاس اس کا امام بھیل ہے جو امریکہ کی طرف سے منشیات کی اسمگلنگ کا تصدیق شدہ سرغنہ ہے؛ ڈاکٹر عبدالمالک اور ان کی پارٹی کے ساتھ ان کے فرحت بخش تعلقات ہیں۔ وہ حکم چلاتے ہیں اور اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے گوادر کے مرحوم ڈپٹی کمشنر عبدالرحمان دشتی مارچ 2012ء میں کراچی میں قتل کیے گئے لیکن ان کے ورثا اب بھی انصاف کے منتظر ہیں۔ منشیات کا سرغنہ امام بھیل اس جرم کا اہم ترین ملزم ہے۔

پوشیدہ معیشت کی حوصلہ افزائی لالچ اور ہوس کرتے ہیں، اور یہ دونوں عمیق گڑھے کبھی بھر نہ پائیں گے۔ یہ خفیہ معیشت اداروں کی حمایت کے بغیر پھل پھول نہیں سکتی، جو کہ ہوسکتا ہے کہ وہاں پر قانونی اور آئینی طور پر ہو یا غیر قانونی طور پر طاقت کے بل بوتے پر۔

پیسہ، طاقت اور مراعات ہر جگہ بدعنوانی پھیلا دیتے ہیں لیکن یہاں یہ کچھ زیادہ شدید ہے، اور اس کے مراعات یافتہ لوگوں کے پاس یہ جتنا زیادہ ہوگا وہ اتنے ہی بڑے شیطان اور اتنے ہی زیادہ نامسعود بن جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو چوری، دھوکہ دہی، غنڈہ گردی، خیانت یا طاقت کے بل بوتے پر کوئی مقام حاصل کرتے ہیں، کسی ایسی جگہ جہاں طاقت، دولت اور مراعات ان کے حصول دسترس میں ہوں، وہ نہ صرف اسے چھوڑنے سے انکاری ہوتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ کی

خواہش کرتے ہیں۔ شیخ سعدی سے بہتر اور کوئی اس بیماری کی وضاحت نہیں کرسکتا، جن کا کہنا ہے کہ:

''سگ بردریای ہفتگانہ بشوئی، کہ چوتر شد پلید تر باشد''

''کتے کو سات سمندر میں نہلا دو، جتنا گیلا ہوگا اتنا زیادہ پلید۔''

(مسلمانوں کا ماننا ہے کہ گیلا کتا نجس ہوتا ہے)

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 30 اگست 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/

30-Aug-2015/paleed-tar-bashad

جنگی جنون اور جنگی منافع

جنگ جو کہ اصل میں ایک حماقت ہے، ہمیشہ وہ لوگ اس کا جشن مناتے ہیں جو اس سے مادی اور سیاسی فائدے اٹھاتے ہیں، اور ہم ستمبر 1965ء کی جنگ کے حوالے سے یہی ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ جو دونوں اطراف حکمرانی کر رہے ہیں، جنگی جنون کو اس حد تک بڑھاوا دے رہے ہیں کہ گویا وہ اس جشن کو ایٹمی آتش بازی کے ساتھ منانے کی خواہش رکھتے ہیں جو کہ اور کچھ نہیں کرے گا ماسوائے دنیا کو تباہ کرنے کے۔ انتہائی پست اور خطرناک ذہنوں کی انگلیاں ایٹمی بٹن پر ہیں اور کسی کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔

جنگی جنون جنگی مشین پر خرچ کرنے کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ اقتدار میں ہیں اگر انہیں جنگوں سے فائدہ نہ پہنچتا ہو تو مزید جنگیں ہی نہ ہوتیں۔ عراق جنگ نے چند لوگوں کو تو فائدہ پہنچایا مگر لاکھوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ ایک ایسا وقت بھی تھا جب امریکہ، عراق اور افغانستان میں روزانہ 720 ملین ڈالر یا 500000 ڈالر فی منٹ خرچ کیا کرتا تھا۔ اس یومیہ رقم سے 84 پرائمری اسکول چلائے جا سکتے تھے یا اس رقم سے 163000 سے زائد افراد کی صحت کی دیکھ بھال ہو سکتی تھی۔ فوج پر کسی طرح کے بھی اخراجات لوگوں کو بہتر زندگی کے مواقع سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہاں پر 2015-2016ء کے دفاعی اخراجات میں 11.6 فیصد اضافہ ہوا ہے جو کہ 781 ارب روپے بنتے ہیں، اگرچہ اصل میں فوج کے لیے مبینہ طور پر 1113 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں جو کہ کل بجٹ کا 28.2 فی صد ہے، اس پنشن کی رقم کو چھوڑ کر جو کہ سویلین بجٹ سے نکال لی جاتی ہے۔ جوہری ہتھیاروں کی توسیع پر کیے جانے والے اخراجات خفیہ ہیں۔ بھارت نے 2014ء میں دنیا کے کل اخراجات کا 2.8 فیصد اپنی فوج پر خرچ کیا۔ دنیا تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ذیل میں دیا گیا اقتباس مارچ 2009ء میں لکھے گئے میرے ایک مضمون ''جنگ کی لت'' سے لیا گیا ہے۔ یہ آج کے جنگ و ہراس پھیلانے والے ماحول کی مناسبت سے زیادہ موزوں ہے۔

''اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 2008ء کے صدر میگیل ڈی اسکوٹو بروکمین نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا تھا کہ 'یہ قابلِ افسوس مگر ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ سلامتی کونسل کے چند ارکان کی طرف سے امن کے خلاف سنگین خلاف ورزیوں کا ارتکاب اور بین الاقوامی امن اور سلامتی کے لیے خطرات پیدا کیے جا رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اب وہ اس لت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے قابل نہیں رہے۔ آج ہماری دنیا کی حالت تاسف انگیز، ناقابلِ عذر اور اسی سبب شرمناک ہے۔''

صف اول کی طاقتوں نے پرامن طریقوں سے تنازعات کے حل مسترد کر دیے ہیں، اگرچہ اس کی لت مکمل طور پر صرف انہی تک محدود نہیں ہے؛ تیسری دنیا کے حکمران بھی اپنے وسائل کو اسراف کے ساتھ خرچ کرتے ہیں اور اپنے ممالک کو محاذ آرائی کے تعاقب میں قلاش بنا دیتے ہیں۔ وہ سب ان انتہائی درجے کے خراب حالات کے لیے ذمہ دار ہیں جس میں لوگ آج زندگی گزار رہے ہیں۔ اسٹاک ہوم انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے جاری کردہ تازہ ترین رپورٹ واقعی ایک پریشان کن تصویر پیش کر رہی ہے۔ اس کے مطابق: ''گذشتہ ایک دہائی میں دنیا کے فوجی اخراجات میں 45 فیصد اضافہ ہوا ہے جس میں کل فوجی اخراجات میں سے تقریباً آدھا صرف اور صرف امریکہ کے کھاتے میں جاتا ہے [جب کہ]، صرف گزشتہ سال کے کل اخراجات میں چھ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ 2007ء میں 130 کھرب ڈالر اسلحے کی خریداری اور دیگر فوجی اخراجات پر خرچ کیے گئے، دنیا کے مجموعی جی ڈی پی کے مطابق 2.5 فیصد یا دنیا کے 6.6 ارب لوگوں میں سے ہر ایک کے لیے 202 ڈالر کے تناسب سے۔ دنیا کی 100 معروف اسلحہ ساز کمپنیوں نے 2006ء میں 315 ارب ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا۔ گذشتہ دہائی میں مشرقِ وسطیٰ کے فوجی اخراجات 62 فیصد تک بڑھے ہیں، جنوبی ایشیا میں 57 فیصد اور افریقہ اور مشرقی ایشیا میں 51

فیصد تک بڑھے ہیں۔

امریکہ اب تک سب سے زیادہ خرچ کرنے والا ملک ہے، اس نے گذشتہ سال 547 ارب ڈالر یا دنیا کے مجموعی فوجی اخراجات کا 45 فیصد خرچ کیا۔ مالی سال 2008ء کے لیے اس کا دفاعی بل، عراق اور افغانستان میں جنگوں کی لاگت چھوڑ کر، 459 ارب ڈالر تھا۔ اگلی دہائی کے دوران جنگ اور انسداد دہشتگردی کی کوششوں میں امریکہ کو 240 کھرب ڈالر کی لاگت آسکتی ہے۔ عالمی طور بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات تشویش ناک بھی ہیں اور خطرناک بھی۔ افسوس کی بات ہے کہ جنوبی ایشیا اس فہرست کے سب سے اوپر کے قریب ہے۔ جنگجویانہ رہنماؤں اور جنونی نفرت پر مبنی بیان بازی نے ہمیشہ اس خطے کو ابہام یا کھلے تنازعے کی کیفیت میں رکھا ہے اور تباہ کن نتائج کے ساتھ انسانی ترقی سے قیمتی وسائل اٹھا کر دوسری طرف لگائے گئے۔

بی بی سی کی رپورٹ کے مطابق: ''ہر سال مجموعی طور پر ایک کروڑ بچے اپنی پانچ سال کی عمر سے پہلے مر جاتے ہیں۔ زیادہ تر اموات صرف چھ ممالک میں ہوتے ہیں: چین، جمہوریہ کانگو، ایتھوپیا، بھارت، نائیجیریا اور پاکستان۔'' جنوب ایشیائی بچے اس سے بری طرح متاثر ہیں، جب کوئی وہاں کے دفاعی بجٹ کا سروے (بھارت: 22 ارب ڈالر، مجموعی ملکی پیداوار کا 2.6 فیصد (2006ء) اور پاکستان: 4.5 ارب ڈالر، مجموعی ملکی پیداوار کا 3.1 فیصد (2007ء) کرے تو وہ تصور کرسکتا ہے کہ وہاں کے حکمران تلخ حقائق سے ناواقف ہیں۔ 1999ء میں بھارت نے دفاع پر 10 ارب ڈالر خرچ کیے، فی کس 10.50 ڈالر جب کہ پاکستان نے چار ارب ڈالر خرچ کیے، فی کس 27 ڈالر جو کہ اب 34 ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔

''جنوبی ایشیا میں انسانی ترقی'' کے عنوان سے محبوب الحق ہیومن ڈویلپمنٹ سینٹر کی طرف سے ایک 10 سالہ جائزے میں کہا گیا ہے: ''73 فیصد سے زائد پاکستانی اب بھی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کررہے ہیں جس میں دیہی علاقوں کی غربت کی شرح کے ساتھ اضافے کا اندراج کیا گیا ہے۔ دنیا میں غریب لوگوں کی مجموعی تعداد میں سے جنوبی ایشیا کا حصہ گذشتہ 10 سالوں کے دوران 1993ء میں 40 فیصد سے 2004ء میں 47 فیصد کے ساتھ نمایاں طور پر بڑھا

ہے۔ گذشتہ دس سال کے دوران پاکستان میں متوقع انسانی عمر کی پیشرفت میں اضافہ اس خطے میں سب سے زیادہ سست رہی ہے۔ کم خوراکی کے شکار پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی شرح 1994ء میں 40 فیصد کے مقابلے میں 38 فیصد پر جمود کا شکار ہے۔ فی ایک لاکھ افراد میں تپ دق کا لاحق ہونا بھی بڑھا ہے، یہ 1995ء میں 150 سے بڑھ کر 2004ء میں 181 ہوگئی۔ صحت پر عوامی اخراجات میں اتنی ہی کمی واقع ہوئی ہے جتنی کہ مجموعی ملکی پیداوار میں، یہ 1995ء میں 0.8 فی صد سے کم ہوکر 2004ء میں 0.4 فیصد ہوئی ہے۔

اعداد و شمار دکھاتے ہیں کہ سال 2006-2007ء کے دوران پاکستان کے دفاعی اخراجات تقریباً 250 ارب روپے تھے، جب کہ صحت اور تعلیم پر بالترتیب صرف چھ ارب روپے اور 22.6 ارب روپے خرچ کیے گئے۔ فخرالدین جی ابراہیم نے حال ہی کہا تھا کہ ''گذشتہ 30 سالوں کے دوران تعلیم پر 178 ارب روپے جب کہ صحت پر 98 ارب روپے خرچ کیے گئے ہیں اور دوسری طرف اکیلے دفاع نے تقریباً 2835 روپے ہڑپ لیے ہیں۔''

یاد رکھیں کہ گذشتہ 30 سال کے لیے صحت اور تعلیم پر خرچ کیے گئے مشترکہ اخراجات اکیلے 2006-2007ء میں دفاع پر خرچ کی گئی رقم کے مقابلے میں تھوڑا سا زیادہ ہیں۔ تو پھر اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ ہمارے پاس ایٹم بم ہیں لیکن ہماری آبادی کا 73 فی صد بیشتر ناخواندہ ہے، غربت کی لکیر سے نیچے رہ کر سڑ رہا ہے اور صحت کی ان سہولیات کے ساتھ نبرد آزما ہے جو چوپایوں کے بھی لائق نہیں ہیں۔ اقوام متحدہ کی ہیومن ڈویلپمنٹ انڈیکس میں پاکستان کا ناقابلِ رشک 137 واں نمبر اس بات کو واضح طور پر عیاں کرتا ہے۔ غربت کی خاموش سونامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ 2007ء میں عالمی سطح پر خوراک کی قیمتوں میں 43 فی صد اضافہ ہوا جب کہ چاول کی قیمتوں میں 75 فی صد اضافہ ہوا ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک نے کہا ہے کہ ایک ارب ایشیائی غذائی قلت کے خطرے میں ہیں۔ 30 سال میں خوراک کی قیمتیں اپنی بلند ترین سطح پر ہیں اور دنیا بھر میں تقریباً 850 ملین افراد دائمی بھوک سے دوچار ہیں جب کہ مزید 100 ملین افراد فاقہ کشی کرنے پر مجبور کیے گئے ہیں اور مزید 30 ملین افریقی اس وقت غربت کا شکار ہیں۔

جنگ کی لت کی وجہ سے دنیا کا وجود خطرے میں ہے۔ اشیائے خورد ونوش کی مہنگائی، بڑھتی ہوئی غربت، سماجی اُتھل پُتھل، بنیاد پرستی، جنگ پرستی، عسکریت پسندی اور عالمی حدّت، یہ ساری منحوس شبیہیں بائبل میں بیان کردہ پیش گوئیوں جیسی بڑی آفات کا پیش خیمہ ہیں جن میں ناموزوں اور نااہل عالمی قیادت تیزی لا رہی ہے جیسا کہ وہ فوری سماجی واقتصادی اور ماحولیاتی خدشات پر غفلت برت رہی ہے۔ یہ عالمی بحران دنیا کو تسلسل کے ساتھ نیست ونابود کرنے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ 1949ء میں جب چینی پیپلز آرمی بڑے شہروں کے قریب پہنچ رہی تھی اور سماجی برائیوں میں ملوث افراد کو سخت سزائیں دے رہی تھی تو وہاں بہت سے لوگ تھے جو لالچ میں اندھے تھے اور ڈٹے رہے اور پھر انہیں حتمی جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ بالکل اسی طرح کی علامات اس دنیا کے ناقابلِ تسکین حد تک لالچی اور طاقت کے بھوکے لوگوں کی طرف سے دیکھنے کو مل رہی ہیں، بنیادی فرق یہ ہے کہ ان چند افراد کی لالچ، لاپرواہی اور کوتاہ بینی کے لیے پوری دنیا کو حتمی جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ آج دنیا ویسی ہی ہے جیسا کہ یہ خالص ترین نائٹروگلسرین سے بھرا ہوا ایک کنٹینر ہو جسے ایک اناڑی عملہ کہیں منتقل کر رہا ہو۔

جنگ کی اس لت نے دنیا کو ایک محفوظ جگہ بنائے بغیر کھربوں ڈالر برباد کر دیے ہیں۔ ذرا تصور کریں کہ روئے زمین پر زندگی کے معیار پر کیسے شاندار اثرات مرتب ہوتے اگر ان رقوم کو پرامن مقاصد کے لیے خرچ کیا گیا ہوتا، لیکن پھر امن تو حصے داروں کے لیے وہ منافع نہیں لاتا جو جنگ لاتی ہے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 6 ستمبر 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/

06-Sep-2015/war-hysteria-and-war-profits

’بینگنوں کا خادم نہیں!‘

جولائی کے مہینے میں ان لوگوں کے درمیان ایک گرما گرم بحث چھڑی ہوئی تھی جو اپنی نظریں چین، پاکستان اقتصادی راہداری (سی پی ای سی/سی پیک) سے ملنے والے فوائد پر جمائے بیٹھے ہیں اور سب اِس یا اُس راستے کی حمایت کا اظہار خیال کر رہے تھے، اس بات سے قطع نظر کہ بلوچ عوام ’ترقی‘ کے اس منصوبے کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ ڈاکٹر مالک کا پالیسی ریفارم یونٹ، جس کی کی سربراہی ماہر اقتصادیات قیصر بنگالی کر رہے ہیں، نے 25 جون کو ’چین پاکستان اقتصادی راہداری: راستے کا تنازع‘ کے عنوان سے ایک رپورٹ پیش کی۔

اس رپورٹ میں کہا گیا کہ ایک ایسے راستے کو ترجیح دینے سے، جو خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے بجائے پنجاب اور سندھ سے گزرے، وفاقی حکومت ملک کی تمام وفاقی اکائیوں کی ضروریات اور خواہشات کو مدنظر رکھنے میں ناکام رہی ہے اور آج کی سیکورٹی خطرات کے پیش نظر مستقبل میں پیدا ہونے والے صوبائی عدم اتفاق اور سیاسی عدم استحکام کا سودا لگا رہی ہے۔ راستے کے حوالے سے یہ رپورٹ واضح طور پر اسلام آباد کے مؤقف کے خلاف تھی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سی پیک کے لیے حکومتی منصوبے پر اس شدید مخالفت والی رپورٹ کے تین دن سے بھی کم عرصے بعد بلوچستان کی ڈاکٹر عبدالمالک اینڈ کمپنی کم ظرفی و بزدلی سے اپنے مؤقف سے مکر گئی اور سی پیک کے ذریعے بلوچستان میں چینی سرمایہ کاری کا خیر مقدم کیا۔ ان کی طرف سے غیر معمولی رفتار کے ساتھ اپنے مؤقف سے پلٹا مارنے، اگرچہ انہوں نے کہا تھا کہ وفاقی حکومت کا اپنی توجہ مشرقی علاقوں پر مرکوز کرنا بلوچستان کو اپنے بنیادی ڈھانچے کی ترقی کرنے کے مواقع سے محروم کر دے گا، مبصرین حیرت سے اپنا سر کھجاتے رہ گئے کہ اس کے پیچھے کون سی وجوہات تھیں جن کی بنا پر انہوں نے پسپائی اختیار کی اور بلوچستان کے اس نام نہاد متوسط طبقے، قوم پرست چیمپئنز نے کیسے ذلت

آمیز انداز میں سرخم تسلیم کرلیا۔

اس بات نے مجھے ایک بادشاہ کے بارے میں ایک کہانی کی یاد دلائی جو شکار کے دوران ایک ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے اپنے ایک واحد وفادار درباری کے ساتھ اصل جتھے سے الگ ہوگیا اور آخر میں ایک کسان کے گھر پہنچا۔ وہ اس امید میں وہاں بیٹھے رہے کہ جتھہ تمام ساز وسامان کے ساتھ وہاں آجائے گا لیکن وہ نہیں آیا تو بادشاہ کو بھوک لگی اور اس نے کسان سے کہا کہ وہ کھانا بنائے۔ کسان نے کہا کہ اس کے پاس اور کچھ نہیں ہے ماسوائے چند بینگنوں کے جنہیں پھر پکایا گیا۔ جب کھانا پیش کیا گیا تھا تو بھوکے بادشاہ کو اس کا ذائقہ اچھا لگا اور ان کی تعریف کی؛ درباری نے بھی اس کے بہت سے حیرت انگیز ادویاتی اور صحت بخش خصوصیات کی تعریف کی اور ان کی تعریف میں زمین آسمان ایک کردیے۔ تھوڑی دیر بعد بادشاہ کا پیٹ، جو کہ سادہ کھانے کا عادی نہیں تھا، گڑگڑانے اور غرانے لگا تو اس نے کہا کہ بینگن اچھی خوراک نہیں ہے اور انہیں یہ نہیں کھانا چاہیے تھا۔ تو درباری نے کہا کہ بینگن خدا کی طرف سے پیدا کی گئی تمام سبزیوں میں سب سے زیادہ برا ہے، اس بادشاہت کے اندر اس کے تمام پودوں کو تباہ کیا جائے اور اس کے کھانے پر پابندی لگا دی جائے۔ بینگن کے حق میں ان تمام توصیف وثنا کے بعد اسی کے خلاف دھواں دار تقریر نے بادشاہ کا دل خوش کردیا اور اس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ تھوڑی دیر قبل درباری نے انہی کی تعریف میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن اب بری طرح سے اس کی برائی کررہا ہے۔ درباری نے جھٹ سے کہا کہ ''عالی جاہ، میں آپ کا خادم ہوں اور بینگنوں کا نہیں؛ اگر وہ آپ کو پسند ہیں تو میں ان کی تعریف کروں گا اور اگر نہیں ہیں تو میں ان کی برائی کروں گا۔''

ڈاکٹر مالک اور قیصر بنگالی اس بینگن والے واقعے کے درباری سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ ان کی وفاداری راولپنڈی اور اسلام آباد کے ساتھ ہے؛ وہ بینگن کے خادم نہیں ہیں اور یہ لوگ وہ سب کچھ کریں گے جس سے ان کے فوجی اور سیاسی مرشدین خوش ہوں۔ انہیں عوام یا ان کے حقوق اور اختیارات سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ وہ صرف اپنے آقاؤں یا اپنے مفادات کے خادم ہیں۔ اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر مالک کو ان کے مرشدین نے جون 2013ء میں مسند پر بٹھایا۔ دو سال کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ جعلی ڈومیسائل بلوچ عوام کو ان کے روزگار سے محروم کررہے ہیں جن کے وہ خواہاں ہیں۔ انہوں نے سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے بین الصوبائی رابطہ کو بتایا کہ بہت سارے لوگ جعلی ڈومیسائل سرٹیفکیٹوں پر بلوچستان کے کوٹہ کی بنیاد پر مختلف وفاقی محکموں اور کارپوریشنوں میں نوکریاں حاصل کررہے ہیں۔ کوئی یہ ضرور سوچے ہوگا کہ وہ اتنے عرصے سے کیا کررہے تھے۔ جعلی ڈومیسائل بنانے والا یہ گروہ، ان کی ملی بھگت اور رضامندی کے ساتھ، طویل عرصے سے منظّم طور پر اور جان بوجھ کر چلایا جارہا ہے تاکہ بلوچ عوام اقتصادی زینے پر ترقی کرنے سے محروم رہیں۔

انہوں نے سینڈک کے بارے بھی میں شکایت کی اور کہا کہ: ''ہمیں کچھ اندازہ نہیں ہے کہ سینڈک پراجیکٹ سے چینی کمپنی کی طرف سے کتنا سونا اور دیگر معدنیات نکالی جارہی ہیں۔'' میں انہیں بتاؤں گا کہ سینڈک میٹل لمیٹڈ نے مئی 2009ء میں نے کہا تھا کہ 2004ء سے 2008ء کے دوران 633.573 ملین ڈالر مالیت کے 7.746 ٹن سونے، 86013 ٹن تانبے، 11.046 ٹن چاندی اور 14482 ٹن مقناطیسی ساندر لوہے کی پیداوار ہوئی تھی۔ اس کے بعد کتنا نکالا گیا ہے انہیں کوشش کرکے معلوم کرنا چاہیے۔ وہاں نگرانی کے بغیر چین کی طرف سے حد سے زیادہ کی جانے والی کانکنی سے 2017ء کے بعد کوئی تانبا یا سونا نہیں بچے گا۔ زہریلا فضلہ بکثرت ہوگا، کیوں کہ سونے کے ہر 28 گرام کے لیے 79 ٹن فضلہ پیدا ہوتا ہے۔

اگر انہیں، بطور بلوچستان کے مبینہ چیف ایگزیکٹو کے، کوئی اندازہ نہیں ہے کہ چینی سینڈک میں کیا کررہے ہیں تو پھر انہیں کیا پتہ چلے گا کہ چینی گوادر میں کیا کررہے ہیں کہ جہاں پر وہ بڑے پیمانے پر ایک خصوصی اقتصادی زون کی ترقی کے لیے اس وقت 40 سالہ لیز حاصل کررہے ہیں؟ اس معاہدے کے تحت 923 ہیکٹر (2300 ایکڑ) ٹیکس سے مستثنیٰ زمین چائنا اوورسیز پورٹ ہولڈنگ کمپنی (سی او پی ایچ سی) کو تفویض کی جائے گی۔ مزید برآں، چینیوں کی حفاظت کے لیے 10000 سے 25000 افراد پر مشتمل ایک خصوصی سیکورٹی فورس تشکیل دی جائے گی۔

جسمانی جنگ کے علاوہ، ایک ڈیموگرافک (آبادیاتی خصوصیات میں تبدیلی کی) جنگ بھی

بلوچ کے خلاف چھیڑی جا چکی ہے اور یقینی طور پر یہ جنگ ڈاکٹر مالک کی حکومت کی ملی بھگت کے بغیر نہیں لڑی جا رہی۔ سینیٹر جہانزیب جمالدینی نے سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے داخلہ کو بتایا کہ حکومت خفیہ طور پر بلوچستان کے مختلف اضلاع میں تیزی کے ساتھ آبادیاتی خصوصیات میں تبدیلی لائی ہے اور اس سے وہاں وہ اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر رہے ہیں۔

حکومتی اعداد و شمار کی تازہ ترین رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ بلوچستان نے تقریباً 250 فی صد کے ساتھ دیگر تمام صوبوں کی نسبت آبادی میں سب سے زیادہ اضافہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ یقینی طور پر یہ اضافہ بلوچ کی آبادی میں نہیں ہوا ہے، جیسا کہ انہیں مسلسل فوجی کاروائیوں کے ساتھ ساتھ طویل عرصے سے جاری سفاکانہ طور پر اغوا کر کے، قتل کر کے پھینکنے کی پالیسی کے ذریعے تہس نہس کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر مالک کے فوجی اور سیاسی مرشدین کی طرف سے سفاکانہ طاقت کے حقیقی استعمال اور دھمکی آمیز زبان کے استعمال کا مقصد اپنے حقوق کے حصول کے لیے بلوچ کے عزم کو کمزور کرنا ہے۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی طرح کا کام کر سکتے ہیں اور بلوچ عوام کو روک سکتے ہیں تو انہیں حبیب جالب کے اس شعر کو اچھی طرح یاد کرنا ہوگا جو انہوں نے ایک مشاعرہ میں یحییٰ خان کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پڑھا تھا؛

''تم سے پہلے وہ جو ایک شخص یہاں تخت نشین تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے کا اتنا ہی یقین تھا''

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 13 ستمبر 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion
/13-Sep-2015/not-the-brinjals-servant

ناانصافیوں کا سامنا کرنا

غلامی کی طرح استعمار بھی انسانوں کی وقعت گرا دیتا ہے کیونکہ یہ دونوں ان کو آزادی سے اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق زندہ رہنے کے حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہ ذلت و انحطاط تب تک جاری رہتی ہے جب تک کہ غلام اور زیر استعمار لوگ اپنی صورتحال کی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں اور ناانصافیوں کے خلاف مزاحمت شروع کر دیتے ہیں۔ مزاحمت ان کے لیے واحد دستیاب راہِ نجات ہوتی ہے۔ بقول روزا لکسمبرگ کہ، ''وہ لوگ جو نہیں ہلتے اپنی زنجیروں کو محسوس نہیں کرتے۔'' انہیں ہلنا پڑتا ہے تاکہ وہ جانیں کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

گذشتہ ہفتے سندھ کے وزیر خزانہ سید مراد علی شاہ نے پنجاب کو گیس کی فراہمی روکنے کی دھمکی دی، اگر سندھ کے مختص کیے گئے حصے کا احترام نہیں کیا گیا تو۔ انہوں نے کہا کہ سندھ پاکستان میں پیدا ہونے والی گیس کی کل پیداوار کا 70 فی صد پیدا کرتا ہے اور آرٹیکل 158 کے تحت اسے استعمال کرنے کا پہلا حق اسے حاصل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) کی حکومت گہری نیند میں تھی چونکہ ان پر یہ ظلم سندھ میں گیس کی دریافت کے بعد سے ہو رہا ہے۔ یہ صرف اس وقت ہوا جب خلقی و موروثی طور پر کرپٹ اور مراعات یافتہ اسٹابلشمنٹ نے اس بات کا برا منانا شروع کیا کہ پیپلز پارٹی کے لوگ اس بادآورد کرپشن میں سے اپنے مناسب حصے سے زیادہ لے جا رہے تھے اور اس داؤ پیچ کا استعمال لوگوں کے فائدے کے لیے نہیں تھا بلکہ اس کا حصہ بڑھانے کے لیے تھا کہ جس پر سید مراد علی شاہ ہر بڑا کر جاگے تھے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یقیناً وہ ایک بار پھر سو جائیں گے جب دباؤ کم ہو جائے گا۔

اسٹریٹنگتھنگ پارٹیسپیٹری آرگنائزیشن (ایس پی او) کے چیف ایگزیکٹو نصیر میمن اپنے

مقالے 'تیل اور گیس کے وسائل اور صوبوں کے حقوق: سندھ کا کیس سٹڈی' میں کہتے ہیں:
''سندھ بلوچستان ساتھ مل کر گیس کی قومی پیداوار کا 93 فی صد سے زائد پیدا کرتے ہیں اور اسی سبب انہیں پاکستان کی توانائی کا پٹارا سمجھا جا سکتا ہے۔'' اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ آرٹیکل 158 کے باوجود پنجاب سب سے زیادہ ہڑپ لیتا ہے، وہ 2008ء کے پاکستان کی توانائی کی سالانہ کتاب کے جدول کا حوالہ دیتے ہیں: ''سندھ نے اپنی پیداوار کا صرف 46 فی صد استعمال کیا حالانکہ بلوچستان نے صرف 25 فی صد جب کہ پنجاب نے گیس کی قومی پیداوار کے حساب سے اپنی پیداوار کے مقابلے میں حیرت انگیز طور پر 930 فی صد استعمال کیا۔'' پنجاب نے 68,608 ملین کیوبک فٹ کی پیداوار دی مگر 6,38,008 ملین کیوبک فٹ استعمال کیا جو کہ 2007ء میں 930 فی صد سے بھی زیادہ تھی۔ یہ استعمال اب مزید بڑھ چکا ہے۔ پنجاب میں 2,162 سی این جی اسٹیشن کام کر رہے ہیں، جب کہ اس کے مقابلے میں قدرتی گیس کے سب سے زیادہ پیداوار دینے والے صوبہ سندھ میں صرف 587 ہیں۔

وفاقی حکومت منبعوں کے کنوؤں کے نرخوں کی بنیاد پر صوبوں کو 12.5 فی صد رائلٹی دیتی ہے لیکن تیل اور گیس کی پیداوار دینے والے تعلقوں/ اضلاع کو ان کے فوائد کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے کوئی پالیسی موجود نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یو این ڈی پی کی انسانی ترقیاتی رپورٹ (2003ء) کے مطابق، ''تیل کی بڑی پیداوار دینے والا ضلع بدین درجہ بندی کے حساب سے ملک کے 91 اضلاع میں سے 60 ویں نمبر پر ہے۔ اسی درجہ بندی کے تحت (بشمول کراچی اور حیدرآباد کے) سندھ کے صرف تین اضلاع نے ہیومن ڈیولپمنٹ انڈیکس میں ترقی کے لحاظ سے ملک کے سب سے اوپر والے 30 اضلاع کی فہرست میں جگہ پائی ہے۔ اسی رپورٹ میں دیہی سندھ کو ہیومن ڈیولپمنٹ انڈیکس پر درجہ بندی کے لحاظ سے تمام صوبوں کے تمام شہری اور دیہی علاقوں میں سب سے نیچے رکھا گیا ہے۔''

ناانصافی نہ صرف مقامی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے منافع کی کھپت اور استعمال میں ہے

بلکہ منبعوں کے کنوؤں کے نرخوں میں بھی بڑی حد تک امتیازی سلوک برتا جاتا ہے۔ بلوچستان کے گیس فیلڈ میں کنوؤں کی فی ملین برٹش تھرمل یونٹ (ایم ایم بی ٹی یو) کی اوسط قیمت روپوں میں 66.64 ہے، سندھ کے لیے اس کی قیمت 142.57 روپے ہے اور پنجاب کے لیے 162.93 روپے ہے۔ یہ پورا بندوبست پنجاب کے حق میں جاتا ہے۔

گیس انفراسٹرکچر ڈویلپمنٹ سیس/ٹیکس (جی آئی ڈی سی) بھی دوسروں کو اس کے اخراجات کی ادائیگی کروانے سے پنجاب کے حق میں جاتا ہے کیونکہ یہ گیس کی سب سے کم پیداوار دیتا ہے اور سب سے زیادہ استعمال کرتا ہے۔ قدرتی مائع گیس (ایل این جی) کی قطر سے رسوا کن درآمد بھی پنجاب کے حق میں جاتی ہے کیوں کہ یہ سندھ اور بلوچستان پر اضافی قیمت کا بوجھ ڈالتی ہے جو اپنی پیداوار سے بہ آسانی اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ اگر آئین کا آرٹیکل 158 لاگو کیا جائے تو پنجاب کے سوا کسی صوبے کو ایل این جی کی درآمد کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ خاقان عباسی کا کہنا ہے کہ گیس کے تجارتی صارفین، کھاد بنانے والوں اور دیگر صنعتوں سمیت، آنے والا موسم سرما سوائے پنجاب کے ہر جگہ قدرتی گیس کے بغیر گزاریں گے چونکہ پنجاب ایل این جی استعمال کرتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ایل این جی کی اضافی لاگت دیگر صوبے ادا کرتے ہیں۔

بلوچستان کی طرح سندھ کو بھی اسلام آباد کی طرف سے مختلف طریقوں سے ناموافق حالات میں رکھا گیا ہے لیکن ان ناانصافیوں کے خلاف ردِعمل اور ان ناانصافیوں کا سامنا بالکل مختلف طور سے کیا جا رہا ہے۔ بلوچستان میں لوگوں نے بالکل اسی انداز میں ناانصافیوں کے خلاف مزاحمت کی ہے جس انداز میں ناانصافیاں ان پر تھوپی گئی ہیں، یعنی کہ طاقت سے، جب کہ سندھ میں زیادہ تر یہ ذلت آمیز اطاعت گزاری یا محض علامتی احتجاج کی شکل میں رہی ہے کیوں کہ غیر فقری بزدل سیاست دان اپنی مراعات کے تحفظ کے لیے سرِخم تسلیم کرتے ہیں اور اسلام آباد کو مطمئن کرنے کے لیے جھک کر سلامی دیتے ہیں اور صرف سندھ کے مفادات کا دفاع کرنے کا دکھاوا کرنے کے لیے

شور مچاتے ہیں۔

ان کے علاوہ وہاں بہت سے نام نہاد قوم پرست بھی ہیں جنہوں نے مبینہ طور پر سندھ کا نصب العین اپنایا ہوا ہے۔ ان نام نہاد قوم پرستوں میں سے کتنے سندھی حقوق کا دفاع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، یہ چیز پنجاب کے مقابلے میں سندھ کو حاصل حقوق کی سطح سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی عیارانہ جہل پسندی اور اصلاح دشمنی سے بناوٹی قوم پرستی کے ذریعے لوگوں کو اندھیرے میں رکھتے ہیں جو کہ لوگوں کو اس بات پر یقین کرنے کے فریب میں ڈال دیتے ہیں کہ یقیناً وہ ان کے نصب العین کے چیمپئن ہیں۔ ایک مثال اس کی بہتر وضاحت کرے گی۔ حال ہی میں کراچی میں جی ایم سید کی طرف سے لکھی گئی کتاب 'سندھ کہانیاں' کی تقریب رونمائی میں ایک مقرر سید غلام شاہ، جنہیں رپورٹر نے ایک ممتاز سندھی قوم پرست بتایا ہے، نے کہا کہ سندھیوں کا مقدمہ نہ صرف برطانوی راج، جنہوں نے 1843ء میں ان کی زمین غصب کی تھی، کے خلاف ہے بلکہ یہی مقدمہ ٹالپروں کے خلاف بھی ہے جن کی حکومت سندھ کی تاریخ میں سب سے بدترین تھی۔

ساٹھ سالہ ٹالپر حکمرانی، چاہے اچھی یا بری، 172 سال قبل ختم ہو چکی اور پھر اس کے جو بھی اثرات تھے انہیں ٹھیک کرنے یا بہتری لانے کے لیے کافی وقت دستیاب تھا۔ اس کا آج کے دن سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ جو آج متعلقہ ہے وہ آج کے دن موجود غاصبوں کی طرف سے سندھ کا غصب کیا جانا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ان قوم پرستوں کے پاس ان ناانصافیوں کے بارے میں کہنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں ہے یا سندھ کے بیراجوں کی زمین کے 53 فیصد کے بارے میں جو کہ غیر سندھیوں کو الاٹ کی گئی ہیں۔ وہ ٹالپروں پر تنقید کرتے ہیں جس سے وہ نہ صرف اپنے آپ کو آج کے دن کی جانے والی ناانصافیوں اور غاصب کی مخالفت سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں بلکہ اس عمل سے وہ ان تمام غاصبوں کو بھی بے خطا ٹھہرا دیتے ہیں، جنہوں نے 1947ء کے بعد سے سندھ کو اپنے حقوق سے محروم رکھا ہے۔

چونکہ سندھ اور سندھیوں کے پاس ایسے جعلی قوم پرست/ دانشور ہیں جو کہ ٹالپر حکمرانی کے صدیوں پرانے واقعات کے بارے میں زیادہ فکرمند ہیں، آج کے ان غاصبوں کی نسبت جنہوں نے انہیں اپنے وسائل، زمین اور حقوق سے محروم کر رکھا ہے اور ان کے حقوق کے علمبردار کے طور پر وہ جعلی قوم پرست/ دانشور ان ناانصافیوں کے تحت اسی پژمردگی کی حالت میں جیتے رہیں گے۔ سندھ کے حقوق کے نام نہاد علمبردار اور کرپٹ سیاست دان درحقیقت سندھ میں لوٹ مار، غارت گری اور اس کی عصمت دری میں معاون اور مددگار ہیں۔ جب تک کہ ناانصافیوں کا سامنا اسی انداز میں نہیں کیا جاتا جس انداز میں انہیں تھوپا جاتا ہے تب تک سندھ اور سندھیوں کے لیے کوئی اور راہِ نجات نہیں ہوگی۔ یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ''نوآبادیاتی نظام کی گرفت محض اس وقت ڈھیلی پڑتی ہے جب چھری اس کی گردن پر ہو۔'' - فرانز فینن۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 20 ستمبر 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion

/20-Sep-2015/confronting-injustices

یومِ غضب کبھی نہیں منایا گیا

یومِ غضب کے دن ہزاروں مظاہرین نے 26 ستمبر 2014ء میں اگوالا سے 43 طالب علموں کی گمشدگی کی پہلی برسی کے موقع پر میکسیکو شہر میں مارچ کیا۔ معاشرے کے ہر طبقے کے لوگوں نے اس میں شرکت کی۔ انہوں نے نعرے لگائے: ''وہ زندہ اٹھائے گئے، ہمیں وہ زندہ واپس چاہئیں'' اور یہ بھی کہ ''نہ مزید گمشدگیاں، نہ مزید اموات۔'' مارسیلو براڈسکی، جنہوں نے اپنی تصاویر میں لاپتہ افراد کو امر کر دیا ہے، کا بجا طور پر کہنا ہے کہ: ''جب کوئی گمشدگی ہو تو یہ ایک طرح سے موت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ یہ مستقل ہے، یہ ایک ایسا جرم ہے جو جاری رہتا ہے۔''

میکسیکو کی وفاقی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اگوالا اور کوکولا کی پولیس نے طلبا کو مقامی منشیات کے گروہ کے حوالے کرنے سے قبل حراست میں لیا تھا جنہوں نے مبینہ طور پر بعد میں انہیں قتل کیا اور ان کی باقیات جلا دیں۔ بین الامریکی کمیشن برائے انسانی حقوق کی طرف سے بین الاقوامی ماہرین کی ایک ٹیم بھیجی گئی جس نے حکومت کی تحقیقات کا جائزہ لیا اور اسے ناقص پایا اور یہ نتیجہ اخذ کیا 43 طلبا کی لاشیں کوکولا کے کچرے کے ڈھیر میں نہیں جلائی جا سکی تھیں۔ حکومت کے فارنسک ماہرین نے وہاں سے پائی گئی طلبا کی جلی ہوئی باقیات میں سے دو کی شناخت کر لی تھی۔

میکسیکو کے عوام اس کے برے ماضی کے باعث حکومت کی طرف سے کیے جانے والے اپنی بیگناہی کے دعوؤں پر محتاط ہیں۔ انہیں تلاتیلوکو کا قتلِ عام یاد ہے جس میں ایک اندازے کے مطابق 30 سے 300 طلبا اور عام شہریوں کو میکسیکو شہر کے تلاتیلوکو سیکشن میں پلازہ دی لاس تریس کلتوراس میں 2 اکتوبر 1968ء میں فوج اور پولیس نے ہلاک کیا تھا۔ یہ قتل عام میکسیکو شہر میں 1968ء کے اولمپکس کے افتتاح سے 10 دن قبل واقع ہوا۔ 1,300 سے زائد افراد پولیس نے

گرفتار کیے تھے۔ کبھی بھی اس بات کی تحقیقات نہیں کی گئیں کہ اس دن وہاں کتنے افراد ہلاک ہوئے۔ لہٰذا 43 طلبا کی گمشدگی 'یومِ غضب' کا موجب بنی۔

میکسیکو کے عوام کا جم غفیر ان 43 طلبا کی گمشدگی کے خلاف احتجاج کرنے باہر آیا لیکن یہاں کی کہانی مختلف ہے۔ وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے نائب چیئرمین ماما عبدالقدیر بلوچ کا دعویٰ ہے کہ 2005ء کے بعد سے 20,000 سے زائد بلوچ لاپتہ ہوئے ہیں لیکن ان کے اعداد و شمار کو مبالغہ آمیز قرار دے کر یکسر مسترد کر دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا مقصد پاکستان کو بدنام کرنا ہے جو کہ محبت و دردمندی کا ایک مجسم پیکر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں کوئی پرواہ ہی نہیں یا حتیٰ کہ وہ یہ پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ ان 4,000 بلوچوں کا کیا ہوا جن کی گرفتاری کے بارے میں اس وقت کے وزیر داخلہ شیر پاؤ نے 8 دسمبر 2005ء میں تربت میں ایک پریس کانفرنس میں اعتراف کیا تھا۔ ان 4,000 بدقسمت بلوچوں پر مقدمات چلانے یا انہیں رہا کیے جانے کے حوالے سے کوئی ریکارڈ موجود نہیں اور اس کے بعد سے ہزاروں بلوچوں کی کٹی پھٹی مسخ شدہ لاشیں پورے بلوچستان میں، حتیٰ کہ کراچی میں بھی، برآمد ہوئی ہیں۔

اس سال 15 ستمبر کو بلوچستان کے سیکرٹری داخلہ اکبر حسین درانی نے بیان دیا تھا کہ صوبائی قانون نافذ کرنے والے اداروں نے نیشنل ایکشن پلان (این اے پی) کے تحت 8,363 سے زائد مشتبہ عسکریت پسندوں کو گرفتار کیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ، ''صوبے میں مختلف کارروائیوں اور چھاپوں کے دوران سیکورٹی فورسز کی طرف سے کل 204 دہشت گرد ہلاک کیے گئے ہیں۔'' اور یہ کہ بلوچستان میں انٹیلی جنس کی بنیاد پر 1,840 آپریشن کیے گئے ہیں۔

وہ عموماً صرف ان لوگوں کی گرفتاریاں تسلیم کرتے ہیں جنہیں گواہوں کے سامنے گرفتار کیا گیا اور بعض اوقات وہ انہیں بھی تسلیم نہیں کرتے۔ تباہ کاریء زمین و املاک کی سفاکانہ پالیسی آواران، مشکے اور دیگر علاقوں میں لاگو کی جا رہی ہے جسے نہ تسلیم کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کے اعداد و شمار جاری کیے جاتے ہیں اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ ان کارروائیوں میں کتنے لوگ ہلاک، گرفتار اور

بے گھر ہوئے ہیں۔ درانی کے اعداد و شمار محض برفانی تودے کی نوک ہے۔

یہاں لاپتہ بلوچوں کے لیے عام طور پر ہمدردی کا احساس بیدار نہیں ہوتا کیوں کہ اسٹابلشمنٹ اپنے تعلیمی نظام اور متعصب میڈیا کے ذریعے بلوچ عوام کو انتہائی منفی انداز میں غیر مہذب، ترقی مخالف اور سب سے بڑھ کر پاکستان دشمن کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ عام طور پر لوگوں نے یہ فریب کاملاً نگل لیا ہے اور بلوچ کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

لوگوں کا عموماً ماننا ہے کہ شر دوسروں پر نازل ہوتا ہے اور وہ اس سے محفوظ رہیں گے۔ اسی لیے وہ ریاست کی طرف سے کیے جانے والے جبر، استبداد اور غلیظ جنگ کے شر کے خلاف احتجاج کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، جب دوسروں کو اس کا نشانہ بنایا جا رہا ہو۔ تاہم یہ غلیظ جنگ صرف بلوچستان تک محدود نہیں ہے؛ سندھ بھی اس کا شکار ہے: گذشتہ ماہ جیے سندھ متحدہ محاذ (جسمم) کے داہر ڈہیسر اس کے تازہ ترین شکار ہیں۔ خیبر پختونخوا کئی عرصے سے یہ جھیل رہا ہے اور یہ سفاکیت جنگ زدہ علاقوں میں لوگوں پر بار بار، اندھا دھند کیے جانے والے فضائی حملوں سے جڑی ہوئی ہے جہاں سب کو مشتبہ عسکریت پسندوں کے لیبل کے تحت مارا جا رہا ہے۔

حال ہی میں خیبر پختونخواہ پولیس نے جبری گمشدگیوں کی تحقیقات کے کمیشن (سی آئی ای ڈی) کے لیے 'جبری گمشدگیوں' پر ایک رپورٹ مرتب کی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پولیس کو 'جبری گم شدگیوں' کے کل 1,066 واقعات کی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں۔ ان میں سے 415 کا سراغ لگا لیا گیا ہے جب کہ ان میں سے 651 افراد ابھی تک لاپتہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سراغ لگائے گئے افراد میں سے زیادہ تر کو یا تو پہلے سے ظاہر جنگی حراستی مراکز میں قید کیا گیا تھا یا ان کے اغوا کاروں کی طرف سے انہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ سوات کے آٹھ واقعات میں لاپتہ افراد کو ان کے اغوا کاروں کی طرف سے ہلاک کیا گیا۔ ہزارہ بھی لاپتہ ہیں لیکن ان کا 'لاپتہ' ہونا رضا کارانہ ہے چوں کہ وہ یہاں موت، مسخ شدگی اور ظلم و ستم سے بچنے کے لیے محفوظ مقامات کی جانب ہجرت کر رہے ہیں۔

ماما قدیر بلوچ، فرزانہ مجید اور بلوچ لاپتہ افراد کے خاندان کے اراکین کی طرف سے کیا گیا 106 دن اور 3,000 کلومیٹر کا تاریخی طویل مارچ بلوچ کی طرف سے کیا گیا مارچ غضب تھا اور یہ ایک نہایت ہی منفرد سیاسی اور سماجی واقعہ تھا جسے لاکھوں لوگوں کی طرف سے اپنایا گیا ہوتا مگر اپنایا نہیں گیا۔ اس قدر وسعت آمیز سیاسی اور سماجی احتجاج کہیں اور کیا جاتا تو اس سے ایک سیاسی اور سماجی تحریک شروع ہو جاتی لیکن یہاں اسے با آسانی نظر انداز کر دیا گیا۔ لگتا ہے یہاں کوئی چیز لوگوں میں غیض و غضب نہیں اکساتی جب تک کہ اسے میڈیا کی طرف سے پیش نہیں کیا جاتا ہے اور بے شک جسے فوج کی آشیر باد حاصل نہ ہو۔ یہاں کوئی یومِ غضب نہیں منایا جائے گا جب تک کہ اسے سرکاری سرپرستی حاصل نہ ہو۔

یہاں ان لاپتہ افراد کی حالت زار کی جانب جذبات سے عاری بے حسی کا اظہار جرمن شاعر برٹولڈ بریخت کی 1935ء کی نظم 'جب برائی برستے بارش کی طرح آئے' میں بڑے چبھتے انداز میں کیا گیا ہے:

''جیسے کوئی شخص جو دفتری اوقات کے بعد کاؤنٹر پر ایک اہم خط لائے،
اور کاؤنٹر پہلے ہی سے بند ہو
جیسے کوئی شخص جو کسی آنے والے سیلاب سے شہر کو خبردار کرنے کی کوشش کرے،
لیکن وہ کوئی دوسری زبان بولتا ہو
وہ اسے نہیں سمجھتے
اس بھکاری کی طرح جو دروازے پر پانچویں مرتبہ دستک دے رہا ہو
جہاں سے اسے پچھلے چار بار کچھ کھانے کو دیا گیا: پانچویں بار وہ بھوکا ہو
جیسے کوئی شخص جس کا خون زخم سے بہہ رہا ہو اور وہ ڈاکٹر کا انتظار کر رہا ہو:
اس کا خون بہتا چلا جا رہا ہو

اسی انداز میں ہم آگے آتے ہیں اور بتاتے ہیں ہم پر شر نازل ہوا ہے
پہلی بار یہ خبر آئی کہ ہمارے دوستوں کو قتل کیا جا رہا ہے تو وہاں ایک ہولناک شور
برپا ہوا
اور پھر ایک سو قتل ہوئے
پر جب ایک ہزار قتل ہوئے اور پھر قتل کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا تو ہر
سُو خامشی چھا گئی
جب برائی برسنے لگے بارش کی طرح، تو کوئی نہیں چلّاتا کہ ''تھم جا!''
جب جرائم کا ڈھیر لگنا شروع ہو جائے تو وہ غیر مرئی بن جاتے ہیں
جب اندوہ ناقابلِ برداشت ہوں تو پھر گریے نہیں سنے جاتے
گریے بھی موسم گرما کی بارش کی طرح برستے ہیں۔''

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 4 اکتوبر 2015ء

http://www.dailytimes.com.pk/opinion
/04-Oct-2015/never-a-day-of-indignation

قاصدین اور نائب قاصدین

چند روز قبل اسلام آباد کے نصب کیے ہوئے بلوچستان کے مبینہ طور پر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے قوم پرست وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عبدالمالک نے ایک اجلاس میں کہا کہ انہوں نے مقامی لوگوں کو ان کا احساسِ محرومی دور کرنے کے لیے بڑے منصوبوں، بشمول چین پاکستان اقتصادی راہداری (سی پی ای سی/سی پیک) کے، میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے اور کمانڈر سدرن کمانڈ لیفٹیننٹ جنرل عامر ریاض نے اس بات کا اعادہ کیا کہ سی پیک خطے میں اقتصادی سرگرمیوں کو فروغ دے گی اور ایک بڑی تعداد میں روزگار کے مواقع پیدا کرے گی۔ جنرل نے یہ بھی کہا کہ بلوچستان کے عوام محبّ وطن اور پاکستان کے وفادار ہیں۔ مجھے ہمیشہ تعجب ہوتا ہے کہ بلوچ کو یہ بتانا کیوں ضروری ہے کہ وہ محبّ وطن اور پاکستان کے وفادار ہیں؛ شاید اسٹابلشمنٹ یہ سوچتی ہے کہ اگر اس منتر کو مسلسل دہرایا جائے تو آخر کار بلوچ اپنے حقوق سے دستبردار ہو جائیں گے اور راولپنڈی اور اسلام آباد کی ٹیبلوں سے بطور صدقہ جو کچھ بھی ان کی طرف پھینکا جائے، وہ اسے قبول کر لیں گے۔

گذشتہ ماہ ڈاکٹر عبدالمالک نے ملازمتوں پر بلوچستان کی دیرینہ شکایات دور کرنے کے لیے پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز (پی آئی اے) کے حکام سے کہا کہ وہ پروازوں کی تعداد میں اضافہ کریں اور غیر فعال ہوائی اڈوں کو بحال کریں۔ انہوں نے مزید کہا کہ بلوچستان کے نوجوانوں کو دیگر وفاقی اداروں کی ملازمتوں میں بھی ان کا جائز حصہ دیا جانا چاہیے۔ تاہم، یہ صرف ڈاکٹر عبدالمالک نہیں ہیں جو بلوچ عوام کی ملازمتوں کے بارے میں فکر مند ہیں جیسا کہ جی پنگ، چائینیز پیس ڈویلپمنٹ فاؤنڈیشن (سی پی ڈی ایف) کے ڈپٹی ڈائریکٹر، بھی پریشان لگتے ہیں۔ جولائی میں انہوں نے کہا کہ ملٹی بلین ڈالر لاگت والا سی پی ای سی منصوبہ تکمیل کے بعد گوادر کے

عوام کے لیے روزگار کے مواقع یقینی بنائے گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ عالمی تجارتی سرگرمیاں گوادر کے عوام کی طرز زندگی بدل دیں گی۔ سی پی ڈی ایف کے چیئرمین بی زونگ نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ بلوچستان کے عوام کو معیاری تعلیم اور صحت کی سہولیات فراہم کریں گے۔ جہنم کی جانب لے جانے والی سڑک نیک نیتی کے ساتھ پکی کی جارہی ہے۔

پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی خیر سگالی چیف اکاؤنٹس آفیسر جیولوجیکل سروے آف پاکستان کوئٹہ کے دفتر سے جاری کردہ ایک حالیہ اشتہار سے ظاہر ہوجاتی ہے جس میں ڈیٹا انٹری آپریٹر/ کے پی او (بیسک پے اسکیل/ بی پی ایس گریڈ 14)، جس کے لیے درکار قابلیت بی کام یا بی اے/ بی ایس سی ہے۔ ان آسامیوں کی تقسیم اس طرح ہوگی: میرٹ: ایک، پنجاب: تین، سندھ: دو، خیبر پختونخوا: ایک اور فاٹا: ایک، لیکن بلوچستان کے لیے کوئی بھی نہیں۔ اسی اشتہار میں دو جونیئر آڈیٹر (بی پی ایس 11) کے لیے خالی آسامیاں، پنجاب کے لیے ایک اور سندھ کے لیے ایک ہیں۔ نچلے درجے کے تین کلرک (بی پی ایس 7) کے لیے تین خالی آسامیوں میں میرٹ پر: ایک، پنجاب: ایک اور خیبر پختونخوا: ایک۔ آخر میں باری آتی ہے قاصد (بی پی ایس 2) کی جہاں مقامی لوگوں کے لیے دو خالی آسامیاں موجود ہیں۔ سب سے آخری نائب قاصد (بی پی ایس 1) آتا ہے اور یہاں مقامی لوگوں کے لیے آٹھ آسامیاں خالی ہیں۔

مقامی لوگوں یعنی بلوچستان میں رہنے والوں کے لیے صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ ہے؛ قاصد اور نائب قاصد کے عہدوں کا۔ قاصد اور نائب قاصد کے بارے میں چند الفاظ سے اس مضمون کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی؛ درحقیقت اس کا ترجمہ چپڑاسی اور نائب چپڑاسی ہے، یعنی پاکستانی حکومت کی نوکریوں میں بیسک پے اسکیل (بی پی ایس)/ بنیادی تنخواہ کے پیمانے پر سب سے نیچے۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان مختلف افسران کے لیے چھوٹے موٹے کام سرانجام دیں جن کے لیے وہ کام کرتے ہیں، اپنا آپ اور اپنی نوکری برقرار رکھنے کے لیے کسی قسم کا ناگوار عمل کیے بغیر اور انہیں زندہ رہنے کے لیے بعض اوقات ان افسران کے گھروں میں بھی یہی کام کرنے پڑتے ہیں۔ یہ سماجی اور اقتصادی سیڑھی کا آخری زینہ ہے جس کے ساتھ لوگ اس بے

رحمانہ مسابقت کی حامل کتا کھائے کتے کو، آدمی کھائے آدمی کو، فرقہ کھائے فرقے کو والے پاکستان میں زندہ رہنے کے لیے چمٹے رہتے ہیں۔

مقامی کی اصطلاح بھی ایک انتباہ کے ساتھ آتی ہے، چونکہ کوئی بھی کسی جعلی ڈومیسائل اور یکساں طور پر آسانی سے ملنے والے شناختی کارڈ کے ساتھ مقامی ہوسکتا ہے، جیسا کہ جسٹس (ر) افتخار محمد چوہدری کی طرح کا بلوچستان کے ڈومیسائل کے ساتھ کوئی غیر بلوچ، یکساں طور پر مشہور ارسلان چوہدری کے والد، یا مناسب تعلقات کے ساتھ جو کسی بھی طرح کے تناقص کو نظر انداز کرلیں۔ یہ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ تھے جنہوں نے گذشتہ ماہ صوبائی کوٹہ کی بنیاد پر روزگار دینے سے پہلے بلوچستان کے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ کی جانچ پڑتال کو یقینی بنانے کے لیے وفاقی حکومت پر زور دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بلوچستان میں بلوچ کے لیے حتیٰ کہ قاصد اور نائب قاصد کی نوکریوں پر بھی پابندی ہے، مگر پھر بھی ڈاکٹر عبدالمالک پی آئی اے اور دیگر وفاقی اداروں میں ملازمتوں کا مطالبہ کررہے ہیں؛ دعا کریں، پتہ نہیں انہیں وہاں کونسی نوکریوں کی پیشکش کی جائے گی!

یکم اکتوبر کے ایک حکومتی اشتہار میں پورٹس اینڈ شپنگ کی وزارت نے گوادر (علاقائی دفتر) کے گودی کے کارکنوں کی حفاظت کی مستقل نظامت کے لیے ڈپٹی ڈائریکٹر (بی پی ایس، 18) کے عہدے کے لیے درخواستیں طلب کی تھیں جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ درخواست دہندہ کم از کم مکینیکل یا الیکٹریکل انجینئرنگ میں بیچلر کی ڈگری اور پانچ سال کا تجربہ رکھتا ہو اور اس پر جنس کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اچھی بات ہے، لیکن انتباہ یہ ہے کہ صرف پنجاب کا ڈومیسائل رکھنے والے افراد درخواست دے سکتے ہیں۔ شاید وہاں یہ کام کرنے کے لیے کوئی بلوچ اتنی اہلیت نہیں رکھتا لہٰذا اسے کرنے کے لیے پنجاب سے کسی کو آنا چاہیے۔

اس ماہ کے اوائل میں وزیراعظم کے مشیر برائے امور خارجہ اور قومی سلامتی سرتاج عزیز نے سینیٹ کو بتایا کہ بیرونِ ملک تعینات 74 سفیروں اور ہائی کمشنروں میں سے صرف تین کا تعلق بلوچستان سے ہے اور پنجاب سے 39 ہیں؛ میں تو اس بات کو بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ یہ تینوں بلوچ ہیں۔ میں قاری کو حیران نہیں کروں گا کہ 40 وفاقی سیکرٹریوں کے موجودہ مجمع میں بلوچستان

سے کوئی بھی نہیں ہے، سندھ سے صرف ایک جب کہ پنجاب کے پاس سب سے بڑا حصہ ہے خیبر پختونخوا کے بعد۔ بلوچستان سے صرف ایک ایڈیشنل سیکرٹری ہے۔ بظاہر اسلام آباد کو لگتا ہے کہ بلوچ محض اس قابل ہیں کہ وہ قاصدین اور نائب قاصدین ہوں۔

میرے دوست فاروق سلہریہ صاحب نے ایک نجی روزنامے میں اپنے ستمبر 2013ء کے مضمون 'تعلیمی رنگ بھید' میں کہا تھا کہ: ''بلوچستان کو ایک کالونی جیسی حیثیت دی گئی ہے جس کی جھلک ہائر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) کی تقسیم کار میں ملتی ہے۔ یہ امتیازی سلوک کافی واضح ہے یہاں تک کہ جب اسکالر ہائر ایجوکیشن کمیشن کے وظائف پر بیرونِ ملک بھیجے جاتے ہیں۔ اگرچہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے چھوٹے صوبوں کے حق میں توازن جھکانے کے لیے کوٹہ سسٹم متعارف کرایا، ہائر ایجوکیشن کمیشن کی بیوروکریسی اسے پنجاب کے حق میں کرنے کے لیے طریقہ کار میں توڑ مروڑ کی کئی ترکیبیں جانتی ہے۔ اس کے نتیجے میں 60 فیصد سے زائد پنجابی اپنے 50 فیصد کے کوٹہ پر بیرونِ ملک گئے جب کہ بلوچ کی نمائندگی اپنے چھ فیصد کوٹہ سے بھی کم رہی۔''

اپنے زیادہ تر جعلی 4,000 ووٹوں کے ساتھ منتخب دست چنیدہ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ جب بلوچ مفادات کی دیکھ بھال پر فائز ہوں تو بلوچ حقوق کو روندا جاتا رہے گا۔ جدید دور کی ایک تمثیل اس بات کی وضاحت کرے گی کہ وہ اور دیگر بلوچ سیاست دان پاکستان کی خدمت کرنے میں کس طرح سے پیچھے کی طرف سے جھکتے ہیں: کسی شخص کو ایک جادوئی چراغ ملا اور ایک جن نمودار ہوا جس نے اس کی تین خواہشات پوری کرنے کا کہا۔ اس کی پہلی خواہش یہ تھی ایک بہت بڑا، شاندار محل تعمیر کیا جائے، دوسری یہ کہ اسے کچھ مالکان دیے جائیں اور تیسری یہ کہ اسے وہاں پر بطور چوکیدار کے کام پر لگایا جائے۔ ہوسکتا ہے انہوں نے بھی اس جن سے دیگر مقامی لوگوں کے لیے قاصد اور نائب قاصد کی ملازمتوں کی فرمائش کی ہو۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 18 اکتوبر 2015
http://www.dailytimes.com.pk/opinion/18-Oct-2015/qasids-and-naib-qasids

موت کے سائے تلے شجاعت

ماما عبدالقدیر ریکی کے بیٹے شہید میر جلیل ریکی 13 فروری 2009ء میں اغوا کیے گئے؛ وہ بلوچ ریپبلکن پارٹی کے سیکرٹری اطلاعات تھے۔ قدرتی طور پر ماما قدیر نے اپنے بیٹے کی رہائی کی کوشش کی کیونکہ 'مارو اور پھینک دو' کی منظم پالیسی کی پیشگی طور ابتدا ہو چکی تھی اور بلوچ کارکنوں کی بری طرح سے مسخ شدہ لاشیں بلوچستان بھر میں ملنا شروع ہوئی تھیں۔ اپنے بیٹے کی حفاظت کو یقینی بنانے کی کوششوں کے بدلے میں انہیں صرف اور صرف جھوٹے وعدے یا دھمکیاں ملیں۔ جب انہیں احساس ہوا کہ ریاست کو اس ظلم وستم کے لیے شاید ہی کوئی چیلنج کرے تو انہوں نے بلوچ کارکنوں کے اس غیر انسانی اور ظالمانہ اغوا اور قتل کے خلاف احتجاج شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس احتجاج کو اب 2,287 دن پورے ہو چکے ہیں۔ 28 جولائی 2009ء کو پریس کلبوں کے باہر علامتی بھوک ہڑتالی احتجاج کیے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ 27 ستمبر 2009ء میں لاپتہ بلوچوں کی بازیابی کے لیے ایک تنظیم وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز قائم کی گئی، ماما قدیر بطور اس کے وائس چیئرمین اور نصر اللہ بلوچ، جن کے چچا اصغر بنگلزئی کو 2001ء میں اغوا کیا گیا تھا، بطور اس کے چیئرمین۔

ماما قدیر نے ہر ممکن دروازے پر دستک دی اور اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے تمام طریقے اپنائے؛ انہیں یقین دہانی کرائی گئی، دھمکیاں دی گئیں اور وہ بہلائے پھسلائے گئے مگر جلیل بازیاب نہ ہوئے۔ پھر 24 نومبر 2011ء کو 33 اذیت ناک مہینوں کے بعد ان کی لاش ملی۔ غیر انسانی تشدد کیے جانے کے علاوہ ان کے دل میں تین گولیاں ماری گئی تھیں، وہ دل کہ جسے ان کے شیطان صفت دشمن زیر کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ماما قدیر جلیل کے بیٹے بیورغ کو ان کے جنازے پر لے گئے اور اسے بتایا کہ کس طرح سے اس کے والد کی موت واقع ہوئی ہے۔

مختلف پریس کلبوں کے باہر ان کی علامتی بھوک ہڑتالوں، بشمول کراچی اور اسلام آباد، کی حتیٰ کہ کوئی شنوائی بھی نہیں ہوئی۔ اس کے بجائے ماما قدیر اور دیگر، جو احتجاج کر رہے تھے، کو دھمکیوں اور ہراساں کرنے کا سامنا کرنا پڑا۔ لاپتہ افراد کے معاملے پر سپریم کورٹ کی سماعتوں کے ڈھونگ اور 100 سے زائد مشہور زمانہ سماعتوں کے باوجود بلوچستان میں سیاسی کارکنوں کے خلاف 'مارو اور پھینک دو' کی وحشیانہ پالیسی کے خلاف کسی ایک شخص پر بھی فردِ جرم عائد نہیں کی گئی مقدمہ چلانا تو دور کی بات ہے۔ ایسا لگتا تھا اور لگتا ہے کہ دنیا اور یہاں کا معاشرہ بلوچ، جو کہ جائز طور پر اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں، کے خلاف کیے جانیوالے وحشیانہ اور غیر انسانی تشدد اور جبر کے باوجود سکون سے رہ رہے ہیں۔ یہاں جس کسی کو بھی اسٹابلشمنٹ ریاست مخالف یا دہشت گرد کا لیبل لگا دے، اسے سزا سے استثنیٰ کے ساتھ قتل کیا جا سکتا ہے اور کوئی بھی اس کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، اس ڈر سے کہ اسے بھی دہشت گرد کا لیبل لگا دیا جائے گا۔

ماما قدیر اور دیگر جو اپنے حقوق کے حصول کی کوششیں کرتے ہیں، ایک منفرد طبقے کے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، اگرچہ تمام تر سنگین نتائج، جو سچ اور انصاف کے لیے کھڑے ہونے پر بھگتنا پڑتی ہیں، کو جاننے کے باوجود وہ اپنے لوگوں کے لیے انصاف کی خاطر اپنے عزم میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ ماما، جنہوں نے اپنا ایک بیٹا کھو دیا، ان نتائج کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ماما قدیر یہ بات سمجھتے تھے کہ لاپتہ اور قتل کیے گئے بلوچ کارکنوں کی حالتِ زار اور ان کے اہلِ خانہ کے دکھ درد کو اجاگر کرنے کے لیے انہیں کچھ ایسا کرنا ہوگا جس سے لوگ اس بے حسی سے بیدار ہو جائیں جو ان پر چھائی ہوئی ہے۔ انہوں نے سب سے بہترین طریقہ اپنایا اور فیصلہ کیا کہ لاپتہ اور قتل کیے گئے افراد کی حالتِ زار کو عوام کی عدالت میں لے جایا جائے جیسا کہ لوگ اس مسئلے کو حل کرنے میں خوف یا تذبذب کا شکار تھے۔ ماما قدیر نے فرزانہ مجید (سیکرٹری جنرل وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز)، جن کے بھائی ذاکر مجید، بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن-آزاد (بی ایس او-آزاد) کے وائس چیئرمین، جنہیں 8 جون 2009ء کو اغوا کیا گیا تھا، سمّی بلوچ، ڈاکٹر دین محمد کی بیٹی جنہیں 28 جون 2009ء کو اغوا کیا گیا تھا، اور دیگر لاپتہ افراد کے خاندانوں کی خواتین کے ساتھ 27 اکتوبر

2013ء کو بلوچستان میں لاپتہ افراد اور مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے کوئٹہ سے کراچی تک پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔

یہ مارچ پجارو اور پراڈو گاڑیوں کا نہیں تھا بلکہ یہ بلوچستان کے حقیقی اولادوں کا مارچ تھا، اس سرزمین کی سب سے اعلیٰ شخصیات کا مارچ جنہیں اپنے ان پیاروں کو کھونے کے درد کا سامنا کرنا پڑا ہے جن کی بہادر روحوں نے اپنے ناقابلِ تنسیخ حقوق کا مطالبہ کرنے کی ہمت کی تھی۔ اس تاریخی مارچ کے اعلان کا پلے کارڈ ایک ٹھیلے پر نصب کیا گیا تھا۔ یہ اپنے لاپتہ اور قتل کیے گئے پیاروں کے لیے لگن اور عزم کے اظہار میں ان کے رشتہ داروں کا مارچ تھا۔ یہ اس سفر کے اٹھائے گئے قدم تھے جس کی ابتدا 27 مارچ 1948ء میں ہوئی تھی اور یہ بلوچ حقوق کے حصول تک جاری رہے گی۔

بہت سارے لوگ، بشمول دوستوں کے، شک میں مبتلا تھے جنہوں نے سوچا کہ یہ مشکل سفر کبھی بھی مکمل نہیں ہو پائے گا جس میں 70 سال سے زائد کا ایک بوڑھا آدمی، 10 سالہ علی حیدر، جن کے والد محمد رمضان 14 جولائی 2010ء میں لاپتہ ہو گئے تھے، اور بلوچ لڑکیاں جو پہلی بار ایک ایسے سفر پر نکلی تھیں جو غیر یقینی صورتحال اور خطرات سے بھری ہوئی تھی، ایک ایسا سفر جو کہ عوامی تھا؛ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان لڑکیوں کی جرأت مثالی تھی، ان درپیش مشکلات کا سامنا کرنے اور ان ممنوعہ روایات کو توڑنے اور ایک ایسی سفاک ریاست کو چیلنج کرنے میں جو ہر طرح کے اختلاف کو سفاکانہ طاقت کے ذریعے کچلنے پر یقین رکھتی ہو۔

یہ سفر ان نڈر اور پرعزم بلوچوں کے لیے گلاب کے پھولوں کی کوئی سیج نہیں تھی جنہوں نے اپنی دلیری، عزم اور ثابت قدمی سے بلوچ قوم کا سر فخر سے بلند کیا۔ روزانہ 30 کلومیٹر چلنا کوئی کھیل نہیں ہے، حتیٰ کہ سخت جان لوگوں کے لیے بھی، اور یہاں پر تو نازک اور کمزور لڑکیاں، ایک بوڑھا آدمی اور ایک دس سالہ لڑکا تھے۔ جو کوئی بھی اس طرح کے کسی مشکل کام کی وسعت اور شدت کو مسترد کرتا ہے اس شخص کو اسے پورا کرنے کے لیے یہ فاصلہ چل کر طے کرنا چاہیے۔ تھکاوٹ اور تکلیف کے علاوہ، ان میں سے اکثر جو طویل مسافت اور مسلسل چلنے کے عادی نہیں

تھے،ان کے پیروں میں چھالے اور زخم پڑنے لگے لیکن یہ بہادر لوگ پیچھے نہیں ہٹے۔

مارچ کو ملتوی کرنے کے لیے انہیں دھمکیاں دی گئیں مگر انہوں نے اپنے ان پیاروں کی محبت میں اپنی زندگیوں کو لاحق خطرات کو نظر انداز کرنے کا انتخاب کیا ہے جو کہ لاپتہ تھے۔ جسمانی تکالیف، دقت اور تخلیے کی کمی کے علاوہ وہ ہمیشہ اس غیر یقینی صورتحال میں تھے کہ وہ رات کہاں اور کیسے گزاریں گے جیسا کہ ان کی میزبانی کرنے والے لوگوں کو حکام کی طرف سے دھمکیاں مل رہی تھیں۔ وہ ڈٹے رہے اور اپنے راستے میں حائل رکاوٹوں یا پیدا کی گئی رکاوٹوں اور تمام مشکلات پر انہوں نے قابو پالیا، یہ موت کے سائے تلے شجاعت کی عکاسی تھی اور انہوں نے 27 دن چلنے کے بعد 23 نومبر کو کراچی پہنچ کر شک میں مبتلا لوگوں کے ساتھ ساتھ اس دشمن کو بھی، جس نے انہیں ناکام کرنے کے لیے رکاوٹیں پیدا کیں، جھٹلا دیا اور دکھا دیا کہ بلوچ کس قدر پرعزم اور ثابت قدم ہیں۔

ان بہادر خواتین، بچوں اور مردوں کا زبردست مشکلات کے باوجود اپنا مارچ برقرار رکھنا اس مارچ کو مزید جرأت مندانہ، تاریخی اور مثالی بنا دیتے ہیں۔ حقیقی بہادری اور دلیری کسی ایک شجاعانہ عمل پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ کسی مقصد کے حصول میں استقامت اور واحد نظری پر مبنی ہوتی ہے۔ فریڈرک نطشے (1844ء تا 1900ء) نے ایک بار کہا تھا کہ: ''یہ طاقت نہیں بلکہ عظیم جذبات کے مدت کی طوالت ہے جو عظیم انسان بناتی ہے۔'' یہ بات مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کی اہمیت کو بڑی حد تک اجاگر کرتی ہے۔ لانگ مارچ کے شرکا کی موت کے سائے تلے ثابت قدمی اور ہمت واقعی متاثر کن تھی اور اس نے اس عمل کو لائقِ تقلید بنانے میں ایک مثال قائم کی ہے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، یکم نومبر 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion

/01-Nov-2015/courage-under-fire

بداعتمادی کا پُر نہ ہونیوالا خلاء

ایک نامعلوم سیکورٹی افسر نے صحافی زاہد گشکوری کو بتایا: ''ہم چین پاکستان اقتصادی راہداری (سی پی ای سی/سی پیک) کے لیے ایک چار سطحی منصوبہ بندی کے تحت کام کرنے جا رہے ہیں جو کہ ایک نئی سیکورٹی پالیسی سے مربوط ہوگی، ایک اندازے کے مطابق 32,000 سیکورٹی اہلکار 14,321 سے زائد چینی کارکنوں کی حفاظت کریں گے جو پاکستان میں 210 چھوٹے اور بڑے منصوبوں میں مصروفِ عمل ہوں گے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چینی کارکن کی حفاظت تقریباً ڈھائی سیکورٹی اہلکار کریں گے۔ اس منصوبے میں 500 سے زائد چینی سیکورٹی اہلکاروں کی موجودگی بھی شامل ہے جو نئی تشکیل دی گئی خصوصی فورس کی صلاحیت بڑھانے میں مددگار ہوگی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ بلوچستان کی سرزمین پر چینی بوٹ اور یہ تو صرف ابتدا ہے۔

وزارتِ داخلہ کے حکام نے انکشاف کیا کہ اس منصوبے کے مطابق بلوچستان کو زیادہ تحفظ ملے گا چونکہ فرنٹیئر کور (ایف سی) کے چھ ونگ (5,700 اہلکار)، 3,000 پولیس کانسٹیبل اور 1,000 لیویز اہلکار تمام راستوں کی حفاظت کریں گے۔ پاکستان میرینز اور بارڈر سیکورٹی فورسز بھی بندرگاہ اور اس سے ملحقہ راستوں کی حفاظت کریں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایک اندازے کے مطابق فوج 12,000 اہلکاروں (9 بٹالین) پر مشتمل ایک خصوصی سیکورٹی فورس قائم کرے گی جنہیں ایک خصوصی ڈویژن میں تعینات کیا جائے گا اور یہ ایک حاضر سروس میجر جنرل کی سربراہی میں ہوگا۔ تو لہٰذا سی پیک کے منصوبوں کے لیے چینیوں کی حفاظت کے بہانے بلوچستان کی عسکریت کاری ہونے جا رہی ہے۔

گوادر میں چینیوں کی حفاظت کے لیے اس مارشل لا کے نفاذ سے بھی وہ مطمئن نہیں ہیں، اسی

لیے بیک وقت بلوچ کو اس کی حدود سے بھی باہر رکھا جا رہا ہے۔ گوادر سیکورٹی فورس کے انچارج بریگیڈیئر شہزاد افتخار بھٹی نے انکشاف کیا کہ بندرگاہی شہر کے شہریوں کو نیا رہائشی کارڈ جاری کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ ''گوادر کو ایک محفوظ شہر بنانے کی ذمہ داری پاکستان فوج کو دی گئی ہے اور بندرگاہی شہر کے داخلی راستوں پر فوج کے نئے چیک پوائنٹس قائم کیے گئے ہیں تاکہ غیر ملکی سرمایہ کاروں اور عام عوام کے لیے سیکورٹی کو بڑھایا جا سکے۔'' صحیح معنوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جبر کے ساتھ ساتھ آبادیاتی خصوصیات میں تبدیلی کو بھی مناسب طور سے کیا جائے گا۔

آبادیاتی خصوصیات میں تبدیلی کے اس عمل کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت نے بلوچستان میں آبادیاتی خصوصیات کے خلاف ایک مکارانہ جنگ چھیڑ رکھی ہے، جہاں تقریباً 250 فی صد کے حساب سے آبادی میں سب سے زیادہ اضافہ دیکھا گیا ہے۔ سینیٹر جہانزیب جمالدینی نے سینیٹ کی ایک کمیٹی میں انکشاف کیا: ''حکومت نے گذشتہ تین دہائیوں میں بلوچستان کے مختلف علاقوں میں چالیس لاکھ افراد آباد کیے ہیں۔'' اس کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور ثقافتی اقدار میں مذہب کے تعارف کا مقصد بلوچ معاشرے کے اندر بنیاد پرستی کی ضرر رساں تبدیلیاں لانا ہے اور یہ بات بلوچ کے اس دعوے کی تصدیق کرتی ہے کہ پاکستانی اسٹابلشمنٹ نے بلوچ شناخت کو ہمیشہ کے لیے مٹانے کی خاطر ایک کامل جنگ چھیڑ رکھی ہے۔

بلوچ کے لیے یہ تمام چیزیں باعثِ تشویش ہیں چونکہ حتیٰ کہ چینیوں اور ان کے بنیادی ڈھانچے کی حفاظت کے عذر کے بغیر بھی بلوچ تقریباً گزشتہ 68 سال سے اپنے سیاسی اختلاف رائے اور خودمختاری کے مطالبات کے لیے سزا کے طور پر ریاست کی طرف سے کیے گئے مظالم کے موصول کنندہ رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا ادراک ہے کہ جب 46 ارب ڈالر (اتفاق سے یہ اتنی بڑی رقم بھی نہیں ہے؛ 2008ء میں تیل کی کمپنی ایکسون کا منافع 46 ارب ڈالر تھا) ہتھیانے کے لیے موجود ہوں تو اسٹابلشمنٹ سب سے زیادہ شیطانی مظالم ڈھائے گی۔ کوئی ایسا دن نہیں جب میڈیا میں کئی عسکریت پسندوں کی ہلاکت یا ان کی گرفتاری کا ڈھنڈورا نہ پیٹا جاتا ہو۔ گذشتہ ماہ

بلوچستان کے ہوم سیکرٹری نے اعتراف کیا کہ 8,000 سے زائد افراد کو حراست میں لیا گیا ہے۔ ایف سی، انٹیلی جنس ایجنسیاں، فوج اور ڈیتھ اسکواڈز کو سزا اور جوابدہی سے مکمل استثنیٰ حاصل ہے۔ حکام کا ان گرفتاریوں کے اعتراف سے قبل وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے نائب چیئرمین ماما قدیر بلوچ کا کہنا ہے کہ 20,000 سے زائد افراد لاپتہ ہیں۔

بلوچستان میں چار سطحی سیکورٹی پلان سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور سماجی محاذوں پر چار سطحی استحصال، بردہ داری، ظلم اور جبر کا قدرتی نتیجہ ہے جس پر 27 مارچ 1948ء سے لے کر اب تک عمل کیا جا رہا ہے جب پاکستان نے بلوچستان پر زبردستی قبضہ کیا اور بلوچستان میں حکومت کرنے کے لیے استحصالی پالیسی کو اپنی بنیاد بنایا۔ ان سب چیزوں نے بلوچ عوام اور پاکستانی اسٹابلشمنٹ کے درمیان بداعتمادی کا ایک پُر نہ ہونے والا خلا پیدا کیا ہے، جس کی وجہ سے بلوچ کے حصے میں بہت ساری قربانیاں آئی ہیں اور وہ ثابت قدمی سے اس کے خلاف مزاحمت کرنا جاری رکھے ہوئے ہیں۔

آپ کس طرح سے لوگوں سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اس نام نہاد ترقی اور پیشرفت پر اعتماد کریں جبکہ اس پیٹے گئے ترقی اور خوشحالی کے ڈھنڈورے کا مطلب نوآبادکار کو مالا مال کرنا ہو؟ سوئی میں گیس 1950ء کی دہائی کے ابتدا میں دریافت کی گئی تھی؛ اس کے قیمتی وسائل کا کتنا حصہ بلوچ عوام کے لیے استعمال کیا گیا ہے؟ تب سے لے کر حتیٰ کہ اب تک اس کا سب سے زیادہ استعمال پنجاب کے لیے کیا جاتا رہا ہے اور ابتدائی طور پر اس کو سندھ لیے بھی استعمال کیا گیا تھا۔ سینڈک کے تانبے اور سونے کی کان نے یہاں تک کہ چاغی کے لوگوں کو کچھ نہیں دیا ہے۔ ساحل کے ساتھ قائم متعدد بحری اڈوں کے قریب بحریہ نے ماہی گیروں پر مچھلی پکڑنے کی پابندی لگا رکھی ہے۔ اس کہانی کی یہ فہرست بہت طویل ہے۔

اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ بلوچ اس نام نہاد ترقی اور خوشحالی کے خلاف مزاحمت کیوں کرتے ہیں۔ اس سوال کے معقول جوابات ہیں جنہیں نوآبادکار اور ان کے حامی دیکھنے یا سمجھنے

سے قاصر ہیں۔ انڈیانا یونیورسٹی بلومنگٹن میں جغرافیہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مجید اختر صاحب نے اگست میں 'نوآبادیاتی نظام کا انفرااسٹرکچر اور مزاحمت' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اس میں انہوں نے الجزائر کے انقلابی فرانز فینن کے نقطہءنظر سے خاص طور پر سی پیک کے مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں، ''فینن دلیل دیتے ہیں کہ سماجی، سائنسی اور سیاسی زمروں، جیسا کہ 'جدیدیت' اور 'ترقی'، سے نوآبادیاتی علاقوں میں زیرنوآبادیت لوگوں کے اعمال کو سمجھنے کی کوشش سعی لاحاصل ہے۔ یہ بات خاص طور پر سچ ثابت ہوتی ہے جب ہم نوآبادکار کی طرف سے ٹیکنالوجی کے ذریعے زیرنوآبادیات کی جگہوں کو جدید بنانے کی کوششوں پر زیرنوآبادیت لوگوں کی اس کے خلاف رویے کے بارے میں بات کریں۔ نوآبادکار کی جانب سے تکنیکی نفاذ کے عمل کو زیرنوآبادیت لوگوں کی طرف سے بسا اوقات تشدد کے ذریعے مسترد کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے حتیٰ کہ اس وقت بھی جب یہ تکنیکی 'تحفے' ویکسین یا ڈیموں کی صورت میں ہوں جو کہ ظاہراً آفاقی طور پر فائدہ مند ہو سکتے ہیں۔ زیرنوآبادیت لوگ تکنیکی مصنوعی اشیا کو نوآبادکار کی ثقافت اور ایجنڈے سے علیحدہ نہیں کر سکتے ہیں۔''

وہ مزید کہتے ہیں کہ، ''اسی طرح سے بلوچستان میں ڈیموں کے خلاف مزاحمت جدیدیت کا مسترد کرنا نہیں ہے۔ اسی لیے بنیادی طور پر یہ نوآبادکار کے جدیدیت کے نسخے کو مسترد کرنے کا عمل ہے۔ زیرنوآبادیت لوگوں کے لیے نوآبادکار کے جدیدیت کے نسخے کو زیرنوآبادیت لوگوں کو نوآبادکار کے اپنے تابع بنانے کی خواہش سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔''

مختصراً یہ کہ زیرنوآبادیت لوگوں کے لیے نوآبادکار کے جدیدیت کے نسخے کو زیرنوآبادیت لوگوں کو نوآبادکار کے اپنے تابع بنانے کی خواہش سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں، بلوچ سی پیک اور نام نہاد ترقیاتی منصوبوں، جیسا کہ ریکوڈک، کو نوآبادکار کی ثقافت اور ایجنڈے سے علیحدہ نہیں سمجھتے اور اسی وجہ سے اس کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ بلوچ کہ جنہوں نے 27 مارچ

1948ء سے لے کر اب تک پاکستانی اسٹابلشمنٹ کے ہاتھوں بے تحاشا ظلم سہا ہے، قدرتی طور پر اس تمام نام نہاد ترقی کو اپنے سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور سماجی حقوق کے لیے خطرے کو طور پر اور ان کی شناخت کو مٹانے کی ایک کوشش کے طور پر دیکھتے ہیں تو لہٰذا انہوں نے ایک بہت بڑی قیمت کی ادائیگی پر تسلسل کے ساتھ ہر قسم کی دراندازی اور تجاوزات کے خلاف مزاحمت کی ہے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 8 نومبر 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/08-Nov-2015/an-unbridgeable-chasm-of-distrust

بنیاد پرستی اور دہشت گردی

بلوچ دانشور میر محمد علی ٹالپر کا 'افغان ٹربیون' کے ساتھ انٹرویو

افغان ٹربیون: پاکستان کے قیام کے بعد سے افغانستان اور خطے کے لوگوں نے کوئی ایک پرامن دہائی نہیں دیکھی ہے، کیا آپ اس کی تفصیل میں جانا چاہیں گے کہ کیوں؟

میر محمد علی ٹالپر: کیا مشرق وسطیٰ نے اسرائیل کے قیام کے بعد امن دیکھا ہے؟ جب کبھی بھی کوئی ریاست مذہب کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے تو وہ نہ صرف اپنے آپ کے لیے بلکہ اپنے ہمسایوں کے لیے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی ماسوائے ایک مسئلے کے، کیونکہ یہ کبھی بھی حال اور مستقبل میں دلچسپی نہیں رکھتی جیسا کہ یہ ماضی میں رہنے کو ترجیح دیتی ہے جس کی بنیاد جھوٹی اور فرضی جاہ وجلال پر مبنی ہوتی ہے جو کہ اُس دور میں بھی کوئی حقیقت نہیں تھے اور نہ ہی انہیں آج دوبارہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

مغلوں اور دیگر مسلمان حکمرانوں کے ماضی کے جاہ وجلال، جن کا موجودہ دور کے پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہے، نے پاکستان اور اس کی اسٹابلشمنٹ کو اس خطے کے لیے زہر قاتل بنائے رکھا ہے اور رکھے گی اور یہ کبھی بھی موجودہ دور میں رہنے اور مستقبل کی جانب کام کرنے کے قابل نہیں ہوگی۔ وہ اس پورے خطے کو ماضی کی طرف گھسیٹتے رہیں گے اور اسے افراتفری اور اضطرابی کیفیت میں رکھیں گے۔

افغان ٹربیون: بطور ایک دانشور، انسانی حقوق کے سرگرم کارکن اور سیاسی ماہر کے، بنیاد پرستی کی پیدائش بارے آپ کا کیا خیال ہے اور گذشتہ کئی دہائیوں سے اس کی جڑیں کیونکر اکھاڑ پھینکی نہیں گئیں؟

میر محمد علی ٹالپر: پاکستان میں بنیاد پرستی کی پیدائش کا سراغ مذہب اور ماضی کے ساتھ پاکستانی اسٹابلشمنٹ کے جنونی لگاؤ سے لگایا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد قرارداد مقاصد نے اس بات کی یقین دہانی کروائی کہ وہ اپنے آپ اور اس خطے کے لیے کچھ اور نہیں بلکہ تباہی کے راستے کا ہی انتخاب کرسکتے ہیں۔

مغربی دنیا نے بھی بنیاد پرستی کا اپنا مرحلہ گزارا ہے اور اب بھی اس کی پرچھائیاں باقی ہیں لیکن انہوں نے ادارے قائم کیے ہوئے ہیں جو کہ کم از کم بظاہر بنیاد پرستی کو ایک محفوظ فاصلے تک محدود رکھے ہوئے ہیں۔ جب کہ مسلم دنیا میں یہ عموماً ریاست ہوتی ہے جو اس بنیاد پرستی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ وہ ان لوگوں کو روکنے کے لیے گروہ بندی بھی کرتی ہے جو عوام کے لیے جمہوریت اور انصاف چاہتے ہوں۔ اس گروہ بندی کی سب سے بہترین مثال 1978ء میں افغانستان کے 'ثور انقلاب' کے بعد دیکھی گئی۔ اگر مغربی دنیا نے مسلم دنیا کے ساتھ مل کر یہ دہشتگردی پیدا نہیں کی ہوتی، جو کہ انہوں نے افغان عوام کے لیے کی، تو اس خطے کی تاریخ مختلف ہوتی۔ مسلم دنیا میں رویے تبدیل نہیں ہوئے ہیں اور وہ فعال طور پر شام، عراق اور افغانستان میں بنیاد پرستی کی حمایت کرکے مسائل پیدا کرنا جاری رکھے ہوئے ہیں۔

افغان ٹربیون: یہ خطہ طالبان کے زوال اور اسامہ بن لادن کی ہلاکت کے بعد پرامید تھا، لیکن اب داعش کی نئی ہیت اور ہمارے عوام اور بین الاقوامی ماہرین میں سے بیشتر کا ماننا ہے کہ یہ منصوبہ پاکستانی اسٹابلشمنٹ کو دیا گیا ہے، کیا ہمیں کہنا چاہیے کہ جنگی معیشت کو اب بھی مذہب اور خاص طور پر اسلام سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: واقعات تاریخی پیشرفت کو متاثر تو کرتے ہیں، لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تاریخ کا تعین تاریخی عوامل کرتے ہیں نہ کہ واقعات۔ تبدیلی نہ ہی ایک واقعہ ہے اور نہ ہوسکتی ہے بلکہ یہ ایک طویل عمل ہے اور اسے اسی طرح سے سمجھنا چاہیے اور اسی طرح اس سے نمٹا جانا چاہیے، اور اس کی تعمیر طالبان کے زوال اور اس کے رہنماؤں کی موت کی روشنی میں کیے جانے کی ضرورت تھی۔

طالبان اور داعش اسی ایک ہی رجحان کے محض نام ہیں، اگرچہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ داعش طالبان کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے لیکن بنیادی طور پر یہ ایک ہی ہیں اور قدرتی طور پر وہ لوگ جو طالبان کے کفیل و پرورش کنندہ رہے ہیں داعش کے کفیل و پرورش کنندہ کا بھی فرض نبھائیں گے اور ان میں پاکستان، سعودی عرب، ترکی اور دیگر خلیجی ممالک شامل ہیں۔

افغان ٹربیون: کیا آپ کو لگتا ہے کہ بلوچستان جیسی جدوجہد سے خطے کے اذہان میں روشن خیالی اور جدت پسندی لانے میں مدد ملے گی اور اس سے مذہبی بنیاد پرستی سے نمٹنے میں بھی مدد ملے گی؟

میر محمد علی ٹالپر: آزاد بلوچستان ایک جمہوری ہستی ہوگی جس کا مذہب کے ساتھ بطور ریاستی پالیسی کے کچھ لینا دینا نہیں ہوگا اور یہ یقینی طور پر اذہان میں روشن فکری لانے میں مددگار ثابت ہوگی چونکہ مذہب کو فرد اور خدا کے درمیان چھوڑ دیا جائے گا جس سے ریاست کو کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ مغربی دنیا نے کلیسا سے ریاست کی علیحدگی کے بعد ترقی کی۔

افغان ٹربیون: بنیاد پرستی کی شہہ رگ پنجاب ہے لیکن نیشنل ایکشن پلان میں پنجاب میں دہشتگردوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جا رہا، تو کیا ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ پاکستان بنیاد پرستی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: بنیاد پرستی اب پاکستانی ٹیپسٹری میں بُنی ہوئی ہے اور صرف پنجاب نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی اسٹابلشمنٹ کی رٹ قائم ہے، یہ ایک مسئلہ ہے۔ ریاست نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے طویل عرصے سے بنیاد پرستی کو پالا ہے اور اس کو تقویت دی ہے اور یہ ایک دائمی حقیقت ہے کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ یہ امر یقینی ہے کہ پاکستان بنیاد پرستی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے، لیکن یہ اب اُس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ بنیاد پرستی پاکستان کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

افغان ٹربیون: دوسری طرف وہ عناصر ہیں جنہیں سعودی عرب کی پشت پناہی حاصل ہے، انہیں پاکستان فوج کے اندر بطور سلفی کے جانا جاتا ہے جنہوں نے اپنی توجہ اب بلوچستان کی

جانب مبذول کی ہے تاکہ بلوچ آزادی کی جدوجہد کو کمزور کیا جائے اور اگر ہم مزید کھل کر کہیں تو شیعوں کا قتل ایک اچھی مثال ہے، آپ اس کی مزید وضاحت کرنا چاہیں گے کہ کیا سعودی عرب اور ایران کی پراکسی جنگ بلوچستان کی سرزمین پر لڑنے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے اور آپ کا افغان طالبان کی کوئٹہ شوریٰ کے بارے میں کیا خیال ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: پاکستانی اسٹیبلشمنٹ بلوچستان میں بنیاد پرست تنظیموں کی آمد کی فعال طور پر حمایت کرتی ہے اور اس مقصد کے ساتھ کہ وہ مذہبی تنظیموں اور ان کی اقدار کے ذریعے بلوچ قومی جدوجہد کا مقابلہ کریں۔ آواران میں ستمبر 2013ء کے زلزلے کے بعد کسی بین الاقوامی یا مقامی تنظیم کو متاثرین کی مدد کرنے کی اجازت نہیں دی گئی لیکن جماعت الدعوۃ کو سہولت فراہم کی گئی اور اب بھی سہولت فراہم کی جا رہی ہے اور ہم نے ذکریوں پر حملوں کو دیکھا جو کہ ہمیشہ سے بلوچستان میں مرکزی دھارے کے مسلمانوں کے ساتھ کسی بھی قسم کے مسائل کے بغیر رہتے آ رہے تھے۔ پاکستان نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ پاکستان کی بنیاد مذہب ہے اور یہاں تمام مسلمان پاکستانی ہیں۔ اس کا مقصد مذہب کے ذریعے بلوچ، پشتون اور سندھیوں کے ہزاروں سال پرانی ثقافتوں اور تشخص کو تباہ کرنا ہے۔ بلوچستان اور سندھ میں مدرسوں کا پھیلاؤ ذہن کو چکرا دینے والا ہے۔

سب سے زیادہ بدقسمتی کی بات دونوں فرقوں کے درمیان رسہ کشی ہے اور یہ آخرکار مسلم دنیا کو تباہ کر دیں گے اور یہ مزید بدقسمتی کی بات بن جاتی ہے جب اسے دوسروں کی سرزمین پر ایک پراکسی جنگ میں تبدیل کر دیا جائے۔ بہرحال یہ مذہب ہی ہے جسے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو کہ لوگوں کے لیے زہر قاتل ہے۔

افغان طالبان کی کوئٹہ شوریٰ کسی کے تخیل کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ پاکستان کی فعال حمایت کے ساتھ موجود ہے اور حقانی گروپ کی طرح اسے بھی افغانستان میں پاکستان کے حق میں توازن کو جھکانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی سرگرم حمایت کے بغیر بہت سے افغانستان مخالف گروہ اپنی قدرتی موت مر جائیں گے۔

افغان ٹربیون: آپ بلوچستان میں پختونخوا ملی عوامی پارٹی کے کردار اور وفاقی حکومت کے ساتھ اس کے اتحاد کی وضاحت کس طرح سے کریں گے؟

میر محمد علی ٹالپر: ڈاکٹر مالک کی نیشنل پارٹی کے ساتھ ساتھ پختونخوا ملی عوامی پارٹی بھی پاکستانی اسٹابلشمنٹ کے شریک کار اور بلوچ مخالف کا کردار ادا کر رہی ہے۔ یہ کسی بھی طرح سے تاریخی بلوچ پشتون اتحاد میں مددگار ثابت نہیں ہو رہی ہے اور انہیں مزید تقسیم کر رہی ہے۔

افغان ٹربیون: سرمایہ دارانہ نظام کی جانب سے ایک طرف کرد آزادی پسند جنگجوؤں کی حمایت اور دوسری طرف داعش کی حمایت کو آپ کس طرح سے ممتاز کرتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: سرمایہ دارانہ نظام کسی کا دوست نہیں بلکہ اس کے مفادات ہیں تو لہٰذا یہ وہی کرتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس کے مفادات کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے خود شیطان کے ساتھ سودے بازی کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں دکھائی ہے، اگر اس نے دیکھا ہو کہ اس سودے سے اس کے مفادات کی تعمیل ہوتی ہے۔

افغان ٹربیون: بہت سے ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ ترکی میں پوشیدہ انقلابی قوتیں سر اٹھا رہی ہیں اور انقرہ دہشتگرد حملہ بھی سیکولر قوتوں کو کمزور کرنے کی منصوبہ بندی کا ایک حصہ تھا، آپ حالات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

میر محمد علی ٹالپر: پوری دنیا میں ہر جگہ انقلابی نہیں بلکہ ضد انقلابی قوتیں جمہوریت، انصاف اور سیکولرازم کے لیے عوام کی جدوجہد کو کمزور کرنے کے لیے یک جا ہو رہی ہیں۔ مذہب پر مبنی ریاستیں کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دیں گی کہ جمہوریت اور انصاف غالب آجائیں کیونکہ یہ طاقت پر ان کی گرفت کو خطرے میں ڈال دیں گی۔ وہ حتیٰ کہ نسل کشی کا ارتکاب بھی کریں گے، اس بات کو یقین بنانے کے لیے کہ وہ اقتدار میں رہیں۔

افغان ٹربیون: یورپی اور ایرانی جوہری معاہدہ خطے میں امید لایا تھا لیکن کیا آپ کو لگتا ہے کہ ایرانی مذہبی حکومت کا شام میں ملوث ہونا دونوں فریقین کی شرائط کو متاثر کر سکتا ہے؟

میر محمد علی ٹالپر: یورپی اور ایرانی جوہری معاہدے سے خطے کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ اس سے یورپی انا کو تسکین دینے اور ایران کو مضبوط کرنے میں مدد ملے گی۔ شام میں تنازع بہت پیچیدہ ہے اور وہاں بہت سے مفادات برسرِ پیکار ہیں، مذہب ان میں سب سے زیادہ غالب ہے۔ کوئی بھی جنگ جو مذہبی ہو، حتیٰ کہ اشارتی مفہوم کی حد تک بھی، ایک مایوس کن ناقابلِ فتح کی صورتحال ہے۔ جنگ میں کوئی فاتح نہیں ہوتے اور مذہبی جنگوں میں تو اس سے بھی زیادہ۔ شام کی جنگ عراق اور لیبیا کی طرح بے تحاشا انسانی مصائب پر منتج ہوئی ہے۔

افغان ٹربیون: پاکستان اور اس کی اسٹابلشمنٹ جنگی معیشت کا مستقل حصہ ہے؛ کیا آپ کو لگتا ہے کہ جنگی معیشت کے خلاف راحیل شریف کے حالیہ بیان سے پاکستان آرمی کے رویے میں تبدیلی آجائے گی؟

میر محمد علی ٹالپر: پاکستانی مقتدرہ مشرق وسطیٰ کی دیگر ریاستوں کے مقتدراؤں کی طرح ناقابلِ اصلاح ہے؛ وہ کبھی بھی اپنی غلطیوں سے نہیں سیکھیں گے جب تک کہ وہ تباہ نہ ہو جائیں۔ میں ان کے رویوں کی وضاحت کرنے کے لیے شیخ سعدی کی ایک قطعہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔

هیچ صیقل نکو نداند کرد
آهنے را که بد گهر باشد
چون بود اصل جوهری قابل
تربیت را در و اثر باشد
سگ بد ریای هفتگانه بشوی
که چو تر شد پلید تر باشد
خر عیسیٰ گرش بمکه برند
چون بیاید هنوز خر باشد

''کچے لوہے کی تلوار تیز کرنے میں
کوئی بھی سان کارگر نہ ہووے
تعلیم و تربیت فقط ان کے کام آوے
جن کی روح معزز اور عقل سالم ہووے
کتا گر سات سمندر بھی نہلایا جاوے
جتنا بھیگے اتنا نجس ہووے
خرِ عیسیٰؑ کو گر مکہ بھی لے جایا جاوے
وہ گدھا تھا اور گدھا ہی ہووے''

افغان ٹربیون: آپ اس خطے کی عاقبت کا تجزیہ کس طرح سے کرتے ہیں اور کیا آپ اس خطے کے مسائل کے پرامن حل کے بارے میں بات کرنا پسند کریں گے؟

میر محمد علی ٹالپر: امن صرف اُس وقت ممکن ہے جب خطے کی تمام ریاستیں یہ محسوس کرنے لگیں کہ عوام کی خدمت امن سے ہوتی ہے اور جنگیں صرف مخصوص مفاداتی حلقوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ امن کے لیے مذہبی تعصب و ہٹ دھرمی کا خاتمہ کرنا پڑے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مختلف ممالک کے عوام کے درمیان زیادہ سے زیادہ گفت و شنید و تعامل ہو۔ امن بھی ایک واقعہ نہیں ہوسکتا، یہ ایک عمل ہے اور تمام عوامل کی طرح اسے بھی بارآور ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔

بشکریہ: افغان ٹربیون

تاریخ اشاعت: 14 نومبر، 2015

http://aftribune.com/an-interview-with-baloch-intellectual-mir-mohammad-ali-talpur-fundamentalism-terrorism-and-fanaticism/

ڈومپاس

جنوبی افریقہ میں نوآبادکاروں کو پتہ تھا کہ انہیں مخالفت کی تمام شکلوں کو کنٹرول کرنا ہے اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ وہ اپنی ضروریات اور خواہشات کے مطابق آبادیاتی خصوصیات کی تبدیلی کو منظّم کریں اور اس کی نگرانی کریں۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے ایک پاس متعارف کروایا جسے افریکانز (زبان) میں سیاہ فاموں، وہ لوگ جو اس غیر انسانی اور توہین آمیز ہتھکنڈے سے متاثر تھے، انہیں کنٹرول کرنے کے لیے جو اس زمین کی حقیقی مالکان تھے، کی طرف سے 'ڈومپاس' (ڈمب پاس) کہا جانے لگا جس کا مطلب 'احمق پاس' ہے۔ پاکستان نے بلوچ عوام کے لیے اپنے ڈومپاس کا نسخہ نکالا ہے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ بلوچستان کے وسائل کی لوٹ مار میں اسے کھلی چھوٹ حاصل ہو۔ انہوں نے اس کی ابتدا گوادر سے کی ہے لیکن یہ پورے بلوچستان میں پھیل جائے گی کیوں کہ وہ گوادر سے کاشغر تک اُڑ کر نہیں جا سکتے اور انہیں نقل و حمل کے لیے زمین استعمال کرنا پڑے گی جس سے راستوں کو محفوظ بنانے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے کٹھ پتلی ڈاکٹر عبدالمالک نے پہلے ہی سے تشویش کا اظہار کر دیا ہے: ''گوادر کاشغر شاہراہ کی تعمیر پر جب بھی کچھ پیشرفت ہوتی ہے تو دشمن عناصر امن و امان میں خلل ڈالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔'' ان کی نیت پورے بلوچ عوام کے لیے ڈومپاس کے نظام کے لیے بنیاد فراہم کرنا ہے۔ ابتدائی طور پر یہ ایک سیکورٹی اقدام ہوگا لیکن بعد میں آخر کار بلوچستان میں نسلی امتیاز پر مبنی رنگ بھیدی نظام قائم کر دے گا۔

پاس کے قوانین کا مقصد رنگ بھید کے تحت افریقیوں کی تحریک کو کنٹرول کرنا تھا اور جس کا بتدریج ارتقا ان ضابطوں سے ہوا جو 18 ویں اور 19 ویں صدی میں کیپ کالونی کے ڈچ/

ولندیزی اور برطانوی غلام دارانہ معیشت کی طرف سے عائد کی گئی تھیں۔ 19ویں صدی میں پاس کے نئے قوانین نافذ کیے گئے تاکہ سونے اور ہیروں کی کانوں کے لیے سستا اور مطیع افریقی محنت کشوں کی قابلِ اعتماد فراہمی یقینی بنائی جائے۔ 1952ء کے پاس قوانین ایکٹ کے تحت 16 سال سے زائد عمر کے سیاہ فام جنوبی افریقیوں کے لیے ہر جگہ اور ہر وقت ڈومپاس ساتھ رکھنا لازمی تھا۔ ڈومپاس اس شخص کے بارے وسیع معلومات کے ساتھ بھری ہوئی ہوتی۔ اس میں انگلیوں کے نشانات، تصاویر، روزگار کی ذاتی تفصیلات، ملک کے ایک مخصوص حصے میں رہنے کے لیے حکومت کی اجازت، اس علاقے میں کام کرنے یا روزگار ڈھونڈنے کی اہلیت اور اس مزدور کی کارکردگی اور رویے پر آجر کی رپورٹیں شامل ہوتیں۔ اگر کوئی مزدور اپنے آجر کو ناراض کر دیتا اور وہ معقول وقت کی مدت کے لیے اس کتابچے کی توثیق کرنے سے انکار کر دیتا تو اس مزدور کا اس علاقے میں رہنے کا حق خطرے میں پڑ جاتا۔

اگر پاس بک میں مزدور کے بارے میں کوئی منفی تاثر درج ہوتا تو پاس کے قانون کے مطابق سرکاری حکام کے پاس مزدور کو اس علاقے سے بے دخل کرنے کا اختیار ہوتا۔ اسے 'توثیقی اخراج' کے طور پر جانا جاتا تھا اور اس پر کسی بھی وقت اور کسی بھی وجہ سے عملدرآمد کیا جا سکتا تھا۔ حکام کو ان کی کارروائیوں کے لیے کوئی وضاحت فراہم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ 'توثیقی اخراج' زدہ مزدور کے خاندان کے افراد کا اس علاقے میں رہنے کا حق سلب کیا جاتا اور انہیں بے دخلی اور بانتستان (سیاہ فام آبادی کے لیے مقرر کردہ علاقہ) میں جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ڈومپاس کو اپنے ساتھ رکھنے کو بھول جانا، گم کر دینا یا چوری ہو جانا کسی کے لیے گرفتار اور قید ہو جانے کا موجب ہوتا۔ ہر سال 250,000 سے زائد سیاہ فاموں کو پاس قانون کے تحت تکنیکی جرائم کے لیے گرفتار کیا جاتا۔ اس کے نتیجے میں ڈومپاس رنگ بھید کے سب سے زیادہ قابلِ نفرت شے کی علامت بن گیا۔ جب تیزی سے مہنگے اور غیر مؤثر ہوتے پاس قوانین کو 1986ء میں منسوخ کر دیا گیا تو اس وقت تک یہ قوانین 17 ملین گرفتاریوں کی وجہ بنے۔

لوگوں نے اپنی جانوں کی قیمت پر نوآبادکاروں کی طرف سے نافذ اس ظالمانہ کنٹرول کے خلاف مزاحمت کی۔ لوگوں نے مختلف طریقوں سے مزاحمت کی۔ پھر 21 مارچ 1960ء میں شیپر وِل قتل عام ہوا جب 5,000 سے 7,000 کے درمیان مظاہرین کا ایک گروہ جوہانسبرگ کے قریب شیپر وِل کی بستی میں ایک مقامی پولیس اسٹیشن پر اکٹھا ہوئے اور پاس بک نہ رکھنے پر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا تو جنوبی افریقہ کی پولیس نے سیاہ فام مظاہرین کی بھیڑ پر فائر کھول دیا، اس میں 69 افراد ہلاک، ان میں سے کئی کو پیٹھ میں گولیاں ماری گئیں، اور 200 سے زائد زخمی ہوئے۔ دو اہم تنظیموں، افریقی نیشنل کانگریس (اے این سی) اور پین افریکن کانگریس (پی اے سی)، دونوں نے پرامن جدوجہد چھوڑ دی اور مسلح جدوجہد کا راستہ اپنایا۔

نوآبادکار جانتے ہیں کہ ڈومپاس بذاتِ خود تسلی بخش انداز میں آبادی کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہاں پر دیگر تکمیلی میکانزم اور انتظامات ہونے چاہئیں تاکہ اس مکمل کنٹرول کو یقینی بنا سکیں، جس کے وہ آرزومند ہیں۔ سفید فام جنوبی افریقیوں نے اس کے حصول کے لیے بانتستان بنائے۔ چین پاکستان اقتصادی راہداری (سی پی ای سی/سی پیک) کے راستے سے ملحقہ علاقوں کو آہستہ آہستہ بانتستانوں میں تبدیل کر دیا جا سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں 1950ء کا گروپ ایریاز ایکٹ نے زمینوں کی تقسیم کی، جہاں کالے اور گورے الگ الگ رہائشی علاقوں میں مقیم تھے۔ اس ایکٹ نے جنوبی افریقہ میں مختلف علاقے قائم کیے جہاں ہر نسل کے لوگ اپنے الگ علاقے میں رہ اور کام کر سکتے تھے جس میں امتیازی طور پر سفید فاموں کے لیے بہترین، شہری صنعتی اور زرعی علاقوں کو ایک طرف قائم کیا گیا تھا۔ کالوں پر ان علاقوں میں جگہ کرائے پر لینے یا جائیداد پر قبضہ حاصل کرنے کی ممانعت تھی جنہیں 'سفید فام زون' تصور کیا جاتا تھا جب تک کہ انہیں ریاست کی طرف سے اس کی اجازت نہ دی جاتی۔ گوادر ریزیڈینس پاس کا پورا مقصد ایک ایسا علاقہ بنانا ہے جہاں بلوچ کے داخلے کو اپنی مرضی کے مطابق محدود اور کنٹرول کیا جا سکے، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ چینی وہاں محفوظ ہوں خواہ یہ حفاظت بلوچستان میں رنگ بھید کا میکانزم قائم

کرنے کی قیمت پر ملے۔

چین صرف اپنے ڈالروں کی سرمایہ کاری کے لیے اپنا منافع چاہتا ہے۔ یہ کسی کا دوست نہیں ہے اور اسے اپنی منفعت کے سوا کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے، خواہ یہ منفعت جبر اور فوجی کارروائیوں کی قیمت پر ملے جو کہ بلوچ پر بھاری نقصانات کی کاری ضرب لگا رہی ہیں۔ ایک چینی کمپنی، زونرجی کمپنی، جو کہ پنجاب میں 900 میگاواٹ کا سولر پاور پراجیکٹ بنا رہی ہے۔ پاکستان جنوری 2016ء سے 14.15 سینٹ فی یونٹ سے 9.25 سینٹ فی یونٹ تک نرخوں میں کمی کی نظر ثانی پر غور کر رہی ہے۔ اس کمی نے چین کو مشتعل کیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ منافع میں اس کمی سے پاکستان میں سی پیک پروگرام کے تحت کام کرنے والے چینی کاروباری اداروں پر ایک تباہ کن اثر پڑے گا۔ چین کا بلوچستان میں ہونا بلوچ کے لیے نہیں ہے، حتیٰ کہ پاکستانیوں کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ منافع چاہتا ہے، خواہ وہ بلوچ کے خون سے ہی رنگا کیوں نہ ہو۔

چین اور پاکستانی اسٹابلشمنٹ کے درمیان گٹھ جوڑ کوئی حیران کن بات نہیں ہے چونکہ دونوں کو صرف منافع نظر آ رہا ہے، انہیں لوگوں کی فلاح و بہبود سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ بات پھر ہمیں بلوچ کی جانب لے جاتی ہے جو 27 مارچ 1948ء کے بعد سے جبر اور اپنے وسائل کی لوٹ مار کے خلاف مزاحمت کرتے آ رہے ہیں۔ بلوچ کے پاس اور کوئی متبادل ہے ہی نہیں، ماسوائے اس کے کہ وہ اپنی جانوں کے نذرانوں کے ساتھ اپنے حقوق اور وسائل کی حفاظت کریں اور حتیٰ کہ حکومت بھی مانتی ہے کہ اس سال 8,000 سے زائد افراد حراست میں لیے گئے ہیں۔ ماما قدیر بلوچ، وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز (وی بی ایم پی) کے نائب چیئرمین، نے گذشتہ سال کہا تھا کہ 20,000 سے زائد افراد لاپتہ ہیں۔

جب لوگ یہ دیکھیں کہ ان کا وجود داؤ پر لگا ہوا ہے، جیسا کہ جنوبی افریقہ کے سیاہ فام تھے، تو وہ ان لوگوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں جو ان کا استحصال کریں اور پاس قانون جیسی چیزوں کے ساتھ ان کے وقار کی توہین کریں۔ بلوچ مزاحمت تو کر رہے ہیں لیکن بدقسمتی سے انہیں

پاکستان کی عام آبادی کے درمیان کوئی حمایت حاصل نہیں ہے کیوں کہ جب انہیں علیحدگی پسند اور دہشت گرد کا لیبل لگا دیا گیا ہو تو بظاہر انہیں انسانی ہمدردی کے لائق بھی نہیں سمجھا جاتا۔ وہ جو آج خاموش ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ لوگ جو منافع اور فقط منافع کے متلاشی ہیں بالآخر اپنے مظالم کا شکار کرنے کے انتخاب میں امتیازی سلوک نہیں برتیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی بالکل ایسے ہی سلوک کے لیے اس قطار میں کھڑے ہوں جو آج بلوچ کے ساتھ برتا جا رہا ہے۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 15 نومبر 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/15-Nov-2015/dompas

گوادر کا معمہ

گوادر ایک غیر معمولی طور پر مقناطیسی شئے لگتی ہے جس نے مختلف قوتوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ لگتا ہے کہ چین اس کے لیے سب سے زیادہ لگاؤ اور کشش رکھتا ہے۔ یہ سپر پاور کی حیثیت کے لیے ایک نیا حریف ہے اور یہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا جہاں پر جیسے تیسے کر کے یہ اپنے اثرات پھیلا سکے۔ یہاں پر اسے پاکستانی اسٹابلشمنٹ کی شکل میں ایک آمادہ ساتھی مل گیا ہے جو کم از کم ایک علاقائی طاقت بننے کا خواہش مند بھی ہے۔ انہیں لگتا ہے کہ گوادر میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن سے ان کو اپنے متعلقہ مقاصد کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔ ان دونوں میں یکساں خصلت جداگانہ حیثیت کے خلاف ان کی نفرت اور منافع اور زمین کے لیے ان کا لالچ ہے۔ چین، اپنی زمین کے اتنے بڑے ٹکڑے کے باوجود، جنوبی چین کے سمندر میں متنازع علاقوں کی زمین پر دوبارہ قبضہ کرنے اور ممکنہ فوجی استعمال کے لیے سپریٹلی جزائر پر رن وے کی تعمیرات میں مصروفِ عمل ہے؛ اوباما نے حال ہی میں ان دوبارہ قبضوں کے خلاف اس ملک کو خبردار کیا تھا۔ چین کے لیے گوادر خدا کی طرف سے بھیجا گیا ایک تحفہ ہے چونکہ یہاں فقط سرمایہ کاری کے عوض اسے سب کچھ مل رہا ہے۔ جی ہاں، 46 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری محض منافع حاصل کرنے کے لیے۔ یہ کوئی ذہن کو چکرا دینی والی رقم نہیں ہے کیوں کہ 2008ء میں صرف ایکسون تیل کمپنی کا منافع 46 ارب ڈالر تھا۔

آسان تجارتی راستوں اور توانائی کی ضروریات کے لیے قابلِ رسائی گلیاروں (کوریڈورز/راہداریوں) کے علاوہ چین کو ان اہم تنصیبات اور راستوں کی حفاظت کے لیے اڈوں کی ضرورت ہے، اور یہ اس ذمہ داری کے لیے دوسروں کے کاندھوں پر اعتماد نہیں کرے گا۔ گوادر چین کے لیے ایک اتنا ہی اسٹریٹجک اہمیت کا حامل مقام ہے اور اس بات سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کتنا

بلوچ خون بہے یا بلوچ مصائب کی شدت کتنی ہو۔ یہاں پر ایک آمادہ اتحادی پانے کے بعد یہ یقینی طور پر فقط بے غرضانہ ایثار کی بنا پر اس طرح کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ چین صرف بڑے سے بڑا ممکنہ منافع کمانے پر تلا ہوا ہے اور اس نے حکومت کو دھمکی دی ہے کہ وہ چین پاکستان اقتصادی راہداری (سی پی ای سی/سی پیک) ترک کر دے گا، اگر اس کے سولر منصوبے کے لیے نرخوں کی شرح میں کٹوتی کی گئی۔

گوادر ایئرپورٹ کو طویل عرصے سے فوجی اور فضائی اڈے کے ایک مقام کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ اگر معاملہ یہ نہ ہوتا تو پھر معمول کے طریقہ کار کو کیوں کر نظرانداز کیا جاتا جب گوادر کے نئے ایئرپورٹ کے لیے 6,600 ایکڑ زمین خریدی جا رہی تھی؟ یہ سول ایوی ایشن اتھارٹی (سی اے اے) کے بجائے کوئٹہ میں ملٹری اسٹیٹس آفیسر (ایم ای او) تھا کہ جس نے یہ زمین 1.05 ارب روپے میں خریدی تھی۔ کوئی بھی زمین جو ملٹری لینڈ اور کنٹونمنٹ (ایم ایل سی) کی طرف سے حاصل کی گئی ہو، اسے پاکستان آرمی کی ملکیت بنا دیتی ہے اور صرف یہی حقیقت اس دعوے کو مکمل طور پر بے نقاب کر دیتی ہے کہ گوادر خصوصی طور پر ایک تجارتی منصوبہ ہے۔ اس کے علاوہ 26 جنوری 2007ء کو سینیٹ میں بحث کے دوران سینیٹر رضا ربانی، شاید اس وقت وہ ایک پیامبرِ امن تھے، نے کہا تھا کہ گوادر میں ہوائی اڈہ ایک 'سول ملٹری' ہوائی اڈہ ہے اور اسی لیے ایم ایل سی نے ہزاروں ایکڑ زمین حاصل کی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس رپورٹ میں سینیٹر ڈاکٹر عبدالمالک (بلوچستان کے موجودہ وزیراعلیٰ) نے بھی ایوان کو بتایا تھا کہ حکومت نے ایم ایل سی کے ذریعے گوادر ہوائی اڈے کے لیے 150,000 ایکڑ زمین خریدی تھی اور تمام لوگوں کو ان کے معاوضے کی ادائیگی بھی نہیں کی گئی ہے۔ وہاں پر ادا کی گئی قیمت پر بھی ہنگامہ آرائی ہوئی تھی: پاکستان ریلوے نے فی ایکڑ 55,000 روپے ادا کیے تھے جب کہ ایم ایل سی نے فی ایکڑ 157,000 روپے ادا کیے۔

اٹلانٹا کا ہارٹسفیلڈ جیکسن ہوائی اڈہ 1998ء سے دنیا کا مصروف ترین ہوائی اڈہ رہا ہے اور 2014ء میں 96,178,899 مسافروں کے گزر کے ساتھ یہ دنیا میں کسی بھی دوسرے ہوائی

اڈے کی نسبت زیادہ مسافر اپنی طرف کھینچ لاتا ہے۔ 2014ء میں اس نے 881,933 ہوائی جہازوں کے ساتھ سب سے زیادہ نقل وحرکت (اڑان بھرنے اور اترنے) کا بھی انتظام کیا تھا اور یہ صرف 4,700 ایکڑ پر تعمیر گئی ہے۔ گوادر ایئرپورٹ لندن کے ہیتھرو (2,965 ایکڑ) سے دوگنے سائز کا ہے جہاں مصروف ترین اوقات میں ہر 46 سیکنڈ میں ایک جہاز اڑتا یا اترتا ہے اور 2014ء میں اس نے 73,408,442 مسافر اور 472,817 جہاز سنبھالے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی جگہ کی ضرورت دیگر مقاصد کے لیے ہے جن کی تشہیر نہیں کی گئی ہے۔ چین کو ایک اڈے کی ضرورت ہے اور اسے اس کی فوراً ضرورت ہے؛ اسے سپر پاور بلاک پر نیا بُز غالہ بننے کے لیے امریکی اڈوں کے ساتھ مسابقت کی خاطر اپنی ایک واضح نشانی قائم کرنی ہے اور پاکستانی حکومت نے اس مقصد کے لیے 26 ارب روپے مختص کیے ہیں۔

گوادر کی عسکریت کاری اور گوادر کے باشندوں کے لیے ریزیڈینس کارڈ جیسے رنگ بھیدی اقدامات کا نفاذ کوئی بے ترتیب عمل نہیں ہے بلکہ اس بات کو یقینی بنانے کی ایک منظّم پالیسی کا حصہ ہے کہ بلوچ کو ان کے حقوق سے ہر طرح سے مکمل طور پر محروم کیا جائے اور انہیں ایک کونے میں دھکیل دیا جائے جہاں سے وہ خود کو اس قابل نہ سمجھیں کہ وہ اس ہتک آمیز برتاؤ اور ناانصافیوں کے خلاف مزاحمت کرسکیں جن کا ڈھیر ان پر گرایا جارہا ہے۔ یہ وحشیانہ اور غیر انسانی پالیسی صرف ان کی اقتصادی اور اسٹریٹجک ضروریات کو پورا کرنے کی خواہش سے منسوب نہیں ہے بلکہ یہ اس گہرے بغض پر مبنی ہے جس کا مقصد پاکستانی اسٹابلشمنٹ کے بلوچستان کے وسائل کا استحصال کرنے اور اس کی 347,190 مربع کلومیٹر زمین کے استعمال کے مقاصد کے خلاف بلوچ کی مزاحمت کے لیے ان کو سزا دینا ہے جس سے بلوچ تو محروم ہوں گے لیکن ان کے چنیدہ لوگ اس سے فائدے اٹھائیں گے جیسا کہ قدرتی گیس، تانبے، سونے اور سلیمانی پتھر کے ساتھ ہوا ہے۔

اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ برائے جبری یا غیر رضا کارانہ گمشدگیوں (ڈبلیو جی ای آئی ڈی) نے ستمبر 2013ء میں پاکستان کا دورہ کیا لیکن اس سے نہایت کم تعاون کیا گیا۔ اس گروہ نے حال ہی میں سری لنکا کا دورہ بھی کیا تھا اور اس دورے کے دوران جزیرے کے شمال مشرق

میں قائم ایک بہت بڑے سابق غیر قانونی قید خانے کا معائنہ کیا اور سری لنکا پر زور دیا کہ وہ مشتبہ خفیہ حراستی مراکز کی تحقیقات میں تیزی لائے۔ سی پیک پر دستخط کرنے کے بعد لاپتہ افراد کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ڈبلیو جی ای آئی ڈی کو یہاں کے خفیہ قید خانوں کی بھی تحقیقات کرنی چاہیے جو کہ بلیک ہول ہیں جن میں ہزاروں بلوچ غائب ہو چکے ہیں۔ جس سزا سے استثنٰی کے ساتھ اور جتنے بڑے پیمانے پر بلوچستان میں گمشدگیاں جاری ہیں، یہ نسل کشی کے زمرے میں آتی ہیں اور اقوام متحدہ کے اس ادارے کو ان بلیک ہولز کو دیکھنے کی بلا روک رسائی کی اجازت ہونی چاہیے تاکہ وہ خود لاپتہ بلوچوں کی حالت زار دیکھ سکیں۔

اس انتقامی جبر اور بلوچ حقوق کی منظّم سلبی کی مدد اور حوصلہ افزائی بلوچ کے درمیان موجود نا اتفاقی سے بھی ہو رہی ہے۔ درخت اور کلہاڑی کی تمثیل یہاں مناسب لگتی ہے۔ درختوں نے شکایت کی کہ کلہاڑی ان کے خلاف مظالم کا ارتکاب کر رہی ہے اور کلہاڑی کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں کو روکنے کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے۔ انہیں بتایا گیا کہ اگر وہ جو کلہاڑی کا دستہ بننے سے انکار کریں تو کلہاڑی کافی حد تک بے ضرر ہو جائے گی۔ بلوچ کے درمیان ہر سطح پر موجود کُڑھتی ہوئی اور مہلک نا اتفاقی یقینی طور پر کسی بھی طرح سے بلوچ کے لیے مددگار ثابت نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس کے برعکس اسٹابلشمنٹ کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ مؤخر الذکر کو اس بات کا ادراک ہے کہ یہ تباہ کن اور نقصان دہ نا اتفاقی تمام بلوچوں کو کس قدر کمزور کرسکتی ہے اور مزید سخت اور ظالمانہ اقدامات کی طرف اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، انہیں اس حد تک کمزور کرنے کے لیے کہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں۔ بلوچ کو خطرات سے نکالنے اور ان کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری یکساں طور پر ان کے کندھوں پر عائد ہے جو رہنما ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اتحاد کے بغیر یہ خطرہ موجود ہے کہ بلوچ حقوق کی جدوجہد ایک بھولا ہوا باب بن جائے گا۔

بشکریہ: ڈیلی ٹائمز، اتوار، 22 نومبر 2015

http://www.dailytimes.com.pk/opinion/22-Nov-2015/gwadar-conundrum

پلک جھپکتے میں: بلوچستان کی زمینوں پر قبضہ

ترجمہ: پروفیسر ریاض احمد

تدوین: لطیف بلیدی

بلوچستان اسمبلی کے بزدل اور پست ہمت اراکین نے 9 ہزار ایکڑ (یعنی 32 اسکوائر کلومیٹر) اراضی سپارکو (اسپیس اینڈ اپر ایٹما سفیر ریسرچ کمیشن) کے حوالے کر دیا۔ یہ رقبہ وائلڈ لائف کے لیے عالمی طور پر محفوظ قرار دیے گئے علاقے ہنگول نیشنل پارک میں واقع ہے۔ اتنے اہم خطے کو الاٹ کرنے میں اسمبلی اراکین کو صرف تین سو سیکنڈ لگے، یعنی 30 ایکڑ فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین حوالے کر دی گئی۔ اس برق رفتار تابعداری نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر کوئی زور واثر والا اِن پر دباؤ ڈالے تو یہ پورے بلوچستان سے کتنی دیر میں دستبردار ہو جائیں گے؟ جتنا وقت لگے گا اِس کا دارومدار اُس خوف اور لالچ پر ہوگا کہ جو کوئی اتھارٹی ان کے دلوں میں پیوست کر سکے گی۔ یہ یقیناً ان لوگوں کے لیے شرمناک اور ناشائستہ عمل ہے کہ جو بلوچستان کے حقوق کے رکھوالے قرار دیے گئے ہیں۔ لیکن پھر جن لوگوں کو راولپنڈی اور اسلام آباد کا دُم چھلا بننے کے لیے چنا گیا ہو تو ان کے ہاتھوں عجلت اِتنی حیران کن بھی نہیں۔ سپارکو اتنا بھی بے ضرر نہیں کہ جتنا یہ نظر آتا ہے۔ یہ خف اور شاہین جیسے میزائیل تیار کرتا ہے۔ یہ ادارہ فوج کی خدمات پر مامور ہے۔

بلوچستان کی زمین پر بڑے ہی لالچی لوگوں کی نظریں لگی ہوئی ہے۔ نومبر 2007ء میں سرتاج عزیز نے بلوچستان حکومت کو حکم دیا کہ 70 ہزار ایکڑ زمین ایک عرب شہزادے کو فروخت کر دے۔ اس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ایک نئے پورٹ سٹی کے لیے سونمیانی کی پانچ لاکھ ایکڑ زمین ایک روپے فی ایکڑ کے حساب سے دے دی جائے۔ اب یہ بات حیران کن اس لیے نہیں کہ مسلح

افواج پہلے ہی ایک کروڑ بیس لاکھ ایکڑ زمین پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ اور یہ کل ریاستی زمین کا 12 فی صد بنتا ہے۔ حال ہی میں سندھ اسمبلی نے بھی 9 ہزار ایکڑ زمین فوج کو تحفے میں دی ہے۔

آفت زدہ ہنگول پارک کی تکلیف دہ داستان جاری ہے کیوں کہ یہ پنجاب میں نہیں بلکہ بلوچستان میں ہے۔ پوٹوہار کہ جو 22 ہزار 254 کلومیٹر (یعنی 8 ہزار پانچ سو بیانوے مربع میل) پر پھیلا ہوا ہے، کافی بڑا رقبہ ہے۔ یوں اس میں سے 32 اسکوائر کلومیٹر اگر لے بھی لیا جائے تو ایسا بڑا فرق تو پڑنے والا نہیں۔ لیکن وہ خطرات جو راکٹ کے تجربے کے ساتھ آتے ہیں، وہ تجربہ کرنے والوں کو تو نہیں لیکن راکٹ کی زد میں آنے یا در بدر کیے جانے والوں کے لیے مہلک ضرور ہیں۔

جولائی 2006ء میں فضائیہ اور سپارکو نے 80 ہزار ایکڑ کا مطالبہ کیا، جس میں سے 23 ہزار ایکڑ ہنگول پارک اور آٹھ موضع جات کے بھی آتے تھے۔ میں نے 'ڈان' اخبار میں ایک مضمون 'ٹیسٹنگ ٹائمز' کے عنوان سے تب لکھا تھا جب 13 مئی 2008ء کو ہنگول پارک کو جے ایف 17 جیٹ طیاروں کی فائرنگ رینج بنا دیا گیا تھا۔ اس مضمون پر ڈائریکٹر میڈیا افیئر زائیر کموڈور سرفراز احمد خان کا جواب آیا اور انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ پی اے ایف ہنگول پارک کی زمین لے رہی ہے۔ میں نے جواباً انہی کا 27 جولائی 2002ء کا بیان بھیج دیا کہ جس میں وہ کہتے ہیں کہ 'قریب 30 فیصد رقبہ، کہ جو پی اے ایف نے تجویز کیا ہے، یہ نیشنل پارک کی حدود میں پڑتا ہے'۔

یہ جنوری 2009ء کی بات ہے کہ تب کی بلوچستان اسمبلی جاگی اور فیصلہ کیا کہ جام قیادت میں اتحادی حکومت اور پاکستان ائیر فورس کے بیچ میمو آف انڈرسٹینڈنگ منسوخ کر دیا جائے کیونکہ اس معاہدے کی پاداش میں معمولی معاوضہ ملنے والے اور بے دخل ہونے والے باسیوں نے احتجاج جاری کر رکھا تھا۔ جام حکومت نے ہنگول نیشنل پارک کے علاقے میں 63 ہزار ایکڑ زمین الاٹ کر دی تھی، یہاں پر فائرنگ رینج تعمیر کی جانی تھی۔

فائرنگ رینج، راکٹ ٹیسٹنگ اور دیگر مقاصد کے لیے زمین ہتھیانا روزمرہ کا کام ہے جب کہ چند ہی چیزیں منظر عام پر آپاتی ہیں۔ طاہر رشید، کہ جو ایک این جی او Sustainable Use

Specialist Group Cenrtal Asia کے نیشنل پروجیکٹ منیجر ہیں اوران کی این جی او طبعی مسکن اور نوع بچانے کا کام کرتی ہے، نے تب کہا تھا کہ 'پی اے ایف ہنگول نیشنل پارک میں زمین اس لیے مانگ رہی ہے کیونکہ یہ پہلے ہی ضلع پشین میں مسلخ وائلڈ لائف سینکچوری کی زمین حاصل کر چکی ہے'۔ انہوں نے مزید کہا کہ 'مسلخ وائلڈ لائف سینکچوری کا قیام 1968ء میں عمل میں آیا تھا تا کہ چنکارا اور اوڑیل کا بچاؤ کیا جا سکے۔ انٹرنیشنل یونین فار کنزرویشن آف نیچر (آئی یو سی این) کے مطابق اس علاقے میں تمام اہم ترین وائلڈ لائف انواع ختم کی جا چکی ہیں'۔ یوں سپارکو سے یہ توقع خام خیالی ہے کہ یہ ہنگول پارک میں وائلڈ لائف کی جانب کوئی ہمدردانہ رویہ اپنائے گی۔

بلوچستان جن مصائب سے گزر رہا ہے، ان میں قبضہ واحد تباہی نہیں۔ راسکوہ چاغی میں 28 مئی 1998ء کو گرینائٹ پہاڑوں کی موت واقع ہوئی۔ اس علاقے کے باسی اب تابکاری کی آلودگی سے متاثر ہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ کہ یہ تجربے مکمل طور پر محفوظ ہیں، مقامی لوگوں کو یہ سوال کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ تو پھر یہ 'محفوظ نیوکلیر تجربات' جہلم کی وادیوں میں کیوں نہیں کیے گئے؟

زوفین ٹی ابراہیم صاحبہ نے جون 2006ء کے ایک مضمون 'فوری اور واضح خطرہ' میں بغل چور علاقے کے بلوچوں کی حالت زار پر روشنی ڈالی تھی کہ جہاں سے 1978ء تا 2000ء کے بیچ نیوکلیئر ہتھیاروں کے لیے یورینیم نکالا گیا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ اس علاقے کے باسیوں کے لیے مسائل اس وقت شروع ہوئے کہ جب کانیں خالی ہو گئیں تو انہیں نیوکلیر فضلہ ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ وہ کہتی ہیں کہ 'متاثرین میں پچاس ہزار کے قریب لوگ ہیں جو بغل چور کے گرد بستیوں اور پانچ لاکھ افراد قریبی ڈیرہ غازی خان میں رہتے ہیں۔ یہ علاقہ اکثریتی بلوچ قبائل پر مشتمل ہے'۔ متاثرہ آبادی نے 2006ء میں سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر کی۔ لیکن یہ یونہی پڑی رہی۔ اور پھر یہ 2012ء میں اُٹھائی گئی اور اس کی آخری سماعت میں کیس پنجاب انوائرمنٹل ٹریبونل کو بھیج دی گئی کہ وہ اس پر مزید سماعتیں کرے۔ اس کے بعد کچھ نہ ہوا اور معاملہ یہیں ختم ہو گیا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ 'ہیرالڈ' رسالے کی ایک رپورٹ کہتی ہے کہ 'اسٹریٹجک پلان ڈویژن

یعنی وہ ادارہ جو پاکستان کے نیوکلیئر ہتھیاروں کا کنٹرول رکھتا ہے اس کا ایک افسر یہاں تک کہہ گیا کہ بغل چور سے نکلنے والی تابکاری 'عوام کے ذہنوں کی اختراع ہے'۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نیوکلیئر فضلے کو پنڈی اور اسلام آباد میں محفوظ نہیں کیا جا سکتا؟

سندھ بھی زمینوں پر قبضے کا شکار ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ملک کی سب میں بڑی فائرنگ رینج کھپرو میں تھیں۔ پھر بھی صالح پٹ سکھر کی 73 ہزار ایکڑ کی زرخیز زرعی زمین ایک نئی فائرنگ رینج کے لیے طلب کر لی گئی۔ ابتدائی طور پر یہ علاقہ بے زمین کسانوں میں تقسیم کرنے کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ اگر اسے انہی میں تقسیم کر دیا جاتا تو قریب 4 ہزار خاندانوں کو روزگار مل جاتا۔ لیکن یہاں تو معمول یہ ہے کہ 24 لاکھ ایکڑ میں سے 55 فیصد (یعنی 13 لاکھ ایکڑ) زمین کہ جو بیراجوں سے سیراب ہوتی ہے اسے غیر سندھیوں میں الاٹ کیا جا چکا ہے۔

سردار اختر مینگل نے نوشکی میں اپنی تقریر میں کہا کہ 'ایک خوشحال بلوچستان کا خواب اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ گوادر پورٹ کو صوبے کے حوالے نہیں کر دیا جاتا'۔ وہ بھول گئے کہ بلوچستان کو وہ لوگ چلا رہے ہیں کہ جو 9 ہزار ایکڑ پر مشتمل محفوظ نیشنل پارک کو ایک مخصوص تباہ کاری کے لیے نکال چکے ہیں اور انہیں افسوس ہے نہ شرم۔ لیکن پھر ہم انہیں قصوروار بھی تو نہیں ٹھہرا سکتے کہ جب چیف منسٹر کو ملنے والے ووٹ ہی 4 ہزار ہوں اور خود انہوں نے قبول بھی کیا ہو کہ بلوچستان میں تمام انتخابات 'طے شدہ' ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے 'طے شدہ' ہیں تا کہ وہ جو اسمبلی تک پہنچ جائیں انہیں بھی ان مقاصد کے لیے کہ جن کا تقاضا راولپنڈی اور اسلام آباد کرتے ہیں، 'طے' کیا جا سکے۔ جہاں تک ان 'طے شدہ قانون سازوں' کا معاملہ ہے تو ان کے نزدیک بلوچستان کے عوام اپنے حقوق اور شکایات کے لیے ہنہ جھیل میں جا کر چھلانگ لگا سکتے ہیں۔

بشکریہ: نیکڈ پنچ ڈاٹ کام، اتوار، 29 نومبر 2015

http://nakedpunch.com/articles/241

میر محمد علی ٹالپر: بلوچستان میں لاپتہ افراد کی آواز

تحریر: احمد امتیاز

میر محمد علی ٹالپر، جو بلوچستان میں ''لاپتہ افراد'' کیلئے لڑ رہے ہیں، کا کہنا ہے کہ یہ مسئلہ کوئی حالیہ رجحان نہیں ہے۔

میر محمد علی ٹالپر ان چند پاکستانیوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے شورش زدہ صوبے بلوچستان میں ''لاپتہ افراد'' یا جبری طور پر غائب کیے گئے متاثرین کا مسئلہ اٹھایا ہے جو انہیں سیکورٹی اسٹابلشمنٹ کی نظروں میں لے آیا ہے۔

ٹالپر کی مسلسل نگرانی کی جاتی ہے اور ان کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھی جاتی ہے۔ ان سے ملنے والے لوگ بھی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی نظروں میں ہیں۔ گزشتہ سال اپریل میں وہ ٹی ٹو ایف، کراچی کا ایک کیفے جو انسانی حقوق کے کارکنوں کے حوالے سے مقبول ہے، کے ایک مباحثے کے پینل پر تھے جس میں ''لاپتہ افراد'' پر بحث کی گئی تھی، اسکے بعد ٹی ٹو ایف کی بانی سبین محمود کو اسوقت گولی مار کر قتل کیا گیا جب وہ گھر جا رہی تھیں۔

کراچی پولیس نے اس قتل کیلئے ایک آدمی کو گرفتار کیا جسکے بارے میں قیاس کیا گیا تھا کہ وہ داعش سے منسلک ہے۔ لیکن 65 سالہ ٹالپر کا کہنا ہے کہ انہیں اس بات پر کوئی شک نہیں ہے کہ اس قتل کا مقصد ہر پاکستانی کو یہ پیغام بھیجنا تھا کہ انہیں بلوچ کاز سے خود کو لاتعلق کر لینا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''وہ نہیں چاہتے کہ کوئی بھی اس بارے میں بولے۔''

بلوچستان پھر سے کئی خستہ حال عسکریت پسند گروہوں کی طرف سے چلائی جانیوالی ایک

بھرپور شورش کی آگ کی لپیٹ میں ہے۔ وسائل سے مالا مال اور کم آبادی والے صوبے میں فوج گزشتہ ایک دہائی سے فوجی کارروائیاں کر رہی ہے لیکن اسکے محدود نتائج نکلے ہیں۔

فوجی آپریشن اور باہر کے لوگوں کی موجودگی کی مخالفت کرنے والے سینکڑوں افراد کو انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف سے اٹھایا گیا ہے اور زیادہ تر واقعات میں ان کے بارے دوبارہ کبھی نہیں سنا گیا۔

وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے گروہ کیمطابق گزشتہ چار دہائیوں کے دوران بلوچستان سے تقریباً 18,000 افراد کو اغواء کیا گیا ہے۔ 2009ء کے بعد سے لاپتہ بلوچ کارکنوں کی 700 سے زائد پھینکی گئی لاشیں کراچی اور بلوچستان بھر سے ملی ہیں۔

لاشیں بلا کسر مسخ کی جاتی ہیں، بسا اوقات شناخت نہ ہونے کی حد تک، اور ان پر تشدد اور گولیوں کے زخموں کے نشانات ہوتے ہیں۔ انکے قاتل عام طور پر لاشوں کو ایک کاغذ کی پرچی پر لکھے گئے اس شخص کے نام کیساتھ منسوب کرتے ہیں تاکہ انکے رشتہ دار انہیں پہچان سکیں۔

انسانی حقوق کمیشن پاکستان، ملک کی معروف انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیم، کی جانب سے حکومت سے ان ہلاکتوں کا نوٹس لینے کیلئے بار بار کیے گئے مطالبات کا جواب مکمل خاموشی کی صورت میں ملا ہے۔

فوج اور سیکیورٹی ادارے ٹالپر جیسے لوگوں، جو اپنی آواز بلند کرتے ہیں، کا باقاعدگی سے پیچھا کرتے ہیں اور انکی جان نہیں چھوڑتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''لاپتہ افراد'' کا مسئلہ کوئی حالیہ رجحان نہیں ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ''تاہم، یہ اب زیادہ منظّم ہے اور بلوچ قوم کیخلاف جاری غلیظ جنگ کا یہ ایک اہم حربہ ہے''، انہوں نے مزید کہا کہ انہوں نے لاپتہ ہوئے سینکڑوں افراد کے واقعات کی فہرست مرتب کی ہے۔

ٹالپر، جن کے ہاتھ کئی سال قبل تشدد سے معذور ہو گئے تھے، 1970ء کی دہائی سے بلوچ عوام کے حقوق کی جدوجہد میں شامل ہیں۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی میں بطور صحافت کے ایک

طالب علم کے بلوچستان، پاکستان کے سب سے بڑے صوبے، میں گڑ بڑ کے خاتمے کیلئے اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے بھیجی گئی سرکاری فوج کیخلاف جنگ میں حصہ لینے کیلئے اپنی تعلیم چھوڑ دی۔

سن 1977ء میں بھٹو کو ایک فوجی بغاوت کے ذریعے ہٹائے جانے کے بعد بلوچستان کی صورتحال پرسکون ہوئی جب فوجی آمر جنرل ضیاء الحق نے سرکاری افواج واپس بلا لیں اور تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔

مگر ٹالپر کا کہنا ہے کہ 2013ء میں 46 ارب ڈالر لاگت کی پاک چین اقتصادی راہداری (سی پی ای سی/سی پیک) کے منصوبوں، جو بلوچستان کے طول وعرض سے گزر کر صوبے کے جنوبی سرے پر واقع ایک بندرگاہ گوادر پر اختتام پذیر ہوگی، کے منظر عام پر لائے جانے کے بعد صورتحال نے مزید وحشت ناک شکل اختیار کر لی ہے۔

ٹالپر کہتے ہیں کہ بلوچ اس کی تعمیر کیخلاف مزاحمت کریں گے کیونکہ اس منصوبے سے مقامی لوگوں کو بہت کم یا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ سی پیک سے ''صرف چینیوں اور پنجابیوں کو فائدہ ملے گا'' اور یہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے گا ''جب تک کہ آخری بلوچ اس کیخلاف کھڑا رہے گا۔''

وفاقی حکومت، جو وزیراعظم نواز شریف کی قیادت میں ہے، نے اپنی طرف سے یہ عندیہ دیا ہے کہ کسی بھی طرح کی مزاحمت کو وہ طاقت کیساتھ کچلیں گے۔ چونکہ جس طرح سے سیکورٹی اسٹابلشمنٹ وہاں کی اتھل پتھل کی کوریج کو روکتا ہے اس سے صوبے، جسے میڈیا نے ''معلومات کا بلیک ہول'' قرار دیا ہے، کو مستقبل میں مشکل ترین حالات کا سامنا ہوگا۔

(نوٹ: خود میر محمد علی ٹالپر کیمطابق انکے ہاتھ ایک حادثاتی دھماکے میں معذور ہوئے تھے نہ کہ تشدد سے جیسا کہ اس مضمون بتایا گیا ہے)

بشکریہ: ہندوستان ٹائمز، اسلام آباد، 07 فروری، 2016

http://www.hindustantimes.com/world/mir-mohammad-ali-talpur-voice-of-missing-people-in-pakistan-s-balochistan/story-l3q79zx348dwddAEKFAZ4K.html

کامریڈ عبدالقیوم بلوچ گوادری

ستائیس مارچ 1948ء کے جبری الحاق سے لیکر اب تک بلوچ اپنے وسائل کا استحصال کرنے، اپنے سیاسی حقوق ضبط کرنے، جسمانی طور پر ختم اور خوفزدہ کرنے، اور آخر میں غیر بلوچوں کی آمد کیساتھ انہیں ایک اقلیت میں تبدیل کرنے کی پاکستانی ریاست کی کوششوں کیخلاف مزاحمت کرتے آرہے ہیں۔ بلوچ مزاحمت نے اب تک ان شیطانی منصوبوں کو ناکام بنایا ہے تاہم اس کیلئے بلوچوں کو اپنی زندگیوں کی ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ مزاحمت میں کوئی وقفہ یا کمی نہیں آئی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس مزاحمت کی شدت اور اس کے علاقے بدلتے رہے ہیں؛ ابتدائی طور پر یہ مرکزی بلوچستان تک محدود تھی پھر یہ مکران کے ساحلی علاقوں میں اپنے اثرات کیساتھ مری اور مینگل علاقوں میں منتقل ہوئی۔ اسوقت مزاحمت سب سے زیادہ مکران کے ساحلی اور ملحقہ علاقوں میں فعال ہونے کے ساتھ ساتھ پورے بلوچستان میں پھیلی ہوئی ہے۔

مکران کو اس تعلیم نے فائدہ پہنچایا ہے جس کے حصول کیلئے وہاں کے لوگ کوشش کرتے آئے ہیں اور یہ سیاسی شعور اسی تعلیم کی دین ہے۔ مکران اور اس سے ملحقہ علاقوں کے لوگوں کو بے انتہا مصائب جھیلنی پڑی ہیں جو ان بڑے منصوبوں کے تناظر میں سفاکانہ جبر اور 'غلیظ جنگ' کی صورت میں ان پر نازل ہوئی ہیں جو حتیٰ کہ ارجنٹینا، برازیل اور چلی میں اسی طرح کے جبر کا ارتکاب کرنے والوں کیلئے بھی باعث شرم ہیں۔ صریح سیاسی اور اقتصادی جبر کا شتر بے مہار جو پاکستان نے بڑے منصوبوں اور ترقی کے نام پر چھوڑا ہوا ہے اس نے انہیں اپنے حقوق کیلئے اٹھ کھڑا کیا ہے۔ اغوا اور قتل کیے گئے لوگ جنکی تعداد ہزاروں میں ہے اور ایسا بالکل نہیں لگتا کہ یہ سلسلہ بند ہونے والا ہے لیکن پھر بھی بلوچ جوش و ولولے میں اضافہ کیساتھ اپنی مزاحمت جاری

رکھے ہوئے ہیں۔

یہاں بہت سارے بہادر اور جوانمرد لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانیں بلوچستان کیلئے قربان کی ہیں اور وہ تمام لوگ اپنی بے لوث قربانیوں کیلئے بلوچ قوم کے شکریے اور تعریف کے مستحق ہیں۔ میں گوادر سے تعلق رکھنے والے کامریڈ عبدالقیوم بلوچ کے بارے میں بات کروں گا، جنکی پانچویں یوم شہادت دو ہفتے قبل تھی، جو شے نذر کے ہاں 1984ء میں پیدا ہوئے۔ علاقے کے دیگر بچوں کی طرح انہوں نے بھی 1989ء میں گوادر کے جدید اسکول میں داخلہ لیا اور 2002ء میں اپنے میٹرک کا امتحان پاس کرنے تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے 2004ء میں حکومت کے زیر انتظام سید ہاشمی ڈگری کالج گوادر سے ایف اے کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد 2008ء میں انہوں نے بی اے پرائیویٹ طور پر کیا۔ وہ ایک اچھے اور محنتی طالبعلم تھے جنہوں نے اچھی طرح سیکھنے کیلئے بہت محنت کی؛ وہ سیاسی ادب میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہ جدید سکول میں ایک طالبعلم تھے تو دیگر بہت سے طلباء کی طرح عبدالقیوم نے بھی نو سال کی نوعمری میں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بی ایس او) میں شمولیت اختیار کی۔ بی ایس او میں شمولیت باعث فخر سمجھی جاتی تھی۔ تاہم ان کے بھائی کا کہنا ہے کہ ابتدائی طور پر جب انہوں نے بی ایس او میں شمولیت اختیار کی تھی تو اس میں شمولیت کرنا ایک عام رواج تھا لیکن جب انہوں نے سیاسی لٹریچر پڑھا اور سینئر ارکان کی تقاریر اور مذاکرے سنے تو وہ سیاسی طور پر بالغ ہوئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ بی ایس او کی سرگرمی محض ایک غیر سنجیدہ تفریح نہیں بلکہ ایک قومی فریضہ ہے، ہر اس بلوچ کیلئے جسے اپنے مادر وطن سے محبت ہے اور جو پاکستان کی ناانصافیوں کا خاتمہ چاہتا ہے۔

سن 1980ء اور 1990ء کی دہائیوں میں بی ایس او مختلف دھڑوں اور رہنماؤں کی تقلید میں بٹی ہوئی تھی جو بلوچ مسئلے کے حل کیلئے مختلف پالیسیوں اور نقطہ ہائے نظر کی وکالت کیا کرتے تھے۔ اس تقسیم نے نوجوانوں کے ذہنوں میں بہت سارے شکوک وشبہات پیدا کیے کہ آیا بی ایس او اس سے کیا حاصل کرلے گی اور کیا یہ اپنے قومی حق خودارادیت کی راہ پر رہنے کے قابل رہے گی جو کہ

اس کا بنیادی مقصد تھا۔

مشرف اور ان کے میگا پراجیکٹس کی آمد کیساتھ پالیسیوں پر اختلافات میں اضافہ ہوا چونکہ کچھ لوگ ان نام نہاد ترقیاتی منصوبوں کا حصہ بننا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر اللہ نذر نے محسوس کیا کہ یہ منصوبے ان کے مفادات کے برخلاف آبادیاتی خصوصیات میں تبدیلی لانے اور ان سماجی قوتوں، جو بلوچ معاشرے کی تاریخی طور پر سیکولر سماجی اقدار کی مخالفت کریں گی، کو یہاں لانے کی ایک چال سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہیں۔ 2002ء میں بحث وتکرار اور ساز باز سے تنگ آکر ڈاکٹر اللہ نذر نے تربت کے پارک ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس کی اور نظریاتی بنیادوں پر موجودہ بی ایس او کی تقسیم کا اعلان کیا اور بی ایس او-آجوئی کے قیام کا اعلان کیا۔ بلوچی میں آجوئی کا مطلب آزادی ہے اسی لئے ان کا گروہ بی ایس او-آزاد کے طور پر جانا جانے لگا۔ اس بارے میں خود قیوم، وہ اس کے بانی ارکان میں سے ایک تھے، کا کہنا تھا کہ ان سمیت بی ایس او گوادر زون کے صرف 7 ارکان تھے جنہوں نے شمولیت اختیار کی تھی۔ انہوں نے بی ایس او-آزاد کو سب سے زیادہ مقبول اور مؤثر طلباء تنظیم بنانے میں انتھک محنت کی۔ یہ امر صرف یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ زبردست مشکلات کیخلاف اور ناموافق حالات میں جدوجہد سے آشنا تھے اور یہ بات ان کی زندگی اور موت سے اچھی طرح ثابت ہوتی ہے۔

پاکستان اپنی استحصالی پالیسیوں اور نقصان دہ میگا پراجیکٹس کیخلاف بڑھتی ہوئی مزاحمت سے حواس باختہ ہوگیا تھا اور اسکی عسکری موجودگی کے اضافے سے بلوچ جدوجہد کو ڈرانے اور ناکام بنانے کیلئے 2008ء میں 'مارو اور پھینک دو' کی پالیسی کے تحت بلوچستان میں بلوچ کارکنوں کے جسمانی خاتمے کی ایک منظّم پالیسی کا آغاز ہوا۔ بی ایس او-آزاد چونکہ بلوچ عوام کے حقوق کی جدوجہد میں سب سے آگے تھی اور اسی سبب فرنٹیئر کور (ایف سی)، انٹیلی جنس ایجنسیوں اور ان کی معاونت سے چلنے والے 'قاتل دستوں (ڈیتھ اسکواڈز)' کا اہم ہدف بن گئی۔

بلوچ حقوق کی جدوجہد کیلئے ان کی محنت اور لگن کے باعث کامریڈ قیوم بلوچ بی ایس او آزاد کی مرکزی کمیٹی کے رکن بنے۔ انہوں نے شادی کی اور انکے دو بچے ہوئے، ایک بیٹا حیربیار اور

ایک بیٹی شفاء۔ اپنے آپ کو بلوچ جدوجہد کیلئے وقف کرنے نے انہیں پاکستان کیلئے ایک ہدف بنادیا جو انہیں خاموش کرنا چاہتا تھا۔ 11 دسمبر 2010ء کو انہیں گوادر میں اپنے چچا کے گھر سے پاکستانی ریاستی ایجنسیوں کی طرف سے اغواء کیا گیا۔ دو ماہ بعد 10 فروری 2011ء کو ان کی بری طرح سے مسخ شدہ لاش ہیرونک ضلع تربت سے ایک اور بلوچ سرگرم کارکن جمیل یعقوب بلوچ، جو بلوچستان نیشنل پارٹی مینگل کے رکن تھے، کیساتھ پائی گئی۔ بلوچ کی جانب پاکستان کا جبر بلاامتیاز رہا ہے اور یہ جبر محض ان لوگوں تک محدود نہیں جو آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں بلکہ یہ اسے ان تمام لوگوں کیخلاف بروئے کار لاتا ہے جو بلوچ عوام کے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ان کی شہادت کے بعد انہیں گوادر میں ذکری فرقے کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ تین بار ان کے قبر کی بے حرمتی کی گئی ہے اور وہاں بلوچستان کی آزادی کے لہراتے پرچم کو جلایا گیا۔ ان کی قبر پر ''کافر کافر ذکری کافر'' کی تحریر درج تھی۔ بلوچستان میں ذکریوں کیخلاف کوئی تعصب نہیں ہے؛ حکومت کے حمایت یافتہ مذہبی گروہ ذکریوں کے قتل اور اس طرح کے غلیظ جرائم میں ملوث ہیں۔ حمید بلوچ، ثناء سنگت، قمبر چاکر، الیاس نذر، سلیمان عرف شیہک، رضا جہانگیر، ڈاکٹر منان بلوچ اور دیگر سینکڑوں بلوچ نوجوان جنہوں نے اپنی جانیں قربان کیں، کامریڈ عبدالقیوم بلوچ کی طرح مادر وطن اور بلوچستان کی آزادی کیلئے محبت کی علامت ہیں۔ ان کی قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جائیں گی۔

بشکریہ: نیکڈ پنچ، 27 فروری 2016ء

http://nakedpunch.com/articles/252

ایامِ ثقافت: عوامی افیون؟

میں جسکے بارے میں لکھنے جارہا ہوں اس بابت وہاں ضرور مختلف آراء ہوں گی چونکہ میں دوم مارچ کے بارے میں لکھ رہا ہوں جسے 'بلوچ کلچر ڈے' کے طور پر منایا جاتا ہے اور اسے کئی لوگ بڑی گرم جوشی سے مناتے ہیں جیسا کہ سوشل میڈیا اور اخباری خبروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کراچی کے امریکی قونصل جنرل بھی کراچی پریس کلب میں اسکی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔

مجھے ان لوگوں سے کوئی حسد نہیں ہے جو خوش ہونے، جشن منانے اور لطف اندوز ہونے کیلئے وجوہات تلاش کرنا چاہتے ہوں؛ لوگوں کو خوش دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے خاص طور پر ایسے اوقات میں جب خوشی پانا مشکل ہو چونکہ وہاں اتنی ساری ناانصافیاں اسی بات کو یقینی بنانے کیلئے ہیں کہ ہم مسلسل غمگین اور اداس رہیں۔ خوشی ایک ایسی چیز ہے جسے ہر طرف دل کھول کر پھیلایا جانا چاہئے اور بلوچ قومی جدوجہد بلوچ حقوق کے حصول کی جانب اپنی جہد مسلسل کیساتھ بالکل یہی کوشش کرتی آرہی ہے۔

ہماری ثقافت وہی ہے جو ہم ہیں؛ یہ ہمارے اعمال کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ ثقافت کوئی خارجی شے نہیں ہے اور نہ ہی یہ ہم سے جدا کوئی وجود رکھتی ہے۔ ہم کس چیز کی حمایت کرتے ہیں، ہم کس چیز کی مخالفت اور اس کیخلاف مزاحمت کرتے ہیں، کس چیز پر ہم یقین رکھتے ہیں اور کس طرح کا طرز عمل ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپناتے ہیں نہ صرف ہماری بلکہ ہماری ثقافت کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہم اپنی ثقافت سے ماورا نہیں پرکھے جاسکتے اور نہ ہی ہماری ثقافت کو ہم سے جدا پرکھا جاسکتا ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اور جس طرح ہم رہتے ہیں ہماری ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے اور اگر ہم اپنی ثقافت کی اصل روح کے مطابق زندگی نہیں گزارتے تو ہماری ثقافت کو نہ

سمجھنے اور بدنام کرنے کیلئے ہمیں لوگوں کو دوش نہیں دینا چاہئے۔ ہم اپنے اعمال کیساتھ اپنی ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ اپنے الفاظ اور خالی خولی نگارشات کیساتھ۔ ایک بلوچ ہونے کیلئے آپ کو ان اقدار کیساتھ جینا پڑے گا جو آپ کو ایک بلوچ بناتے ہیں۔ ہماری اقدار اور ہماری مقاومت ہمیں بلوچ بناتے ہیں اگر کپڑے، پاگ (پگڑی) اور داڑھیاں ہمیں بلوچ بناتے تو پھر یہ سفر کافی آسان ہوتا اور ہمیں خوش آمدید کہا جاتا، یہ اپنے طرز عمل سے بلوچ ہونا ہے جس نے دشمن کو خوفزدہ کر رکھا ہے اور وہ ہمیں نیست و نابود کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ثقافت محض لباس کے ٹکڑوں کا نام نہیں ہے بلکہ ہم جو ہیں یہ اس کا حاصل کل ہے اور اس کا مطلب ہماری تاریخ، ہماری اقدار، ہماری جدوجہد، ہمارے ہیرو، ہماری قربانیاں اور اپنے حقوق کیلئے ہماری لڑائیاں۔ کیا ہم ان سب کو پورا کرتے ہیں جب ہم ثقافت کا دن مناتے ہیں جس طرح سے کہ یہ آج کل منایا جاتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ جس طریقے سے بھی بلوچ یوم ثقافت منایا جائے، آیا یہ کسی بھی طرح سے آزادی میں ملی اس دائمی خوشی کو حاصل کرنے کی سمت جانے میں مددگار ثابت ہو رہی ہے یا پھر یہ محض لطف اندوز ہونے کا ایک دن ہے اور اس کے بعد پھر سے اسی روزانہ کی بے کیف، افسردہ اور دل شکن معمول پر آ جانا ہے؛ ایک بے اثر دوا جسکی کوئی اصل اہمیت یا مقصد نہ ہو۔

ایک ایسا سوال جسکا جواب ان تمام لوگوں کو ایمانداری سے دینے کی ضرورت ہے جو بلوچ یومِ ثقافت کو بطور ایک تہوار منانے کے قابل سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ آیا جس نراش اور تکلیف دہ صورتحال سے آج بلوچ قوم دوچار ہے کیا ہمیں یہ زیب دیتا ہے کہ ہم جشن منائیں اور دھوم دھڑکا کریں۔ میں اس بات میں یہ اضافہ کرتا چلوں کہ اپنی شناخت پر فخر کرنا ضروری ہے اور ہمیں فخر ہونا چاہئے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب ہم دنیا کو اپنا فخر دکھانے کی کوشش کر رہے ہوں ہم اس صدمے کو بھول جائیں جس سے بلوچ قوم سے گزر رہی ہے اور اس عمل میں اس لہو اور ان گنت قربانیوں کو فراموش کر دیں جنہوں نے ہمیں ہماری شناخت پر فخر کرنے کا حق دیا ہے۔

سماجی اور سیاسی عمل میں ہر چیز، بشمول ایام ثقافت کے، کی دیکھ پرکھ اور قدر و منزلت کا تعین ایک مخصوص مجموعہء حالات میں رہنے والے لوگوں کیلئے ان سے ملنے والے فوائد یا نقصانات سے کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہم بلوچ یوم ثقافت کی بات کر رہے ہیں تو آئیں اس صورتحال پر نظر ڈالتے ہیں جس میں بلوچ آج ہیں۔

بلوچ کو اپنی شناخت، اپنے حقوق، اپنی ثقافت، اپنی زندگی اور اپنی تاریخ کے حوالے سے انتہائی تشویشناک چیلنجز اور خطرات کا سامنا ہے جو اس سے قبل ان ہزاروں سالوں میں انہیں کبھی نہیں تھیں جس میں انہوں نے جدوجہد کی اور اپنا وجود قائم رکھا۔ وہ سب کچھ خطرے میں ہے جس سے وہ خود کو مشخص کرتے ہیں مزید برآں ان کی زمین اور اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف انکی طرز زندگی بلکہ حتیٰ کہ ان کی زندگی بھی۔ انکے وسائل بڑے منصوبوں کے نام پر قبضے میں لیے جا رہے ہیں، ان بڑے منصوبوں کی حفاظت کیلئے فوج اور بحریہ کے اڈے تھوپے جا رہے ہیں۔ مذہب کے نام پر سیاسی، سماجی اور اقتصادی طور پر انکے حقوق ضبط کر کے انہیں بے دخل کیا جا رہا ہے چونکہ مذہب انہیں پاکستانی بننے مجبور کرتا ہے کیونکہ وہ بلوچ کے بجائے مسلمان ہیں۔ 27 مارچ 1948ء کے بعد سے ایک مکارانہ، دانستہ، نپا تلا اور بتدریج عمل منظّم طریقے سے نافذ العمل رہا ہے جسکا مقصد انہیں بلوچستان، جو کہ ان کا مادر وطن ہے، میں ایک بے اختیار اقلیت میں بدل دینا ہے۔ یہ دو طریقوں سے کیا جا رہا ہے؛ اول دیگر مقامات سے لوگوں کو یہاں لانے سے اور دوم سست رفتار نسل کشی سے جو کئی عشروں سے جاری ہے۔

یہ بلوچستان میں آج کے زمینی حقائق ہیں اب آئیں دیکھتے ہیں کہ جس سنگین آبنائے میں بلوچ خود کو پاتے ہیں یوم ثقافت سے کسی بھی طرح کا افاقہ دینے یا راحت بخشنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے یا نہیں۔ جہاں تک کپڑوں، پاگ (پگڑی) اور ڈریس (رقص) کے فروغ کا تعلق ہے تو یہ ایک اعلیٰ نمائش ہے مگر جو شگفتہ مزاجی، رنگیلا پن اور جشن کا سماء باندھا جاتا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بلوچ قوم کو کسی قسم کے مسائل کا سامنا نہیں ہے اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے جبکہ حقیقت

اسکے بالکل برعکس ہے۔ یہ عیش وطراب اور موج میلہ جو یومِ ثقافت کیساتھ منسوب ہے نہ صرف دنیا بلکہ بلوچ عوام کو بھی ایک غلط پیغام بھیج رہا ہے۔ ثقافت محض ملبوسات کے ٹکڑوں یا موسیقی کی تھاپ پہ رقص کے چند تال نہیں ہے؛ ثقافت یا اس کا جشن منانے میں اس قوم کی روح، اسکی زندگی، اسکے تاریخی اور سیاسی پہلوؤں کا اظہار اس میں شامل ہو کہ وہ کس طرح سے اپنے وجود کو لاحق سنگین خطرات سے نمٹ رہی ہے۔

یہ مسرت اور شادمانی، جو کہ قدرتی طور پر ان نام نہاد ایامِ ثقافت کے ہمراہ ہوتی ہے، صورتحال کی حقیقت کو مبہم کر دیتی ہے۔ سیاسی کتب اور سیاسی ادب کے کتابی میلوں پر ریاست کی طرف سے پابندی لگی ہوئی ہے جبکہ ان ایامِ ثقافت کی ترویج اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کیونکہ ریاست کو ان کے ذریعے عوام کو نادانستہ طور پر زچ کرنے میں مدد ملتی ہیں اور لوگوں کو اس غلامی اور تسلط کی لعنت سے غافل کرنے کے ریاستی ایجنڈے کو مدد ملتی ہے جو کہ بلوچ کیلئے ایک روزمرہ کی حقیقت ہے۔ یومِ ثقافت، جس طرح سے اسے یہاں پر منایا جاتا ہے، محض بلوچ قوم کی زمین اور وسائل پر اپنی آہنی گرفت کو مضبوط کرنے کیلئے ریاست کا ایک اور آلہ ہے۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم باڑ کے کس طرف کھڑے ہیں؛ آیا ہم انکے ساتھ ہیں جو ہمیں تغافل کے گڑھے میں دھکیلنا چاہتے ہیں یا ان کے ساتھ جو ہمارے مستقبل کیلئے لڑ رہے ہیں، گیند آپکے کورٹ میں ہے۔

جعلی ثقافتی علامات کی وکالت سے استحصالی قوتوں کو عوام کی توجہ ان کی شناخت اور حقوق کو لاحق حقیقی خطرات سے ہٹانے میں مدد ملتی ہے۔ کیا کوئی پاگ، داڑھی یا کپڑے ہمیں ایک بلوچ بنا سکتے ہیں؟ مجھے نہیں لگتا۔ جو ہم کرتے ہیں وہی ہمیں بلوچ بناتے ہیں نہ کہ جیسا ہم دِکھتے ہیں۔ افغانستان سے واپسی کے چند سال بعد میں نے اپنی داڑھی منڈوائی تھی؛ کچھ لوگوں نے، اگرچہ براہ راست نہیں، تاسف کا اظہار کیا تھا۔ تو میں نے ان سے کہا کہ میری بلوچیت اس داڑھی کے سبب نہ تھی جو میں نے دل بہلانے کیلئے رکھی ہوئی تھی بلکہ اس وجہ سے جو کچھ میں نے اپنی زندگی میں کیا اور جس چیز کیلئے میں ایستادہ رہا۔ میں نے بڑے پاگ اور لمبی داڑھیوں والے بلوچ دیکھے

ہیں جو کٹر پاکستانی ہیں اور کلین شیو اور ننگے سر بلوچ بھی جنہوں نے بلوچستان کیلئے اپنی زندگی اور سب کچھ قربان کر دیے ہیں۔ اس طرزِ عمل کے مقابلے میں ظاہری طور پر ایک بلوچ دِکھنا آسان ہے اور یہ کہ یہاں یومِ ثقافت ایک خطرناک بے اثر دوا کی طرح کام کرتی ہے جو ہمارے حواس کو جمود کا شکار بنا دیتی ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ اگر دوم مارچ کو صحیح لباس پہن لیں تو گویا ہم نے اپنا قومی فریضہ نبھا دیا ہے۔

ہوسکتا ہے پیسے کے لحاظ سے ایک بلوچ کی طرح دِکھنا مہنگا ہو لیکن طرزِ عمل سے ایک بلوچ ہونا ایک بڑی قیمت کی ادائیگی سے ملتا ہے جسے ہم میں سے بہت سارے ادا کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور اسی وجہ سے ایامِ ثقافت پر اکتفاء کر لیتے ہیں۔ یومِ ثقافت کو جس طرح سے اب منایا جاتا ہے یہ ریاستی توثیق کا حامل ہے چونکہ یہ ان کے مقصد کی تعمیل کرتا ہے؛ اسے بطور ایک 'بلوچ یوم ثقافت اور یوم حقوق' منانے کی کوشش کریں اور پھر دیکھیں کہ آپ کو یونیورسٹیوں اور پریس کلبوں میں تقریبات منعقد کرنے کی اجازت ملتی ہے یا نہیں۔ بلوچ کا کوئی بھی ایسا عمل جس میں ریاستی جبر کیخلاف سرکشی اور مزاحمت کا ہلکا سا بھی رنگ شامل ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اس طرح کے کسی بھی پروگرام کے انعقاد کی ہمت کرنے والوں پر ریاست کا مضبوط پنجہ جھپٹ پڑے گا۔

جس جوش وخروش کیساتھ ثقافتی دن بلوچستان سے باہر منایا جاتا ہے وہ بلوچستان میں مغلوب انداز میں منائے جانے کے بالکل برعکس ہے جہاں اس کی ترویج وتشہیر وہی لوگ کرتے ہیں جو پورا سال بلوچ کو دبائے رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک تصویر ہزار الفاظ کے برابر ہوتی ہے لیکن کچھ تصاویر ایک ارب یا اس سے بھی زیادہ کے برابر ہوتی ہیں۔ بلوچستان میں بلوچ یومِ ثقافت کے جلوس کی انٹرنیٹ پر شائع کی گئی ایک تصویر یہ سب کچھ بتا رہی ہے اور ان لوگوں کے اس سارے دوغلے پن، فریب اور منافقت کو بے نقاب کر رہی ہے جو یہ دکھانے کیلئے اُتاولے ہیں کہ یہ پورا جشن اچانک اور برجستہ ہے۔ بلوچ یوم ثقافت کو منانے کیلئے کسی بھی جلوس کو فرنٹیئر کور کے تحفظ اور سرپرستی کی کیونکر ضرورت ہونی چاہیے؟

بلوچ یوم ثقافت کو ریاست نے یرغمال بنا لیا ہے، اس بات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں ایسے لوگ نہیں ہیں جو اسے برجستہ نہیں منائیں گے اور میں نے یہ سطور انہی کیلئے لکھے ہیں تا کہ وہ اسکا ازسرنو جائزہ لے سکیں کہ اس سے کس کو مدد مل رہی ہے اور وہ روح کہ جس کیساتھ بلوچ یوم ثقافت آج کل منائی جاتی ہے۔

کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا انجام بھی دیسی امریکیوں کی طرح مختلف راہداریوں، جو کہ قدرتی طور پر چائنا پاکستان اقتصادی راہدری کے بعد یہاں تعمیر کی جائیں گی، کے پہلو میں قائم تخصیصی جگہوں میں ہو جہاں ہم چمڑے کے خیموں، سرپوشوں اور پاپوش گلوں وغیرہ کی نمود ونمائش کرسکیں، جہاں ہمیں ان چیزوں پر کوئی حقوق حاصل نہ ہوں جو ہمارے ہیں اور جنہیں ہمارا ہونا چاہیے؟ اگر نہیں تو محض ایک یوم ثقافت نہ منائیں، جو کہ ماسوائے کپڑے کے ٹکڑوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، بلکہ حقوق کا یوم ثقافت منائیں جس سے نواب نوروز خان، نواب خیر بخش مری، شیر محمد مری، میر لونگ خان، علی شیر کرد، بالاچ مری، صبا دشتیاری، رضا جہانگیر، ڈاکٹر منان، نواب اکبر بگٹی، مجید لانگو اور خاندان، حمید بلوچ، جلیل ریکی، ثناء سنگت، کامریڈ قمبر، محراب خان (1839)، عطاء شاد، گل خان نصیر اور ان جیسے دیگران گنت لوگوں کی بہادری اور ثابت قدمی کی یادوں کو عزت واحترام ملے جنہوں نے خود کو قربان کیا اور اپنی زندگیاں بلوچ حقوق کیلئے وقف کیں۔ ایک ایسا یومِ ثقافت منائیں جو ذاکر مجید، علی خان مری، کبیر بلوچ، زاہد بلوچ، ڈاکٹر دین محمد، محمد رمضان جیسے ہزاروں کیلئے باعث اعزاز ہو جو کہ گوانتانامو اور ابوغریب جیل سے بھی بدتر مراکز میں پاکستان کی تحویل میں ہیں۔

ایک ایسا یوم ثقافت جو کسی قوم کی مزاحمت اور جدوجہد سے منسلک نہ ہو اور ظلم کیخلاف جنگ میں اس کا مددگار نہ ہو تو محض ایک ڈرامہ اور ڈھونگ ہے جسکا مقصد لوگوں کے ذہنوں کا رخ حقیقی خطرات سے ایک ایسی چیز کی جانب موڑنا ہے جو کہ بے تکا، بے محل اور قابل نفرت ہے۔ جب تک کہ 'بلوچ کلچر ڈے' کا لب ولہجہ اور روش تبدیل نہیں ہوتا اور اپنے حقوق اور باوقار زندگی، جس کیلئے

وہ کوششیں کر رہے ہیں، کیلئے بلوچ جدوجہد کا ایک لازمی حصہ نہیں بن جاتا تب تک یہ وہی رہے گا جو کہ یہ ہے؛ لوگوں کو بیوقوف بنانے کیلئے محض ایک اور ڈھونگ جس سے انہیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ انہیں اپنی زندگیوں پر اختیار حاصل ہے اور وہ اپنے آپ کو آزاد لوگوں میں شمار کریں۔ میرے خیال میں جس طرح سے اس یومِ ثقافت کو منایا جاتا ہے یہ ریاست کی زیر سرپرستی ٹیلی ویژن چینلوں کا فروغ دیا ہوا ایک ناٹک ہے جسکا مقصد اس ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی جبر کو تقویت اور طول دینا ہے جو 27 مارچ 1948ء سے جاری ہے۔ فیصلہ بالآخر آپ کا ہے کہ آیا آپ وہ بلوچ بننا چاہتے ہیں جو بلوچ کے لباس میں ہو یا وہ بلوچ جسے بلوچ قوم کے مستقبل کی فکر ہے اور وہ اپنی قوم کے حقوق کیلئے جدوجہد کرنا چاہتا ہے۔

بشکریہ: نیکڈ پنچ/افغان ٹریبون، 5 مارچ 2016

http://aftribune.com/culture-days-opium-of-the-people/

http://www.nakedpunch.com/articles/254

افغانستان میں امن وسلامتی

افغانستان کے بارے میں لکھنا مشکل ہے حتیٰ کہ ان لوگوں کیلئے بھی جو وہاں رہتے ہیں اور تقسیم کے تمام اطراف کے لوگوں کیساتھ رابطے میں ہیں۔ افغانستان کے حقیقی تجزیہ کار کبھی بھی بے دھڑک بات نہیں کرتے اور اپنے خیالات اور نقطہءنظر کو لوگوں کے سامنے بڑی احتیاط اور ہیجان کیساتھ پیش کرتے ہیں چونکہ افغانستان کم از کم چار دہائیوں سے مختلف لوگوں کی آمد کا شکار رہا ہے۔ وہاں اکثر حکومت مختلف ہاتھوں میں تبدیل ہوتی رہی ہے اور بیشتر تشدد کے ذریعے، تو لہٰذا یہ تقسیم، تنازعہ اور سیاسی بے چینی نہ صرف شدید ہے بلکہ نقصان دہ اور زہریلی بھی۔ آپ وہاں محبت اور ہمدردی کی توقع نہیں کر سکتے جہاں طویل عرصے سے بڑی شدت کیساتھ نفرت کے شعلے بھڑکائے گئے ہوں، بہت سوں کی طرف سے جن کے دلوں میں افغان عوام کیلئے کوئی محبت نہیں ہے یا وہاں پر امن ان کے مفاد میں نہیں۔ افغانستان نہ صرف اپنے جغرافیہ بلکہ اپنی تاریخ کا بھی شکار رہا ہے؛ گھمنڈی طاقتوں کے مفادات اور ان کے مختار کل کارندوں نے افغان عوام پر فقط مصائب کا انبار لگایا ہے۔

میں افغانستان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا اور اسکا بھی دعویٰ نہیں کرتا کہ میں وہاں کی سیاسی اور عسکری صورتحال سے واقف ہوں اور جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ ابوبکر صدیق اور محمد تقی صاحب جیسے لکھاریوں کو پڑھنے سے ہے۔ میرے پاس جو ہے وہ اس ملک کیساتھ ایک روحانی تعلق اور محبت ہے کیونکہ میں نے دیگر ہزاروں بلوچوں، زیادہ تر مریوں، کیساتھ 1978ء تا 1991ء اپنی زندگی کے 13 سال افغان عوام کے ایک مہمان کے طور پر وہاں گزارے ہیں۔

یہ سال افغانستان کی تاریخ کے سب سے ہنگامہ خیز اور یادگار سال تھے جنہوں نے افغانستان اور دنیا کی تاریخ کا بہاؤ مستقل طور پر بدل کر رکھ دیا۔ میں جون 1978ء میں افغانستان

گیا، چار دن میں دلائی سے شوراوک تک سے پیدل چلا اور یہ اپریل 1978ء کے ثور انقلاب کے فوراً بعد تھا۔ پہلے تین سال میں نے زابل ولایت (صوبے) میں اپوتنگی کے پہاڑوں میں کیمپ میں گزارے اور باقی دس سال لشکرگاہ کے باہر ہوائی اڈے کے قریب واقع 'قلعہ کُہنہ' کے کھنڈرات میں جو کہ اسوقت ہلمند میں سوویت فوج کا سب سے بڑا کیمپ تھا۔

میں بمشکل ہی کبھی ان کیمپوں، جہاں ہم رہتے، سے دور جا پاتا کیونکہ لوگوں کی طبی اور تعلیمی ضروریات کی دیکھ بھال میری ذمہ داری تھی۔ تاہم، میں ایسے اوقات میں بھی کابل میں ہوتا جس کیلئے بہت سے لوگ اپنا ایک بازو اور ٹانگ بخوشی دے دیتے۔ میں 27 دسمبر 1979ء کو کابل میں تھا جس دن حفیظ اللہ امین کو معزول کیا گیا اور دور سے وہ شدید لڑائی دیکھی جو وزارت داخلہ اور ریڈیو سٹیشن میں ہو رہی تھی چونکہ ہم پرانے میکرویان کے بلاک نمبر 10 کے اپارٹمنٹس نمبر 26 اور 40 میں رہتے تھے۔ مجھے 31 دسمبر کو اپنی سالگرہ کابل ضلع جیل میں منانی پڑی کیونکہ پرجوش پارٹی کیڈر یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ ہم لوگ اب مہمان تھے اور 'اشرار' (باغی) نہ تھے جیسا کہ انہوں نے ہمیں قرار دیا تھا۔ میں 29 فروری 1980ء کو کابل کے مضافات میں تھا جب کابل کے عوام نے سوویت یونین کے ملوث ہونے پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ میرے خیال میں شاید ہی کسی نے اب تک اتنی بڑی تعداد میں شعلے دیکھے ہوں جو اس رات کابل میں ان جگہوں کو جلانے کیلئے گرائی گئیں جہاں پر لوگ احتجاج کر رہے تھے۔ اگلی صبح ہم شہر میں داخل ہوئے جہاں دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے اور فضاء میں بارود کی تیکھی بو موجود تھی۔ ایک سندھی دوست نے ہوٹل میں اپنے آپ کو اتنا غیر محفوظ محسوس کیا کہ وہ ہمارے ساتھ رہنے کیلئے آ گیا۔

میں فطرتاً اتنا ملنسار نہیں ہوں اور اس کے علاوہ مجھے اقتدار میں موجود لوگوں سے ملنے کا بھی شوق نہ تھا اور اگر کبھی ملا بھی تو کسی کی خاطر یا کسی کی ہمراہی میں۔ میں حفیظ اللہ امین سے اقتدار میں آنے سے قبل ملا تھا، میری ایک آدھ بار ڈاکٹر نجیب اللہ سے ملاقات ہوئی تھی جب وہ سلامتی کے وزیر تھے اور ایک مرتبہ صدر بننے کے بعد۔ میں نے ببرک کارمل کے صدر بننے کے بعد دارالامان محل میں اسد اللہ سروری، وہ خاد (افغان انٹیلی جنس) کے سربراہ تھے، سے ملاقات کی تھی۔

عزیز اساس اور عمر راوند میکرویان میں ہمارے پڑوسی تھے۔ حکام سے میری ملاقاتیں کبھی کبھار ہوا کرتی تھیں کیونکہ میں زیادہ تر کیمپ میں ہوتا تھا اور وہاں پر ایک مرتبہ ببرک کارمل کے بھائی محمود بریالے اور اسلم وطن جار نے دورہ کیا تھا۔

امریکہ، پاکستان، یورپ اور عرب ممالک کی طرف سے کی جانیوالی جارحیت سے پیدا شدہ اس مشکل صورتحال، جس سے وہ دوچار تھے، کے باجود افغان میزبانوں نے ہم بلوچوں کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کی۔ ہمیں ماہانہ وظیفہ ملتا اور آٹا وغیرہ ہمارے کیمپ میں پہنچایا جاتا اور کبھی کبھار گھریلو استعمال کی اشیاء بھی فراہم کی جاتیں۔ یقیناً اپوتنگی میں زندگی اتنی آسان نہ تھی؛ جبکہ لشکرگاہ میں لوگ چھوٹے موٹے کام کیا کرتے یا بھیڑ بکریوں کی تجارت کی جاتی۔

ہمارے لوگوں کو نام نہاد مجاہدین کی طرف سے نشانہ بنایا گیا اور بہت سے بلوچوں کو بسوں پر سفر کے دوران اٹھایا اور قتل کیا گیا، ہماری گاڑیوں پر گھات لگا کر حملے کیے گئے، ہمارے کیمپوں پر راکٹ فائر کیے گئے، گلوں کی دیکھ بھال کرنیوالے چرواہوں پر حملے کیے گئے۔ جب ہم اپوتنگی میں تھے تو مجاہدین کی طرف سے ہمیں گھیر لیا گیا اور چونکہ ٹرک آٹا نہیں لا سکتے تھے تو انہیں ہیلی کاپٹروں کے ذریعے لانا پڑے۔ یہ اس ناکہ بندی کے بعد تھا جب ہمیں حکومت کی طرف سے فراہم کردہ ٹرکوں میں لشکرگاہ منتقل کیا گیا۔ اگرچہ بلوچ کبھی بھی مجاہدین کیخلاف کسی بھی کارروائی میں ملوث نہیں رہے لیکن وہ ہمیں دشمن سمجھتے تھے اور یہ کوئی بے ترتیب عمل نہیں تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1974 – 1975ء میں افغان سیل اس مقصد کیلئے قائم کیا تھا کہ وہ بلوچ کیلئے افغانوں کی مدد کو روک سکیں۔ افغانستان کی موت اور تباہی کی آگ کا ابتدائی شعلہ تب روشن کیا گیا تھا اور آج اسکے شعلے بظاہر کسی کے قابو میں نہیں ہیں۔ امریکی کوششوں کے باوجود امن وسلامتی میں پیشرفت سست اور مبہم رہی ہے۔

وہاں اپنے قیام اور افغانستان اور افغان عوام کیلئے اپنے روحانی تعلق کے باوجود مجھے لگتا ہے کہ میں واقعی افغانستان کے بارے میں لکھنے کا اہل نہیں ہوں لیکن کچھ افغان دوستوں کے اصرار پر لکھ رہا ہوں اور امید کرتا ہوں ان میں کوئی فہم کی بات ہو۔

افغانستان میں امن کے بغیر اس خطے اور دنیا میں امن قائم نہیں ہوگا؛ یہ افراتفری اور بحران عالمی طاقتوں اور ان کے کٹھ پتلیوں کی کارستانیوں کا نتیجہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ افغان عوام کیلئے سب سے بہتر کیا ہے۔ اگر دنیا ثور انقلاب کو اپنے حال پر چھوڑ دیتی تو آج دنیا ایک مختلف جگہ ہوتی، جہاں کوئی اسامہ بن لادن نہ ہوتے اور ممکنہ طور پر دہشت گردی کیخلاف کوئی جنگ نہ ہوتی لیکن ایسا ہونا ہی نہ تھا۔ پاکستان نے انتقام کی آگ کیساتھ اسلام پسندوں کی پرورش، انہیں افغان حکومت کیخلاف وہاں تعینات کرنے کیلئے، پہلے ہی سے شروع کردی تھی۔ امریکہ نے ویتنام میں اس ذلت کا بدلہ لینے کی خواہش میں ایک ایسی آگ لگائی کہ اب وہ گزشتہ ایک دہائی سے بھی زیادہ عرصے سے بجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ عرب ہر چیز پر اپنے برانڈ کے اسلام کو غالب کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے پیسہ پانی کی طرح بہایا اور لوگ بھیجے، یہ جانے بغیر کہ مرغیاں آخر کار آرام کرنے گھر لوٹیں گی؛ داعش (اسلامک اسٹیٹ) کی ابتداء اسی دور میں ہوئی تھی۔ مغربی دنیا اور عرب ممالک دونوں آج انہی بیجوں کی فصل کاٹ رہے ہیں جو انہوں نے بوئے تھے۔ ''جب وہ ہوا کے بیج بوئیں گے تو آندھی کی فصل کاٹیں گے۔''

ہوائی اڈے اور سوویت فوجی کیمپ کے سامنے رہتے ہوئے ہمیں ہلمند دریا کے اس پار سے کٹیوشیا راکٹ کی فائرنگ، مِگ لڑاکا طیاروں کی شکل میں بہت سی کارروائیاں دیکھنے کو ملیں۔ چند مرتبہ مرجہ، نادعلی، سنگین اور دیگر جگہوں میں کارروائی کیلئے وہاں ان گنت ہیلی کاپٹر گن شپ اور ٹرانسپورٹ ہیلی کاپٹر آئے۔ مجھے افسوس ہے کہ اسوقت تصویریں لینے کیلئے میرے پاس ایک اچھے لینس والا کوئی کیمرہ نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ اس طرح کی بڑی فوجی کارروائیوں کے باوجود سوویت فوج ناکام رہی۔ محض طاقت نے کبھی بھی کوئی فتح حاصل نہیں کی ہے۔

افغانستان میں امن فوجی طاقت کے استعمال سے نہیں آئے گا کیونکہ 70 اور 80 کے عشروں کی طرح اس طاقت کا مقابلہ ان کی طرف سے کیا جا رہا ہے جو کہ امن کو عدم استحکام کا شکار بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ اب امریکہ کو ایک ایسی صورتحال کا سامنا ہے جس کی وہ سوویت یونین کیلئے تمنا رکھتا تھا اور اس کیلئے پیدا کیا تھا، مگر افغان عوام کی قیمت

پر۔ اُسوقت کی طرح اب بھی پاکستان افغانستان میں امن کیخلاف ہے، تب یہ ڈالروں اور بلوچ کیلئے افغان حمایت کی روک تھام کیلئے تھی اور اب یہ 'اسٹراٹیجک گہرائی' اور افغانستان میں بھارتی اثر ورسوخ کا مقابلہ کرنے کی اپنی گنجھلدار پالیسی کیلئے ہے۔

افغانستان کے مقدر کا فیصلہ، علاقائی اور بین الاقوامی کھلاڑیوں کی گنجھلدار مفادات کے سبب، دوسروں پر چھوڑ دیا گیا ہے اور لومڑیوں سے مرغیوں کے ڈربے کی دیکھ بھال کرنے کی توقع قطعی طور پر خطرناک ہے اور یہ افغان عوام کیلئے مہلک رہی ہے۔ سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کہ افغان عوام متحد ہونے کا فیصلہ نہیں کر لیتے اور اپنے مفادات کو اپنی بنیادی تشویش اور ترجیح بنانے کا عمل شروع نہیں کر دیتے افغانستان میں امن کبھی قائم نہیں ہوگا۔ تاہم، اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں ہر قیمت پر اتحاد اور امن قائم ہونا چاہئے۔ افغانستان کے عوام کیلئے امن اور اس کیساتھ خوشحالی لانے کیلئے ضروری ہے کہ رجعت پسند قوتوں کا مقابلہ کیا جائے خواہ وہ کسی بھی شکل میں خود کو پیش کرتے ہوں۔ وہ ہمیشہ وقت حاصل کرنے اور دوبارہ منظّم ہونے کیلئے صلح کی پیشکش کرتے ہیں۔

یہ محض ایک فرضی بات ہے کہ ثور انقلاب کے بعد سے ترقی پسند افغان حکومتوں کی مخالفت کی بنیادی وجہ غیر ملکی مداخلت کیخلاف مزاحمت، اپنے مادر وطن اور افغان عوام سے ان کی محبت تھی۔ درحقیقت اس بات میں کوئی دم نہیں ہے کہ غیر ملکی مداخلت کوئی مکروہ شے ہے، تو پھر 70 اور 80 کی دہائیوں میں کیونکر امریکی، پاکستانی اور عربوں کی مدد لی گئی اور کیوں اب پاکستان اور عربوں کی شمولیت کو خوش آمدید کیا جا رہا ہے۔ یہ زمین کیلئے محبت نہیں بلکہ ان لوگوں کے مفادات، خواہ وہ سیاسی، اقتصادی یا مذہبی ہوں، کی تکمیل کیلئے ہے جو دوست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ سمجھوتہ افغانستان میں کبھی بھی امن نہیں لائے گا؛ رجعت پسند قوتوں سے کبھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ عوام کی ترقی کیلئے کام کریں گے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ طاقت کا استعمال کبھی بھی کہیں بھی فتح کا مؤجب ثابت نہیں ہوا ہے تو لہٰذا یہ توقع رکھنا سعی لاحاصل ہے کہ امریکی فوجی مدد اس مسئلے کو حل کر دے گی جسے پیدا

کرنے میں اس نے کلیدی کردار ادا کیا تھا لیکن اسکا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ امریکہ افغانستان چھوڑ دے؛ انہیں وہاں رہنا چاہئے اُس مسئلے کو حل کرنے میں مدد دینے کیلئے جو انہوں نے پیدا کیا تھا۔ اس موقع پر افغانستان کو اپنی قسمت کے حوالے کر کے چھوڑ دینا محض عالمی امن واستحکام کو مزید خطرے میں ڈال دینے کے مترادف ہوگا جیسا کہ پاکستان اور عرب حکمران اپنے سیاسی اور مذہبی اثر ورسوخ کیساتھ افغان عوام کے مقدر کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔

ان تمام افغانوں، جنہیں افغانستان اور افغانوں سے محبت ہے اور اس میں جنکے مفادات داؤ پر لگے ہوئے ہیں، کو متحد ہونا پڑے گا نہ صرف جسمانی طور پر رجعت پسند قوتوں کیخلاف مزاحمت کرنے کیلئے بلکہ ایک مخصوص مزاج اور ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرنی پڑے گی جس میں ترقی پسند اور امن پسند قوتیں پنپ سکیں اور طاقت حاصل کر سکیں۔ افغانستان کی جنگ آخر کار اسی محاذ پر جیتی یا ہاری جائے گی نہ کہ فوجی محاذ پر۔ اس جنگ اور فیصلہ کن فوجی جنگ کی جیت کو یقینی بنانے کیلئے افغانوں اور دنیا کیلئے اس بات کا ادراک کرنا ضروری ہے کہ جب تک کہ پاکستان اور عرب حکمرانوں کے اس اثر ورسوخ کو ختم نہیں کیا جاتا افغانستان میں امن کبھی قائم نہیں ہوگا۔

جس افراتفری، انتشار، دردِ زِہ، موت، تباہی، نقل مکانی، ذہنی کرب، دکھ، رنج والم اور المیے کا افغان عوام مسلسل شکار رہے ہیں، جو انہیں 1978ء سے امریکہ، پاکستان، سوویت یونین کی طرف سے اپنے مفادات کیلئے افغانوں کی مدد کرنے کی درخواست کے تحت، عرب حکمرانوں کی طرف سے اسلام کے نام پر اور ان افغانوں کی طرف سے جنہوں نے نمائش کے طور پر حب الوطنی کے نام پر افغان عوام کے تمام دشمنوں کی خدمت کر کے پہنچائی گئی ہیں، ان سب کے بعد اب افغان عوام امن کے مستحق ہیں۔ تاہم یہ امن نہ صرف افغان عوام کی ذمہ داری ہے بلکہ دنیا بھر کے اُن تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے جنہیں اس سیارے اور اس میں بسنے والی انسانیت سے پیار ہے۔ یہ ذمہ داری اس بات سے بھی مشروط ہے کہ رجعت پسند قوتوں کو آخر کار کمزور اور تباہ کرنے کیلئے ایک بے رحمانہ سماجی، اقتصادی، سیاسی اور یقیناً فوجی کوشش کی ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ افغان عوام کو فتح، امن اور ہم آہنگی میسر ہو اور ان تمام لوگوں کو بھی جو پوری دنیا میں نئے نوآبادیاتی

نظام اور ظلم کیخلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔

میر محمد علی ٹالپر نے 'نیوز لائن'، 'دی رپورٹر' (حیدرآباد سے نکلنے والا ایک ماہنامہ)، 'ڈان' اور 'دی نیوز' کیلئے لکھا ہے اور تین سال (2010ء تا 2013ء) تک 'ڈیلی ٹائمز' کیلئے لکھتے رہے اور 2015ء میں اس کے لئے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ ان میں سے بیشتر مضامین تک ''Play Google @ Ustad Talpur'' پر رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ڈیلی ٹائمز کیلئے لکھے گئے مضامین کا خلیج میں بسنے والے بلوچوں کیلئے عربی میں ترجمہ احمد یعقوب اور صلاح بلوچ نے کیا ہے اور اسے ''بلوچ بیداری: بلوچ مسئلے پر مضامین'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ انہوں نے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے نائب چیئرمین ماما عبدالقدیر بلوچ کی قیادت میں کیے گئے لانگ مارچ میں شرکت کی تھی اور 26 دن تک ماما اور بہادر بلوچ خواتین کے ہمراہ مارچ کیا۔ یہ مارچ 106 دنوں میں مکمل ہوا تھا۔ اسوقت وہ اسٹراٹیجک سینٹر فار انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایک ریسرچ فیلو اور اسکی سہ ماہی اشاعت کے ادارتی بورڈ کے ایک رکن ہیں۔

بشکریہ افغان ٹریبیون ڈاٹ کام، 12 اپریل 2016

http://aftribune.com/afghanistan-peace-and-security/

''کیا نیشنلزم فاشزم ہے؟''

کراچی میں 'سندھ رائٹرز اینڈ تھنکرز فورم' نے حال ہی میں 'نیشنلزم اور انٹرنیشنلزم' پر ایک مباحثے کا اہتمام کیا، سندھ میں چھڑی ایک بحث کے بعد جس میں کچھ لوگ فاشزم کا نیشنلزم کیساتھ موازنہ کر رہے ہیں۔ مجھے دوستوں کی طرف سے مدعو کیا گیا تھا اور میں نے وہاں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ مضمون میری اُس گفتگو پر مبنی ہے۔

سندھ میں ایک بحث چھڑی ہوئی ہے جہاں کچھ لوگوں کو لگتا ہے کہ نیشنلزم فاشزم کا مترادف ہے اور لبرل ازم حب الوطنی کا۔ اس سے قبل کہ میں آگے بڑھوں، آئیں دیکھتے ہیں کہ فاشزم کیا ہے۔ جب ہم فاشزم کے بارے میں بات کر رہے ہوں تو ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ لفظ کہاں سے آیا ہے۔ یہ لاطینی ''Fasci'' (فاشائے) سے آیا ہے جس کے معنی ہیں 'گٹھا' اور ''Fascis'' (فاشِس) یا ''fasces'' (فاشیس) جو اسکا صیغہء جمع ہے جسکے معنی ہیں لکڑی کی چھڑیوں کا ایک گٹھا جسکے اوپر کلہاڑی کا پھل ابھرا ہوا ہے، یہ قدیم رومی سلطنت میں مستعمل تھی، جس سے مراد مختلف لوگوں یا قوموں کی جبری یکجائی ہے جیسا کہ طاقت ہمیشہ تعداد میں ہوتی ہے یعنی کہ افراد کی تعداد، اسلحہ اور گولہ بارود اور جنگی جہازوں کے بیڑے کیساتھ فوجی طاقت، سیاسی اور قانونی برادری، ثقیف دانشور، وسائل سے بھرپور کاروباری طبقہ، اور سب سے بڑھ کر بین الاقوامی بینکار جو اس فاشسٹ ہستی کو برقرار رکھنے کیلئے اہم ترین عنصر ہے۔ اگرچہ بہت سے ممالک ایسے ہیں جو باضابطہ طور پر ایسے علامات کا استعمال نہیں کرتے لیکن ان کا طرزِ عمل خالصتاً فاشسٹ سطور پر استوار ہے۔ ان میں پاکستان، ایران اور ترکی جیسے ممالک شامل ہیں۔ اگر اسے سادہ لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس کی سادہ تعریف کچھ یوں ہے: کسی معاشرے کو اس طرز پر منظّم کرنا جس میں

حکومت ایک آمر کی سربراہی میں ہو جو لوگوں کی زندگیوں پر مکمل اجارہ داری رکھے اور جس میں عوام کو حکومت کیساتھ اختلاف کرنے کی اجازت نہ ہو یعنی کہ انتہائی سخت تسلط یا عملداری والی حکومت۔

اصل بحث پر کچھ کہنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ ارسطو مزید کچھ چیزوں کی وضاحت کریں۔ جب بات ظالموں (پڑھیں ریاستوں) کی ہو تو ارسطو کہتا ہے کہ وہ ایسے طریقے بروئے کار لاتے ہیں جو انہیں لوگوں پر آسانی سے حکومت کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ''ظالم کے تین مقاصد یہ ہیں: اول، اپنے غلاموں کی توہین، وہ جانتا ہے کہ ایک کم ظرف شخص کسی کیخلاف سازش نہیں کرے گا؛ دوم، ان کے درمیان بداعتمادی پیدا کرنا؛ ایک ظالم کو تب تک اقتدار سے محروم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ لوگ ایکدوسرے پر اعتماد کرنا شروع نہ کر دیں - اور اسی سبب جابر اچھے لوگوں کیخلاف محاذ آراء ہوتے ہیں؛ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہیں کہ ان لوگوں سے انکی طاقت چھننے کا خطرہ ہے، نہ صرف اس لئے کہ اُن پر جابرانہ طرز پر حکومت نہیں کی جا سکتی بلکہ اس لئے کہ وہ ایکدوسرے سے اور دیگر لوگوں سے انتہائی حد تک وفادار ہوتے ہیں، اور ایکدوسرے کیخلاف یا دیگر لوگوں کیخلاف مخبری نہیں کرتے؛ اور سوم، ظالم یہ چاہتا ہے کہ اسکے تمام غلام کسی بھی ممکنہ کارروائی کے قابل نہ ہوں اور کسی ایسے کام کی سعی نہ کر سکیں جو کہ ناممکن ہو اور اگر وہ بے سکت ہوں تو وہ کبھی بھی ظلم کا تختہ الٹنے کی کوشش نہیں کر پائیں گے۔'' -ارسطو (384 قبل مسیح تا 322 قبل مسیح)

لوگوں کو فوج، رینجرز، فرنٹیئر کور، انٹیلی جنس ایجنسیوں اور پولیس کے ہاتھوں جس ذلت کا سامنا ہے وہ مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؛ سب نے اسے براہ راست دیکھا ہوگا اور اس کا نتیجہ اس طاقت کے آگے، جسکا وہ سامنا کر رہے ہوتے ہیں، اپنی خودداری اور خوداعتمادی کھونے کی صورت میں نکلتا ہے۔ دوئم، بداعتمادی پیدا کرنا ہے اور ایسا وہ لوگوں کے ذہنوں میں ان خیالات کے بارے میں شکوک وشبہات کی بوائی سے کرتے ہیں جن کیلئے وہ جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں؛ مثال کے طور پر ''کیا نیشنلزم فاشزم نہیں ہے۔'' وہ ابہام گوئی اور مغالطہ آمیز حربے بھی

استعمال کرتے ہیں، وہ یہاں موجودہ دور کی ناانصافیوں سے توجہ ہٹانے کیلئے ماضی پر زور دیتے ہیں، جیسا کہ ٹالپروں کی حکمرانی، جو یہاں پر کچھ لوگوں کیلئے ہدفِ غضب بنا ہوا ہے، تاکہ موجودہ دور کی ناانصافیوں سے توجہ ہٹائی جا سکے۔ جب لوگ منقسم، فریب زدہ اور بدنظمی کی حالت میں ہوں تو انہیں بے اختیار بنانا آسان ہوتا ہے۔ ریاستوں کے ان تینوں مقاصد کی ترویج ہمارے درمیان موجود وہ لوگ کرتے جو ہمارے درمیان نااتفاقی، مایوسی اور انتشار پیدا کرتے ہیں جبکہ بظاہر وہ فلسفیانہ لگتے ہیں۔

اس نئی بحث کا مقصد میرے خیال میں دورُخا ہے۔ پہلا یہ دکھانا ہے کہ آپ ایک ڈیموکریٹ اور لبرل ہیں اور یہ مقبول عام ہو کر ریاست اور بہت سے مختلف غیر سرکاری تنظیموں کی کفالت مہیا کراتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ پیسہ بہانے سے وہ عوام کی ثقافتی اقدار اور انکے حالات تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس پہلو کو کوئی معاف کر سکتا ہے اور (ارادتاً ابہام گوئی سے) اسکے بارے میں لبرل ہو سکتا ہے۔ اسکا دوسرا پہلو جان لیوا، خطرناک اور مہلک ہے کیونکہ یہ ریاست کی اطاعت گزاری اور غلامی کے اس ایجنڈے سے چشم پوشی کرواتا اور اسے فروغ دیتا ہے جو آپ سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ آپ اسکے آگے اپنے تمام حقوق اور جذبات سے دستبردار ہو جائیں کیونکہ یہ جانتا ہے کہ آپ کیلئے سب سے بہتر کیا ہے اور یہ ان سب چیزوں کو سنبھال سکتا ہے جن پر آپ کا انسانی وقار زندہ رہتا، قائم و دائم رہتا اور پنپتا ہے۔ ریاست کا مقصد اور خواہش کبھی بھی آپ کی ضروریات پوری کرنے کا نہیں ہوتا بلکہ مختلف حربوں کے تحت یہ فقط اطاعت گزاری چاہتا ہے اور یہ مخملی دستانے پہنے آہنی ہاتھوں سے کاری ضرب لگاتا ہے۔ وہ لوگ بھی عین یہی کام سرانجام دے رہے ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ نیشنلزم فاشزم ہے۔ یقیناً نیشنلزم کو جابر کو گالیاں دینے کی حد تک محدود نہیں کیا جانا چاہئے لیکن پھر اس کے ساتھ ساتھ لبرل ازم کو جمہوریت اور افہام وتفہیم کے نام پر ریاستی تشدد کی حمایت کرنے کی بھی آزادی نہیں دی جانی چاہئے۔ آپ محض اس بنیاد پر جا کر ریاست کی حمایت نہیں کر سکتے کہ نیشنلسٹ جماعتیں ویسی نہیں ہیں کہ آپ ان کے جس طرح سے ہونے کی خواہش رکھتے ہوں۔ شیخ

سعدیؔ کہتے ہیں:

''اگر از جہان، ہما شود معدوم
کس نہ رود زیرِ سایہء بوم
اگر دنیا سے معدوم ہما ہو جاوے
تو کوئی زیرِ سایہء اُلّو نہ جاوے''

یہ عذر کہ نیشنلسٹ جماعتیں اتنی اچھی نہیں ہیں تو اس سے فاشسٹ ریاست کی حمایت کا بھی کوئی جواز نہیں بنتا۔

ریاست اطاعت گزاری کے فروغ کیلئے مختلف آلات اور طریق کار استعمال کرتی ہے اور عناد پر مبنی اس کے منصوبوں کی تعمیل وہ نام نہاد لبرل دانشور بخوبی کرتے ہیں جو قومی آزادی کی جدوجہد کی مذمت کرتے ہیں اور اسے فاشسٹ کہتے ہیں اور اس طرح سے ہمارے خلاف کیا جانیوالا ریاستی تشدد نہ صرف ضروری بلکہ قانونی اور جائز سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہ انکا لبرل ازم ہے تو انکا فاشزم کیسا ہوگا؟ بلوچستان، سندھ اور گلگت بلتستان میں ریاستی تشدد کا ارتکاب بالکل انہی بنیادوں پر کیا جارہا ہے اور وہ لوگ جو اس دلیل کو بڑھاوا اور فروغ دیتے ہیں کہ نیشنلزم فاشزم ہے، وہ عوام کیخلاف ریاستی تشدد میں اسکے معاون اور عوام کیخلاف جرائم کے ارتکاب میں برابر کے شریک ہیں۔

یہ ریاست کبھی بھی لوگوں کیلئے نہیں ہوگی۔ بنگلہ دیش اور وہاں بنگالی نیشنلزم کیخلاف ان کا تشدد نظر انداز کیا جاتا ہے اور اسے بھلا دیا گیا ہے کیونکہ اُسوقت بھی ایسے دانشور تھے جنہوں نے تشدد کا ارتکاب کرنے والوں، یعنی فوج، الشمس اور البدر کی حمایت انہی دلیلوں کے تحت کی تھی کہ نیشنلزم فاشزم ہے۔ کیا بنگالی فاشسٹ تھے جب انہوں نے اپنے قومی حقوق کا مطالبہ کیا تھا یا پاکستانی اسٹابلشمنٹ فاشسٹ تھی؟ میرا خیال ہے کہ اس بات کو سمجھنے میں کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں ہے کہ کون کیا تھا۔ کیا بلوچستان اور سندھ میں خودارادیت کے حقوق کا مطالبہ فاشزم

ہے؟ میرا ماننا ہے کہ ان کے آزاد ہونے کے حق کا مطالبہ فاشزم نہیں ہے بلکہ قومی خودارادیت کے حق کو دبانا فاشزم ہے۔

ریاست اور اس کے ارادے اور کردار کے بارے میں میخائل باکونن نے بخوبی اظہار کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں کہ ''عوامی زندگی میں... حب الوطنی کے نقطہء نظر سے جب یہ چیزیں ریاست کی عظیم تر شان وشوکت کو بڑھانے اور اس کی طاقت کے تحفظ یا توسیع کیلئے کی جاتی ہیں تو یہ سب کچھ فریضے اور اخلاقی برتری میں بدل جاتے ہیں۔ فقط یہی شے اس بات کو واضح کردیتی ہے کہ قدیم اور جدید ریاستوں کی پوری تاریخ کیونکر محض گھناؤنے جرائم کا ایک سلسلہ ہے؛ کیونکر تمام ادوار اور تمام ممالک کے ماضی اور حال کے بادشاہوں اور وزیروں، سیاستدانوں، سفارتکاروں، بیوروکریٹس، اور جنگجوؤں کیساتھ اگر سیدھے سادے ضابطہء اخلاق اور انسانی انصاف کے نقطہء نظر سے انصاف کیا جائے تو وہ ہزار بار سے بھی زائد محنت بامشقت یا پھانسی گھاٹوں کی سزا کے مستحق ہیں۔ وہاں کوئی ایسی دہشتگردی، کوئی ستم گری، بے حرمتی، یا جھوٹی گواہی، کوئی فریبکاری، کوئی بدنام زمانہ خیانت، کوئی حقیر ڈاکہ زنی، کوئی بے باک لوٹ مار یا ذلت آمیز دھوکہ دہی نہ تھی اور نہ ہے جسکا ارتکاب روزانہ ریاستوں کے نمائندوں کی طرف سے نہ کیا جارہا ہو، اور یہ سب کچھ کسی اور عذر کے تحت نہیں بلکہ ان لچکدار الفاظ کے تحت کیے جاتے ہیں جو نہایت موزوں لگتے ہیں مگر پھر بھی انتہائی ہولناک ہیں: یعنی 'ریاست کی خاطر'۔'' تو کیا نیشنلسٹ فاشسٹ ہیں یا اسٹابلشمنٹ اور اس کے معذرت خواہ؟

آیا 'ریاست کی خاطر' جن ہولناکیوں کا ارتکاب اس ریاست نے بنگلا دیش، بلوچستان، سندھ اور خیبر پختونخوا میں کیے ہیں وہ ان لبرل دانشوروں کو اس ریاست کی حقیقی روح کو سمجھنے کیلئے کافی نہیں ہیں کہ وہ ان دلائل کیساتھ میدان میں نہ اتریں جن سے 'ریاست کی خاطر' عوام کیخلاف تشدد کو فروغ دینے اور جواز فراہم کرنے میں مدد ملتی ہو۔ آیا وہاں کوئی سوجھ بوجھ نہیں ہے جس سے وہ تاریخ یا موجودہ دور کے منظرنامے کو سمجھنے کے قابل ہوں کہ ترجیح عوام کو حاصل ہونی چاہیے نہ کہ

ریاست کو۔لیکن جب ترجیح مادی مفادات ہوں تو عوام کی فلاح و بہبود اور انکے حقوق کا حق جا کر بیکل جھیل میں کود سکتے ہیں جو کہ دنیا کی سب سے گہری جھیل ہے۔

نیشنلزم جو فلسطینیوں کو مستعد رکھتی ہے، ترکی میں کردوں کی اپنے وطن اور اپنے حقوق کی مانگ کو، اور ان کشمیریوں کی بھی، جن کا نہ تو پاکستان اور نہ ہی بھارت کیساتھ کوئی تعلق ہے، تو کیا انہیں بھی فاشسٹ قرار دیا جائے؟ یا پھر نیشنلزم کے فاشزم ہونے کی دلیل یہاں محض بلوچ اور سندھی عوام کے مطالبات تک محدود ہے؟

قومپرستوں کو اکثر تشدد کیلئے موَرد الزام ٹھہرایا جاتا ہے اور ان کی مذمت کی جاتی ہے لیکن جو بات بڑی آسانی سے فراموش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا تشدد اس زیادہ بڑے تشدد کا ردعمل ہوتا ہے جسکا ارتکاب مقتدراؤں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ انتفادہ ازخود پیدا نہیں ہوتیں۔ نام نہاد لبرلوں کی طرف سے قومپرستوں کی نہ صرف مذمت کی جاتی ہے بلکہ وہ مستعدی سے ریاست کی جانب سے بروئے کار لائے جانیوالے تشدد کا جواز بھی یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ اگر آپ پر تشدد ہیں تو جواب بھی پر تشدد ہوگا۔ اگر وہ کبھی ریاستی تشدد کی مذمت کر بھی لیں تو وہ انتہائی ملائم اور بزدلانہ پیرائے میں ہوتا ہے۔ ریاست کے تشدد کو تو ایک غلاف چڑھی منظوری مل جاتی ہے لیکن شدید نکتہ چینی قومپرستوں کے تشدد کیلئے مخصوص کی جاتی ہے۔ ریاستی تشدد کی حمایت کرنے والے تمام افراد انسانیت کیخلاف جرائم میں شریک ہیں اور ریاست کے ساتھ ساتھ وہ بھی فاشسٹ ہیں اور نہ کہ نیشنلسٹ جو اپنے لئے ایک پروقار اور آزادی کی زندگی کے حق کے متلاشی ہیں۔

بعض اوقات لوگوں کی اپنے قومپرست کاز کیلئے دی گئی بڑی قربانیوں کو لبرلوں کی طرف سے ایک حقارت آمیز و باعث ملامت شے بنایا جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک فالتو نقصان ہے۔ کیا ہو چی منھ کی زیر قیادت امریکیوں کیخلاف ویتناميوں کی دی گئی قربانیاں فالتو تھیں، عمر مختار کی زیر قیادت اٹلی کیخلاف لیبیائی عوام کی دی گئی قربانیاں فالتو تھیں، اسرائیلی قبضے کیخلاف فلسطینیوں کی انتفادہ فالتو تھیں؛ بڑی قربانیوں کے بعد کامیابی حاصل کرنیوالی قومی جدوجہد کی بے شمار مثالیں

موجود ہیں؟ فریڈرک نطشے کہتے ہیں کہ، ''اپنے آپ کا مالک بننے کے استحقاق کیلئے کسی بھاری قیمت کی ادائیگی کچھ بھی نہیں۔'' ایک پروقار اور آزاد زندگی کیلئے کوئی بھی قیمت اتنی بڑی نہیں ہے۔ قومی آزادی کی جدوجہد یقیناً ''اپنے آپ کا مالک بننے کے استحقاق'' کی جدوجہد ہے۔

قومپرستوں کو اس بات کیلئے بھی تنبیہہ اور نصیحت کی جاتی ہے کہ جو جدوجہد وہ کر رہے ہیں اس میں کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں۔ ویتناميوں سے یہی کہا گیا، بنگالیوں کو بھی یہی سبق دیا جاتا رہا اور بلوچ اور سندھیوں کو بھی یہی کہا جا رہا ہے۔ آئی ایف اسٹون (1907 تا 1989) نے اُن لوگوں کے جذبات اور خیالات کا بڑے شاندار انداز میں اظہار کیا ہے جو جدوجہد کرتے ہیں: ''لڑائی کی صرف وہی قسم لڑنے کے قابل ہے جسے آپ ہار جائیں، کیونکہ کسی نہ کسی کو تو یہ لڑنی ہی ہیں اور ہارنی اور ہارنی اور ہارنی ہیں اور یہاں تک کہ کسی دن، کوئی ایک جسے اتنا ہی یقین ہو جتنا کہ آپ کو ہے، جیت جائے۔ کسی کو آج سے ایک سو سال بعد ایک اہم اور بڑی لڑائی جیتنے کیلئے ضروری ہے کہ دیگر بہت سارے لوگ لڑنے کو تیار ہو جائیں، محض اسکا مزہ لینے اور اس سے لطف اندوز ہونے کیلئے آگے بڑھیں اور لڑیں، یہ جانتے ہوئے کہ آپ ہار جائیں گے۔ آپکو ایک شہید کی طرح محسوس نہیں کرنا چاہئے۔ آپکو اس سے لطف اٹھانے چاہیے۔'' یہ ہمیشہ فتح کی امید ہی ہوتی ہے جو لوگوں کو لڑائی جاری رکھنے پر آمادہ کرتی ہے۔

وہ لوگ جو قومپرستی کی مذمت کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ اپنی سرزمین اور اپنے وسائل پر اپنے حق کا مطالبہ کرتے ہیں، بھول جاتے ہیں جو کچھ فرانٹز فینن اپنی کتاب 'افتادگانِ خاک' میں کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ''ایک زیرنو آبادیت عوام کیلئے سب سے زیادہ محکم اور اہمیت اور اولیت کی حامل شے، سب سے زیادہ مادی و حقیقی ہونے کے سبب، سب سے پہلے زمین ہے: زمین جو کہ انہیں رزق فراہم کرتی اور سب سے بڑھ کر انہیں قدر و منزلت عطاء کرتی ہے۔'' اپنے وطن کے استحصال اور جبر سے آزاد ہوئے بغیر کوئی قوم عزت اور امن کیساتھ نہیں رہ سکتا۔ دوسرا چارہ اطاعت گزاری اور غلامی کا ہے جس کیلئے ایمینوئل کانٹ کہتے ہیں، ''کوئی خود کو ایک کیڑا بنا لے تو بعد میں یہ شکایت

نہیں کرسکتا اگر لوگ اسے پیروں تلے روند دیں۔''

ایک مطیع اور اطاعت شعار لبرل، جو وفاقیت اور اس کے تحت قوموں کے اتحاد کے نام پر اپنے حقوق کیلئے لڑنے والے لوگوں کیخلاف ریاستی جبر کی حمایت کرتا ہو، کے بجائے میں ایک فاشسٹ ہونے کو ترجیح دیتا ہوں جو عوام کی قومی آزادی کیلئے ایستادہ ہو۔ یہ ہمیشہ فاشزم ہی ہوتی ہے جسے لبرل قومی آزادی کی مخالفت میں مختلف حیلوں بہانوں اور عذر کے تحت اپناتے ہیں اور قومپرستوں کی فاشسٹ کے طور پر مذمت کرتے ہیں۔ اگر خیر بخش مری، مخدوم بلاول، شیر محمد مری، مجید لانگو، علی شیر کرد، حمید بلوچ، سرائے قربان، بالاچ مری، اکبر خان بگٹی اور وہ تمام لوگ، جو بلوچستان اور سندھ کیلئے جیئے اور مرے ہیں، فاشست تھے یا فاشزم کے حامی تھے تو پھر مجھے فخر ہوگا اگر میرا شمار بھی انہی لوگوں میں کیا جائے۔

بشکریہ: بلوچستان ٹائمز ڈاٹ کام، 29 اپریل 2016

http://balochistantimes.com/is-nationalism-fascism/

Audio: https://app.box.com/s/6we8tjn9w1ibb7notpx21krtvqvszsfl

Video: **https://vimeo.com/164880353**

ایک باریک سرخ لکیر

انقلابی جدوجہد اپنے حامیوں، رہنماؤں اور معاونین سے یہ تقاضہ کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص یا گروہ عوام کے نام پر اختیارات حاصل کرلے تو اسکا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ عوام کو جوابدہ ہیں اور عوام کی منشاء کو عذر بنا کر ان اختیارات کا استعمال یا غلط استعمال منمانے طور پر نہیں کرسکتے۔

کسی کو بھی یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ان اختیارات کا استعمال اپنے خبط کی بنیاد پر کرے اور دروغ گوئی سے ان کارروائیوں کو جدوجہد کیلئے ضروری اقدامات کے طور پر منوائے۔ انہیں عوام کو جوابدہ ہونا ہوگا خاص طور پر جب وہ اقدامات لوگوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالیں یا تباہ کریں؛ ایسے اوقات میں رہنماء یا گروہ ایک نہایت باریک لکیر پر چل رہے ہوتے ہیں کہ جس سے وہ منصفانہ یا تباہ کن اقدامات کو کافی حد تک ناقابل امتیاز بنا دیتے ہیں اور اسے ناگزیر گردانتے ہیں کہ اس طرح کے اقدامات کافی غور وخوص اور احتیاط کے بعد عمل میں لائے جاتے ہیں۔

منصفانہ یا عوام مخالف کارروائیوں کے درمیان اس باریک لکیر کو نظر انداز کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور یہ جدوجہد کی اخلاقی بالادستی کیلئے تباہ کن نتائج کا موجب بنی ہوئی ہے اور اس نے حقیقی حامیوں اور خیر خواہوں سے دوری پیدا کی ہے۔ جدوجہد اپنے حامیوں یا اپنی اخلاقی بالادستی کھونے کا متحمل نہیں ہوسکتی جو اسے دشمن سے ممتاز کرتی ہے۔ لہٰذا، کوئی بھی کارروائی کرنے سے قبل انہیں اپنے اقدامات کے ممکنہ اثرات پر غور کرنا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ ہوشمندی اور پاگل پن کے درمیان ایک 'باریک سرخ لکیر' ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس دعوے میں کافی حد تک سچائی ہے کیونکہ ہوشمندی اور پاگل پن کی وضاحت کرنے کے لئے کوئی معیار مقرر نہیں ہے چونکہ انسانوں کے اعمال ایک دوسرے کو ڈھانک دیتے

ہیں اوراس بات کی تمیز کرنا مشکل ہوجاتی ہے کہ کونسا عمل ہوشمندانہ تھا اور کونسا نہ تھا۔ ان اعمال کو ہوشمندانہ یا فاتر العقل قرار دیا جانا بھی ہر ایک کے اپنے ادراک پر منحصر ہے اور کوئی عمل جو کسی ایک کو دانشمندانہ دِکھتی ہو کسی اور کو حتمی حماقت لگ سکتی ہے۔ تاہم، ہم کسی ایسے اقدام کی پاگل پن کے طور وضاحت کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں جو زمینی حقیقت کو نظر انداز یا اس سے انکار کرتا ہو۔ ایسے اقدامات جو زمینی حقائق کو نظر انداز کرتے ہوں ان سے افراد، گروہوں یا اقوام پر زبردست حد تک منفی اثرات پڑتے ہیں ان اقدامات کی قیمت انہیں اور انکی آئندہ نسلوں کو چکانی پڑتی ہے۔

زمینی حقائق کو ماننے سے انکار اس صورتحال کو مزید ابتر اور پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ بظاہر انکار ایک عام انسانی کمزوری ہے اور یہ شاید خود کو اس بات پر قائل کرنے کیلئے استعمال کی جاتی ہے کہ سب کچھ اچھا اور کنٹرول میں ہے۔ میں نے خون تھوکنے والے بہت سے لوگوں کی مثالیں دیکھی ہے جو اس بات کو قبول کرنے سے انکاری ہوتے ہیں کہ وہ تپ دق میں مبتلا ہیں۔ نفسیاتی مسائل کا شکار لوگ بھی اس بات کو قبول کرنے سے انکاری ہوتے ہیں کہ انہیں علاج کی ضرورت ہے۔ انکار کرنے کا یہ میلان کسی صورتحال کیلئے مدد کی فراہمی اور اسکی تلافی کے حصول کو بہت مشکل بنا دیتی ہے؛ وہ یہ سمجھنے سے انکاری ہوتے ہیں کہ ان کے ماننے یا نہ ماننے میں حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حقیقت ہماری خواہشات یا آرزوؤں کے بغیر آزادانہ طور پر زندہ اور قائم رہتی ہے۔

اتفاق سے، انقلاب اور دہشتگردی کے درمیان بھی ایک نہایت 'باریک سرخ لکیر' ہوتی ہے اور اسے زیادہ ایمانداری سے قبول کرنا اور سمجھنا چاہئے کیونکہ ہوشمندانہ و پاگل پن کی صورتحال کے برعکس یہ نہ صرف خود پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ کئی لوگوں پر اس کے انتہائی دوررس اثرات ہوتے ہیں اور اس کے پاس تعمیر کے ساتھ ساتھ تباہی کیلئے بھی یکساں قوت ہوتی ہے۔ اس 'باریک سرخ لکیر' پر بہت احتیاط سے چلا جائے، اس بات کو یقینی بنانے کیلئے کہ انقلاب کہیں دہشتگردی نہ بن جائے۔ وہ لوگ جو انقلاب کی رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں انہیں اس بات کو دوگنا طور پر یقینی بنانا چاہئے کہ یہ باریک لکیر غلطی سے یا جان بوجھ کر عبور نہ کی جائے کیونکہ انقلاب کے معاملات عوام

کے ساتھ ہوتے ہیں اور اس لکیر کو پار کرنے سے عوام کو نقصان پہنچتا ہے اور انہیں الگ تھلگ کر دیتا ہے اسی لئے یہ انقلاب کیلئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔

انقلاب عوام کے ذریعے پنپتی ہے کیونکہ یہ عوام کیلئے ہوتی ہے اور اسے دہشتگردی سے ممیّز اور مختلف رہنا چاہئے اگر یہ کسی بھی طرح سے کامیاب ہونا چاہتی ہے۔ دہشتگردی کو دھوکہ دہی سے انقلاب کے طور پر نہیں منوایا جا سکتا محض اس لئے کہ وہ لوگ جو دہشتگردی کا ارتکاب کر رہے ہیں انہیں لگتا تھا کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔

انقلاب کوئی حربہ نہیں، یہ ایک حکمت عملی ہے اور ان کارروائیوں سے اسے اسکا جائز احترام ملنا چاہئے جو اس کے نام پر کیے جاتے ہیں؛ آپ بہت بڑی غلطیاں نہیں کر سکتے اور یہ بہانہ بنا کر کہ یہ انقلاب ہے، ان سے بری الذمہ ہونے کی کوشش بھی نہیں کر سکتے۔ انقلاب کے اپنے سخت مجموعہء قوانین وضوابط اور اقدار ہوتے ہیں جنکی نافرمانی نہیں کی جا سکتی۔ وگرنہ، آپ اسے کوئی انقلاب نہیں کہہ سکتے۔ انقلاب کے علم کو اشد ضرورت اور موزونیت کی مناسبت سے سرنگوں نہیں کیا جا سکتا؛ یہ آپ ہیں کہ جس نے اپنے معیار مقرر کیے ہوئے ہیں اور اگر آپ انکی پاسداری نہیں کر سکتے تو ایک طرف ہٹ جائیں۔ انقلاب طاقت اور دولت کا حصول نہیں ہے بلکہ یہ ان اہداف کے حصول سے متعلق ہے جن سے عوام کو فائدہ پہنچے اور ان کی فلاح و بہبود اور ان کی خدمت کی جا سکے۔

مورخہ 15 مئی 2016ء کو پانچ افراد، ان میں سے تین سرکاری اہلکار اور دو ٹھیکیدار تھے، جو کسی سرکاری معائنے کیلئے گئے تھے، کو ایک گروہ کی طرف سے کیچ کے علاقے دشت سے اغواء کیا گیا۔ ان مغویوں میں سے ایک چاکر زامرانی، شہید کمبر کے والد، تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کمبر چاکر بلوچ جدوجہد کے ایک آئیکون ہیں؛ وہ بی ایس او آزاد کے رکن تھے اور ہمیشہ بلوچ اور طلبا کے حقوق کیلئے جدوجہد میں سب سے آگے رہتے تھے۔ انہیں 26 نومبر 2010ء کو شہی تمپ تربت میں اپنے گھر سے انکے کزن ارشاد بلوچ کے ہمراہ پاکستانی ایجنسیوں کی طرف سے اغواء کیا

گیا تھا، اوران کی تشدد زدہ لاش الیاس نذر کی لاش کے ہمراہ 5 جنوری 2011ء میں تربت کے قریب پیدراک سے ملی۔

دشت کے دیگر مغویوں میں محبوب رند (ٹھیکیدار)، فدا احمد (ایس ڈی او)، ابراہیم بلوچ (انجینئر) اور رحیم جان بلوچ (انجینئر) شامل تھے۔تقریباً دس دن بعدان کی لاشیں ساہیجی، دشت میں سے ملیں، اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ان کے اغوا کاروں، جوخود پاکستانی فورسز کے حملے کی زد میں تھے، کی طرف سے وہیں چھوڑ دیے جانے کے بعد وہ پیاس، بھوک اور آب رُبانی کے سبب وفات پا گئے تھے۔متوفی، جو اس مشکل قطعہ زمین میں سے اپنے واپسی کا راستہ تلاش کرنے کے قابل نہ تھے، ہلاک ہو گئے۔

ڈاکٹر مالک کے نام نہاد مڈل کلاس نیشنل پارٹی ان اموات پر شوروغل مچا کر رونا رو رہی ہے اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ ان کے اقتدار میں آنے کی ہوس کے سبب بلوچ کو بے حد نقصان اٹھانا پڑا ہے جہاں انہوں نے پاکستانی پٹھوؤں کے طور پر کام کیا اور بلوچوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کا غلیظ کام سرانجام دیا جہاں انہوں نے اپنے لئے خوب مال بنایا جیسا کہ مشتاق رئیسانی کے معاملے سے ظاہر ہوتا ہے۔اس شور شرابے کا مقصد پاکستان اور چین کی طرف سے بلوچستان کے استحصال میں سہولت فراہم کرنا ہے۔ساہیجی جیسے واقعات محض بلوچ کے دشمنوں کو انہیں بدنام کرنے اور حقوق کیلئے بلوچ جدوجہد کو کمزور کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

اس واقعے نے کئی سوالات کو جنم دیا ہے اور حتیٰ کہ ان لوگوں کے ذہنوں میں بھی شکوک و شبہات پیدا کیے ہیں جو حقوق کیلئے بلوچ جدوجہد کی دل و جان سے حمایت کرتے ہیں۔کمبر چاکر کے والد ایک ٹھیکیدار تھے اور یہاں ٹھیکے صرف سرکاری منصوبوں کے ہوتے ہیں تو لہٰذا وہ اپنے خاندان کو عزت کی زندگی دینے کیلئے اور کیا کر سکتے تھے؛ انہوں نے اپنا بیٹا کمبر، جو دوسری صورت میں اپنے خاندان کیلئے روزی فراہم کر سکتا تھا، بلوچستان کو دیا۔

یہ امر ہمیں اس سوال کی طرف لاتا ہے جو ہم سے ہمارے ضمیر کو ٹٹولنے کا متقاضی ہے اور

اسے بہت احتیاط اور ایمانداری سے دیکھے جانے کی ضرورت ہے۔کوئی شخص جسے اپنے خاندان کیلئے عزت کی زندگی فراہم کرنے یا ضرورت کی بنیاد پر کوئی ایسا کام کرنا پڑے جہاں کسی نہ کسی طرح سے حکومت ملوث ہو تو کیا وہ کوئی غدار اور بلوچ دشمن ہے؟

وہاں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو اپنے قول و فعل سے صحیح معنوں میں بلوچ دشمن ہیں چونکہ وہ فعال طور پر، جیسا کہ جسمانی طور پر ڈیتھ اسکواڈ کرتے ہیں اور سیاسی طور پر نام نہاد مڈل کلاس کے سیاستدان اور اشرافیہ جو ظالم اور استحصالی قوتوں کیلئے کام کرتے ہیں، ریاست کے ساتھ مل کر بلوچ حقوق کی جدوجہد کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں لیکن کوئی کسی ایسے شخص کو صرف اس وجہ سے ایک بلوچ دشمن ہونے کیلئے سزا نہیں دے سکتا جو کسی سہل ذریعے سے اپنے خاندان کیلئے روزی کماتا ہو۔کوئی بھی اس بات سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ ہمارے درمیان بھیڑوں کے روپ میں کچھ بھیڑیے ہیں اور وہ پراسرار طریقے سے ہمارے مفادات کے خلاف کام کرتے ہیں لیکن کوئی ایسی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس بات پر متفق نہ ہوں کہ محض زندہ رہنے کی ضرورت کے تحت، وہاں بہت سی بھیڑیں ہیں جو بھیڑیوں کے روپ میں ہیں۔لوگ، جب وہ حکومت کیلئے خدمات سرانجام دے رہے ہوتے ہیں، بلوچ حقوق کی جدوجہد کے حامی ہوتے ہیں۔انقلاب اور جدوجہد کیلئے لوگوں کا عزم ایک طرف، انہیں زندہ رہنے اور اپنے خاندانوں کا پیٹ پالنے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ وہ اور کیا کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ خواب، جو کچھ وہ چاہتے ہیں، ایک حقیقت نہ بن جائے؛ وہ بھوکے پیٹ اس دن کیلئے محض انتظار نہیں کر سکتے۔

وہ لوگ جو بلوچ حقوق کی جدوجہد کے علمبردار ہیں، انہیں ان معاملات پر اپنے نقطۂ نظر میں مزید دانشمندانہ اور منصفانہ ہونا پڑے گا، بدقسمتی سے انکے اقدامات، جو باوجودیکہ پرخلوص انداز میں اٹھائے گئے تھے، انقلاب اور عوام دوست ہونے کے بجائے دہشتگردی کے ضمرے میں آتے ہیں۔کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ غلاف چڑھے فیصلے کرے کہ کون محبّ وطن ہے اور کون غدار ہے اور ان چیزوں کیلئے لوگوں کو تکالیف کا شکار بنائے جو ان کے خیال میں صحیح یا غلط ہیں۔کسی کو یہ

حق نہیں ہے کہ وہ سزا یا جزا دینے کی اجارہ داری کے ساتھ خدا کا طرزِ عمل اپنائے، ان چیزوں کیلئے جو اسے صحیح یا غلط لگتے ہوں، یہ ہو بہو انہی لوگوں کا طرزِ عمل ہے جو ہمارے حقوق دینے سے انکاری ہیں اور حقوق کیلئے ہماری جدوجہد کی مخالفت کرتے ہیں؛ ہم ان جیسا ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتے اور مگر پھر بھی ہم اپنے عوام سے حمایت کی توقع کرتے ہیں چونکہ انہیں ایک بہتر حقِ انتخاب ضرورت ہے نہ کہ محض آقاؤں کی تبدیلی کی۔

میں نے اوپر ذکر کیا ہے زندگی میں حقیقت سے انکار کا ایک رجحان موجود ہے جس کے سبب کوئی حقیقت کو دیکھنے یا ماننے سے انکاری ہوتا ہے، اس جھوٹے اطمینان کے احساس کے تحت، شاید اس امید میں کہ اگر میں اسے دیکھنے یا تسلیم کرنے کی کوشش نہ کروں تو یہ خود بخود غائب ہو جائے گی۔ تاہم، حقیقی زندگی ہمارے خیال یا اس کے اعتراف سے مختلف ہے اور اس بات سے قطع نظر کہ ہم کیا سوچتے ہیں اس کے نتائج سنگین ہوں گے اگر ہمارے اعمال نے انہیں مدعو کیا ہوا ہو۔ یہ امر ضروری ہے کہ وہ تمام لوگ جن کے پاس اختیار ہے یہ جرات رکھتے ہوں اور جب کبھی بھی غلطیاں سرزد ہوں تو انہیں قبول کریں کیونکہ بلوچ حقوق کی جدوجہد ہماری انا کی تسکین نہیں ہے۔ یہ لوگوں کی خدمت اور ان خواہشات اور آرزوؤں کے حصول سے متعلق ہے جو وہ اپنے لئے اور اپنی آنے والی نسلوں کیلئے چاہتے ہیں۔

اس طرح کے مواقع پر، جہاں ان مضمرات کے سبب جن سے یہ عبورگی عملی لحاظ سے اور جدوجہد کیلئے اس کے نتائج اور جدوجہد کی اخلاقی حیثیت کے حوالے سے، یہ 'باریک سرخ لکیر' مزید گہرے معنی اختیار کر لیتی ہے۔ کسی فیصلے کے نقائص اُن اَن کہی اور بے پناہ قربانیوں سے ملے فائدے کا صفایا کر سکتے ہیں جو 27 مارچ 1948ء کے بعد سے بلوچ حقوق کی جدوجہد میں دی گئی ہیں۔ عوام کی قابلِ قدر حمایت حاصل کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ پلک جھپکتے ہی ختم ہو سکتی ہے جب ایک بار عوام کو یہ محسوس ہونے لگے کہ ان لوگوں، جو دوست ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں، اور دشمنوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

لوگ ہماری ولولہ انگیز بیان بازی پر فیصلے نہیں کرتے۔ وہ ہمارے اعمال اور ہمارے اعمال کے نتائج پر مبنی فیصلے کرتے ہیں۔ ہر فیصلے اور ہر کارروائی کیلئے غور کرنے میں ترجیح عوام کو حاصل ہونی چاہئے کیونکہ عوام کی حمایت کے بغیر سب کچھ برباد ہو جائے گا اور اس میں اب تک دی گئی وہ تمام قربانیاں شامل ہیں جو بہادر شہید کمبر چاکر اور دیگر ہزاروں نے دی ہیں۔

بشکریہ: بلوچستان ٹائمز ڈاٹ کام، 2 جولائی 2016

http://balochistantimes.com/a-thin-red-line/

طلباء کیلئے سیاست کیوں ضروری ہے

26 نومبر 1967 بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا یوم تاسیس ہے اور اب اسکی عمر 49 برس ہوگئی ہے۔

ان تمام سالوں کے دوران اس نے بہت سارے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں لیکن اس نے بلوچ قومی جدوجہد میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اور اس کا ہر اول دستہ رہا ہے اور مستقبل کی بلوچ قیادت کیلئے یہ ایک نرسری ہے۔ اب اسے اور بھی زیادہ بھاری ذمہ داری اٹھانی ہے: اسے بلوچ نوجوانوں کی سیاسی اور علمی دونوں میدانوں رہنمائی کرنی ہے کیونکہ پاکستانی اسٹابلشمنٹ بلوچستان میں اپنے استحصال اور ناانصافیوں کیخلاف سیاسی طور پر آگاہ اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتی ہے۔ بی ایس او (آزاد) نے اپنی میراث کی پاسداری وفاداری سے کی ہے۔

کینیڈا میں مقیم بلوچ طلبا اور دوستوں نے مجھے ''طلبا کیلئے سیاست کیوں ضروری ہے'' پر کچھ لکھنے کیلئے کہا۔ جو کچھ میں نے لکھا اسے وہاں ایک سیمینار میں پڑھا گیا اور یہاں میں اسے آپ کے ساتھ شیئر کر رہا ہوں۔

عزیز دوستو، ہمسفر ساتھیو، خواتین وحضرات:

دوستوں کی طرف سے مجھے کہا گیا ہے کہ میں ''طلباء کیلئے سیاست کیوں ضروری ہے'' پر چند الفاظ کہوں۔ اب اس کے بارے میں لکھنا اتنا ہی مشکل اور اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ ''زندگی کیلئے خوراک کیوں ضروری ہے'' کے بارے میں لکھنا کیونکہ طالب علموں کیلئے سیاست اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ زندگی کیلئے خوراک۔

یہ نہ صرف وہ علم ہے جو آپ کو کتابوں سے حاصل ہوتا ہے جو اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ آپ کیسے شخص بنیں گے؛ آپ جو بنیں گے اس پر آپ کے معاشرتی وثقافتی اقدار، آپ کا گھر، آپ کے دوست اور یقیناً جو کچھ آپ کی سیاست ہے اس کا بھی بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔

ہم اپنے ماحول اور اپنے منتخب کردہ سیاست کی پیداوار ہیں۔ اس سے قبل کہ ہم مزید آگے بڑھیں میں ایک مثال دینا چاہوں گا کہ طلباء کیلئے سیاست کیوں ضروری ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ آگ جنگلات کیلئے تباہ کن ہوتے ہیں چونکہ وہ درختوں اور جنگلی حیات کو تہس نہس کر دیتے ہیں لیکن ان لگنے والی آگوں کا ایک اور کردار بھی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ درخت بڑی تعداد میں بیج گراتے ہیں لیکن یہ بیج نہیں پھوٹتے کیونکہ وہ خوابیدہ حالت میں ہوتے ہیں اور تب تک نہیں پھوٹتے جب تک کہ انہیں جگایا نہ جائے۔ آگ کی گرمی انہیں جگا دیتی ہے اور وہ اگنا شروع کر دیتے ہیں۔ انسان ساختہ جنگلات میں ببول کے بیجوں کو پھیلانے سے قبل انہیں ابلتے ہوئے پانی میں پھینکا جاتا ہے جو کہ اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ وہ پھوٹ کر اُگ سکیں۔ لہٰذا سیاست بھی وہی گرمی ہے جو اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ سماج کے بیج (طلباء) اگ سکیں اور بلوغیت پائیں۔

سیاست کے بغیر کوئی طالبعلم اُسی خوابیدہ بیج کی طرح ہے اور ایک خوابیدہ بیج سے جنگل کو کوئی خاص استفادہ نہیں ہوتا۔ صحیح سیاسی خیالات رکھنے والا ایک طالبعلم معاشرے کو بہتر طور سمجھتا ہے اور بہتر تفہیم کیساتھ ہم بہتر طور اسکی خدمت کر سکتے ہیں۔ کسی کو بھولبلیاں، جو کہ تمام معاشرے ہوتے ہیں، میں اپنی راہ تلاش کرنے کیلئے اس کے پاس ایک اخلاقی قطب نما ہونا چاہئے اور سیاست ایک طالبعلم کیلئے وہی اخلاقی قطب نما ہے۔

میں جانتا ہوں کہ کچھ دوستوں کو میرے 'صحیح سیاسی خیالات' کے الفاظ کا استعمال عجیب لگے اور ہوسکتا ہے کہ وہ اسے کسی مخصوص مکتبہء فکر جانب متعصّبانہ تصور کریں لیکن میں اس بات کو واضح کرنا چاہوں گا کہ ہاں میں جانبدار ہوں اور جیسا کہ مارک ٹوائن نے کہا تھا کہ ''میں جانتا ہوں کہ میں اس معاملے پر جانبدار ہوں، مگر میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں گا اگر میں جانبدار نہ ہوتا۔''

جی ہاں، میں جانبدار ہوں اور میں اس سیاسی مکتبہءفکر کی حمایت کرتا ہوں جو سامراج اور جدید نوآبادیت کی مخالفت کرتا ہے؛ اُس سیاست کی مخالفت کرتا ہے جو اقلیتوں کو حقوق سے محروم کرتا ہے، جو عورتوں سے نفرت کرتا ہے، جو ریاست کے حمایت یافتہ مذہب کو فروغ دیتا ہے، جو ایک مخصوص زبان اور ثقافت کو ان قوموں پر تھوپتا ہے جو انکی جکڑ میں ہوتے ہیں۔ سیاست کا صحیح ہونا ضروری ہے تاکہ وہ طالب علموں کو انسانیت کیلئے مفید بنائے۔ وگرنہ دوسری صورت میں معاشرہ پیچھے چلا جائے گا۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے گوکہ سیاست طلباء کیلئے ضروری ہے لیکن اس کا صحیح قسم کی سیاست ہونا زیادہ ضروری ہے۔ ایسی سیاست جو طالبعلم میں انسانی اقدار کو اسکے ذہن پر نقش کرتا ہے اور صحیح راستے پر چلنے کیلئے اسے ایک ایسا اخلاقی قطب نما فراہم کرتا ہے جو اسے انسانیت کی نجات کی طرف لے جاتا ہے اور پھر اسے اس بات کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ ناانصافی خواہ کسی کی بھی طرف سے ہو اسکی مخالفت کی جانی چاہیے۔ یہ کہ رواداری صرف انہی تک محدود نہ ہو بلکہ یہ دیگر لوگوں سے بھی برتنی چاہئے۔

اس بات کی توضیح ناقابل تردید صداقت سے کی جاسکتی ہے: یہاں بی ایس او-آزاد کے علاوہ دیگر بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بی ایس او) موجود ہیں لیکن وہ پاکستانی ریاست اور اداروں کی اطاعت گزاری کو فروغ دیتے ہیں اور اس کے شریک کار ہیں اس حقیقت سے قطع نظر کہ اس ریاست اور اس کے اداروں نے نہ صرف بلوچ کو ان کے تمام حقوق سے محروم کر رکھا ہے بلکہ وہ بلوچ عوام کے خلاف منظّم 'غلیظ جنگ' کی ذمہ داری میں بھی حصہ دار ہیں۔ ظالموں کی حمایت کرنے کی سیاست کس طرح سے صحیح سیاست ہوسکتی ہے؟ وہ لوگ کہ جن کے پاس کوئی اخلاقی قطب نما نہیں ہوتا ان کا انجام ظالموں اور جابروں کی حمایت کرنے پر ہوتا ہے اور وہ بہ آسانی دستیاب آلے کے طور پر نظام کے ساتھ کام کرنے کے بہانے تراشتے ہیں۔ بہانوں کی تعداد خواہ کتنی بھی ہو ناانصافیوں کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے اور جابروں کی حمایت کرنے کا جواز پیش نہیں کر سکتیں۔

تمام کھانے آپ کو زندہ اور صحت مند نہیں رکھ سکتے؛ بعض کھانے کی اشیاء آہستہ آہستہ مگر آخرکار آپ کی صحت کو برباد کردیں گی۔ سیاست بھی کھانے کی طرح صحیح قسم کی ہونا ضروری ہے جو کسی بھی طرح سے طالب علموں کیلئے فائدہ مند ہو۔ یہ آخرکار طالب علم کا انتخاب اور ہوشمندی ہے کہ وہ اُس سیاست کو منتخب کرے جس پر وہ عمل پیرا ہونا چاہتا ہے لیکن آخر میں انتباہ کے طور صرف ایک بات کہہ دوں کہ اگر آپ صحیح سیاست کا انتخاب نہیں کرتے ہیں تو آپ کا انجام غلط سیاست کی حمایت کرنے پر ہوگا۔ تو میرے عزیز دوستو، اگر ہم غلط کرتے ہیں تو ہم غلط کو صحیح کی جگہ لینے کی اجازت دے دیتے ہیں۔

وہ لوگ جو صحیح سیاست کا انتخاب کرتے ہیں ان کو اکثر اس کے نتائج، بے ثمری اور اس کی قیمت کی ادائیگی کے بارے میں خبردار کیا جاتا ہے؛ جی ہاں، ہم جس راہ کو منتخب کرتے ہیں اسکے نتائج بھی ہوتے ہیں اور اسکی قیمت بھی چکانی پڑتی ہے اور اگر آپ اسکی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں تو اپنا انتخاب کرلیں۔ آخر میں، میں اپنے دوستوں، ہمسفر ساتھیوں اور ان سب لوگوں کو، جو آج یہاں موجود ہیں، بتانا چاہوں گا کہ:

میں کروں دل سے قبول ہو جو بھی نزول؛
ہو مجھے محسوس، حتیٰ درحالتِ ملول؛
ہے یہی بہتر کہ ملے محبت پھر فراق
اس سے کہ کرے نہ محبت کوئی اِک بار۔

لارڈ الفریڈ ٹینیسن

بشکریہ: بلوچستان ٹائمز، 28 نومبر 2016
بلوچستان ٹائمز کا قلمکار کی رائے کی تائید کرنا ضروری نہیں۔
http://balochistantimes.com/politics-necessary-students/

سنگر پبلی کیشنز

کے زیرِ طبع کتابیں

سردار خیر بخش مری

شخصیت اور سانح حیات

اظہارِ بلوچستان

مصنف: میراث زِروانی

کامریڈ امداد بجیر

شخصیت، فکر و عمل

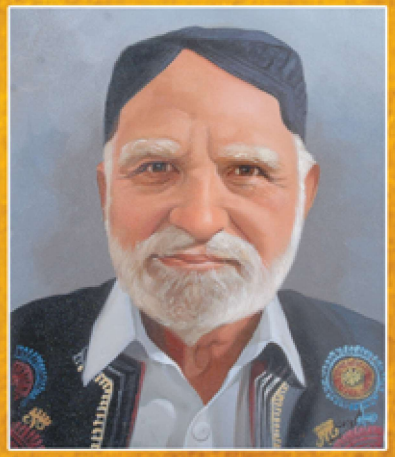

بلوچ قومی تحریک میں میر محمد علی ٹالپر کی حیثیت سیاسی و علمی درسگاہ جیسی ہے۔ ان کی تحاریر اور تقاریر بلوچ سیاسی کارکنان اور بلوچ قومی پالیسی ساز اداروں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ بلوچ قومی تحریک سے اپنی گذشتہ پینتالیس سالہ غیر متزلزل وابستگی کے دوران انہوں نے کئی نشیب و فراز دیکھے لیکن ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ جیسا کہ وہ خود نطشے سے اقتباس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یہ عظیم جذبات کی قوت نہیں بلکہ ان سے وابستگی کا دورانیہ ہے جو عظیم انسان بناتے ہیں۔" اور میر صاحب واقعتاً بلوچ قوم کی عظیم شخصیات میں سے ایک ہیں۔

SANGAR BOOK SERIES 15